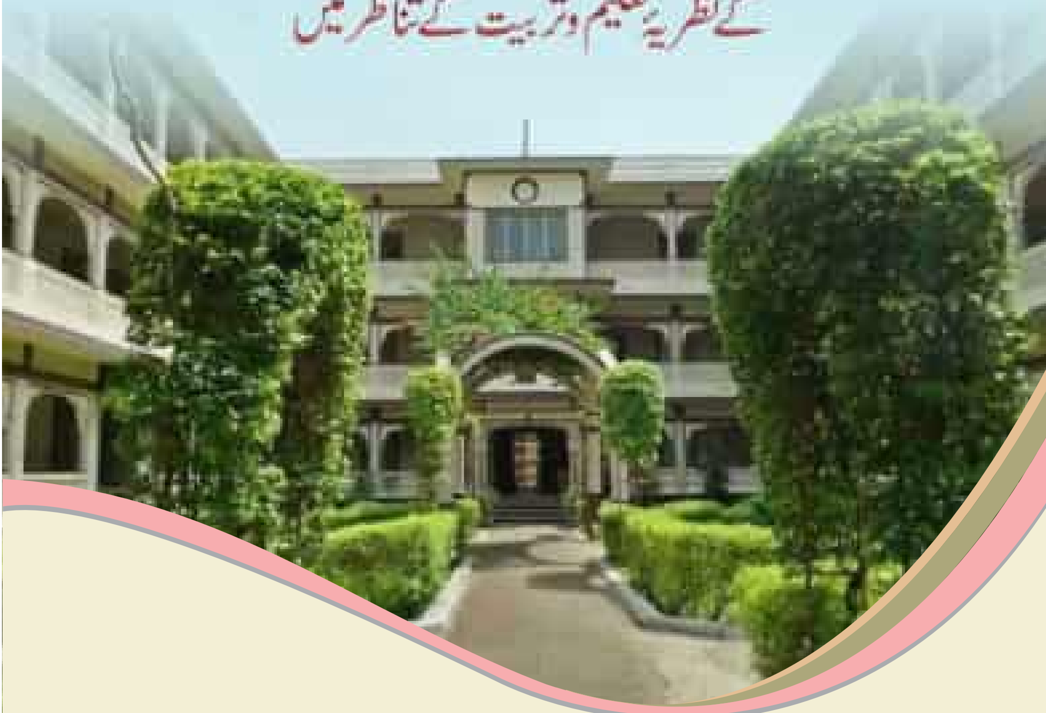
مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظام تعلیم وتربیت

مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ

کے نظریۂ تعلیم وتربیت کے تناظر میں





مرتب :

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب

(مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ)

تفصیلات

نام کتاب: مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظامِ تعلیم وتربیت
مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ
کے نظریۂ تعلیم وتربیت کے تناظر میں

مؤلف : مولانا مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب
(شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم ماٹلی والا)

صفحات : ۴۵۸

سن طباعت: ۱۴۴۱ھ = مطابق 2019ء

قیمت :

ملنے کا پتہ

مکتبہ: ابوبکر ربیع بن صبیح بصری

دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ

گجرات، انڈیا۔ ۳۹۲۰۰۱

فہرست

مقدمہ

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید المرسلین، وعلی آله وصحبه اجمعین، ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین، اما بعد!

دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر کے بانی حضرت مولانا غلام محمد صاحب نورگت (ندوہ کی مجلس شوری کے ممبر) اورراوت برادران ہیں، حضرت مولانا غلام محمد صاحب کا تعلق مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے تھا، اس نسبت سے مولانا غلام محمد صاحب فلاح دارین کو ندوہ کے انداز پر چلانا چاہتے تھے۔ مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ کا تعلق بھی حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندویؒ اور مولانا غلام محمدؒ سے تھا، آپ کے ڈابھیل سے فلاح دارین منتقل ہونے پر فلاح دارین کی نسبت سے یہ تعلق مزید مستحکم ہوا۔ ادھر حضرت مولانا غلام محمد نورگت صاحب کا انتظامیہ سے اختلاف ہوا اور آپ نے اس کے منصب اہتمام سے استعفاء دیا، اورارباب شوریٰ نے حضرت مفکر ملت کو یہ منصب سپرد فرمایا۔

مفکر ملت نے ۱۷؍مارچ ۱۹۶۶ء میں اہتمام کا عہدہ سنبھالا اور وہ اکتوبر ۱۹۸۴ء تک جاری رہا، نومبر ۱۹۸۴ء میں آپ کو رئیس الجامعہ کے عہدے پر سرفراز کیا گیا، ۳؍فروری ۱۹۹۳ء میں موصوف نے رئیس الجامعہ کے عہدے سے استعفاء پیش کیا جو ۱۷؍نومبر ۱۹۹۳ء کو بادل ناخواستہ قبول کیا گیا۔

اس (۱۸؍سالہ) منصب اہتمام قبول کرنے کے بعد بقول استاذ محترم حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحبؒ موصوف چونکہ علمی ذوق، اعلیٰ انتظامی صلاحیت، مضبوط قوت ارادی،

خلق حسن، صبر وضبط، معاملہ فہمی، دوراندیشی، مردم سازی، وسعت ظرف، دل آویزی اور مہمان نوازی جیسی خدا داد اعلیٰ صفات سے متصف تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصے میں موصوف نے اللہ تعالیٰ کے فضل، بزرگوں کی توجہات، اساتذۂ کرام کی اَن تھک محنت اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ادارے کو تعلیمی، تربیتی، تہذیبی اور تعمیری اعتبار سے قابلِ فخر ترقی عطا فرمائی، جس کا ثبوت معائنہ رجسٹر میں مرقوم ان تاثرات سے ظاہر ہے جو ملک کی مؤقر شخصیات کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں۔

انہوں نے ملک کے کونے کونے سے ذی استعداد، مخلص، محنتی اور خلیق اساتذۂ کرام فراہم کیے جنہوں نے اپنا خون پسینہ بہا کر ادارہ کے تعلیمی وثقافتی معیار کو بلند کیا۔

نصاب تعلیم انوکھا اور زمانہ کے تقاضے کے مطابق ترتیب دیا، جس میں دنیاوی ضروری مضامین کو شامل فرمایا، عربی اور انگریزی زبان وادب، نیز فن نحو وقراءت –جن پر عموماً کم توجہ دی جاتی ہے– کو انتہائی اہمیت دی، اس کے لیے ماہر اساتذہ فراہم کیے اور خود اپنے طلبہ کو شوق دلا کر اس قابل بنایا کہ آج وہ اس ادارے کے قابل رشک اساتذہ ہیں۔

موصوف نے عالمِ عرب کا سفر فرما کر نادر اور اہم کتابوں کا ذخیرہ جمع فرمایا جو آج کتب خانے کے لیے بیش قیمت علمی سرمایہ ہے۔ موصوف نے انتہائی جاں فشانی کر کے عالم عرب کے مشہور جامعات سے ادارہ کا معادلہ منظور کرایا اور طلبہ کو وہاں بھیج کر داخلہ دلایا جو آج وہاں سے فراغت کے بعد وقیع جگہوں پر دینی خدمت انجام دے رہے ہیں اور بعض ابھی زیر تعلیم ہیں۔ (گلدستۂ محبت: ص/ ٦٩)

اس مختصر سے عرصے میں اللہ پاک نے ایسی برکت عطاء فرمائی کہ فلاح دارین کے فارغین دنیا کے کے مختلف علاقوں میں پہونچ گئے اور ہر جگہ اخلاص وللّٰہیت اور مفکر ملت کی

تعلیم وتربیت کے نتیجے میں اپنا خصوصی مقام حاصل کیا، وقت کی ضرورت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے کا سلیقہ پایا، درس وتدریس، تصنیف وتألیف، دعوت وتبلیغ اور رفاہی کاموں سے اپنے کو وابستہ کیا اور ہر جگہ امتیازی مقام پایا۔

بندہ اتنے مختصر عرصے میں اتنے بڑے کام کے بارے میں غور کرتا ہے تو اللہ تعالی کے اس مخلص بندے کی للّٰہیت، کڑھن، اساتذہ کا حسن انتخاب، تعلیمی ماحول، مختلف بارآور کوششیں، اور دعاؤں کا ثمرہ محسوس کرتا ہے۔

مفکر ملت کے فعال کام کا زمانہ منصب اہتمام کے ۱۸/سال ہیں، اس کے بعد کے ۹/ سال رئیس الجامعہ کی حیثیت کے ہیں، آپ کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور ۱۹۸۴ء میں آپ کی عمر ۵۱/سال تھی اور ۱۹۹۳ء میں آپ کی عمر ۶۰/سال کی تھی جب آپ فلاح دارین سے رسمی طور پر مکمل علیحدہ ہوئے۔

حاصل یہ کہ زندگی کی وہ عمر جو پختگی اور تجربات ومشاہدات کی ہوتی ہے، اس میں آپ کی صلاحیت سے ادارہ کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ہم لوگ کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے صدائے دل کی تقریظ میں اس کی طرف لطیف انداز میں تبصرہ کیا ہے ۔۔۔۔۔

’’آپ مدبر، مفکر، عالی ظرف اور سیر چشم، سراپا جہد عمل اور دوسروں کی ترقی کے خواہش مند رہتے ہیں؛ مگر قبل از وقت کام سے خالی ہوگئے، درحقیقت کچھ تو ڈاکٹروں نے بیمار کردیا اور کچھ تو کرم فرماؤں نے پریشان کردیا اور کچھ اولاد نے کھینچا تانی کی، کوئی کناڈا کی طرف کھینچ رہا ہے، کوئی ملاوی کی طرف اور کوئی برطانیہ کی طرف۔۔۔۔‘‘

اس بحث کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کے ماہر تعلیم وتدریس اور نظام تربیت

کے اسالیب کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں، اس میں آپ کی حیثیت دو طرح کی ہے:

(۱) منصب اہتمام وانصرام کا دور: جس میں آپ ایک بااختیار ناظم تعلیمات وتربیت کی حیثیت سے عملی طور پر احکام نافذ کرنے کی پوزیشن میں تھے، جس کا مشاہدہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے کیا۔

(۲) دوسرا وہ دور جب آپ نے رسمی طور پر ادارہ سے علیٰحدگی اختیار کی، اب آپ کی حیثیت ایک سرپرست اور مشیر کی تو ہوسکتی ہے؛ لیکن عملی طور پر ادارہ سے وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے حیثیت میں فرق آجاتا ہے، اور قانونی واصولی طور پر بھی اس حیثیت کا بدل جانا ضروری ہے؛ کیونکہ جو لوگ بھی ادارہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں، وہ ان مسائل کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں، تمام ہی اداروں، جامعات اور یونیورسٹیوں میں یہ اصول ہیں۔

البتہ مفکر ملت نے چونکہ ۵۱ رسال کی کم عمری میں ہی فلاح دارین کے منصب اہتمام کو چھوڑا اور اس کے بعد الحمدللہ تعالی زندگی کی کافی بہاریں دیکھیں، اور حسن اتفاق سے آپ کو اس دوسرے دور میں مختلف ملکوں کا سفر پیش آیا، وہاں کے علمی مراکز اور تربیت گاہوں کا آپ نے بنظر غائر معاینہ کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے تعلیمی وتنظیمی احوال کے ساتھ وہاں کی مقتدر وعلمی شخصیات سے تبادلۂ خیالات کئے اور یقینی بات ہے کہ یہ تجربات ومشاہدات فلاح دارین کی مزید ترقیات کا سبب بنتے، اگرچہ یہ مشاہدات آپ کی مختلف علمی مجالس اور بیانات کے ذریعہ ہم تک پہونچے اور تعلیمی، تدریسی وتنظیمی کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں؛ لیکن ایک ذمہ دار کی حیثیت سے آپ ادارہ میں جو عملی خوشگوار تبدیلی لاتے، اس کی بات ہی دوسری ہے۔

دارالعلوم فلاح دارین میں منعقدہ سمینار کے لئے بندہ کے ذمہ سونپے جانے والے

پانچ مقالات میں سے تین مقالات تحریر کئے تھے، اور ایک مقالہ حضرت مفکر ملتؒ کی حیات میں ہی تیار کیا تھا جس کو حضرت نے پڑھ کر اس میں مزید اضافہ کرنے کے لئے خود ہی زبانی طور پر کچھ چیزیں ارشاد فرمائی تھیں، وہ بھی مقالہ میں شامل کی گئی ، اور مذکورہ تحریر'' گلدستۂ محبت'' میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ ان مقالات میں سے ایک مقالہ حضرت کی تدریسی خدمات کے سلسلہ کا تھا، اور اتفاق سے ہماری جماعت کو حضرت کے پاس زیادہ کتابیں پڑھنے کا موقع میسر ہوا، لہٰذا میں نے اس کو تفصیل سے تحریر کیا، اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دامت برکاتہم (استاذ حدیث وادب دارالعلوم فلاح دارین) نے اس کو پڑھ کر حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

مولانا اسماعیل صاحب ابن مفکر ملتؒ سے اس مضمون کے سلسلے میں بات چیت ہوئی، تو انہوں نے حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم کے حوالے سے ذکر کیا کہ حضرت مفکر ملت کی نصابی ، نظامی وتربیتی سرگرمیوں اور آپ کے تعلیمی فکر کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، اتفاق سے میرے مقالے میں اس موضوع پر ہی کلام کیا گیا ہے، تو مولانا اسماعیل اور مولانا ابراہیم دونوں حضرات سے گفتگو ہوئی اور بندے نے اس موضوع کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے دوسرے اہل علم و نظام تعلیم وتربیت کے ماہرین کے اقوال بھی بطور تائید کے لکھنا مناسب سمجھا، اس طرح الحمد للہ تعالی اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا، تو اس کو حضرت مفکر ملت کی فکر کے طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، اور چونکہ میرا تعلق بھی دارالعلوم ماٹلی والا کے تعلیم وتربیت کے شعبہ سے ہی وابستہ ہے؛ تو کچھ تو حضرت سے کئے ہوئے مشورے اور خود اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں بھی کلام کرنا مناسب سمجھا ہے۔

نصاب و نظام تعلیم کے سلسلے میں بندے نے مختلف اکابر علماء کرام کی کتابیں و تحقیقی

مقالات پڑھے اور فارغین کی عملی زندگی میں اس کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے کچھ سفارشات پیش کی ہیں، جو دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور کی طرف سے ۲۰۰۷ء میں منعقد ہونے والی مجلس مشاورت برائے تسہیل نصاب میں پڑھی گئی تھی، اس اجلاس کے صدر محترم مفکر ملت اور مہمان خصوصی کے طور پر حضرت مولانا مفتی سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) تھے، چونکہ ان سفارشات کو مفکر ملت نے بہت پسند کیا تھا؛ لہٰذا ان کو بھی مزید اضافے کے ساتھ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نصاب کے سلسلے میں دارالعلوم ماٹلی والا کی طرف سے زمانے کے تقاضے کے مطابق کتابیں تیار کی گئیں، جن میں جدید فلسفہ اور علم الکلام، مقاصد شریعت کے قواعد، حدیث کے اصول ومصطلحات منہج حنفی کی روشنی میں، دوسرے مسلک پر فتوی دینے کے اصول وضوابط، تخصص فی الحدیث تاریخ، اہمت اور ضرورت، امام بخاری کا طریقۂ استدلال واستنباط، امام بخاری کے جرح وتعدیل کے قواعد، اجراء حدیث اور فہم مشکلات الحدیث کے قواعد جیسے معرکۃ الآراء مسائل پر تفصیلی کلام کیا، اور تخریج احادیث میں ’’جهود المراجيح، فرحة اللبيب، توجیہ الاخبار فی شرح مشکل الآثار‘‘ اور مفتیان کرام کی سہولت کے لئے ہدایۃ المفتی الی ابواب الفقہ نیز عصر حاضر میں میڈیا کی طرف سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی قانون پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات اور جغرافیہ وتاریخ میں عرب ممالک اور صوبۂ گجرات کے تعلقات کے عنوان پر بھی اردو عربی میں کتابیں مرتب کی گئیں۔

ایک بڑا مسئلہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان طلبہ وطالبات کے نصابِ تعلیم میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر ہونے والے اعتراضات یا جدید مسائل، سائنس وٹیکنالوجی، قانون، تاریخ، سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات اور اعتقادات وغیرہ مضامین

پڑھاتے وقت اسلام کی خدمات یا مسلمان سائنس دانوں، ماہرین سماجیات، معاشیات، سیاسیات وقانون دانوں وغیرہ کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوتا تھا، تو حضرت مفکر ملت کی رہنمائی میں اسکول کالج کے نصاب کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد آٹھ کتابوں کا ایک سیٹ گجراتی زبان میں تیار کیا گیا، اور مسلم ہائی اسکولوں اور مکاتیب کے اساتذہ کو ہدیۃً پیش کیا گیا، جس میں اسلامی عقائد، سیرت، مسلمان سائنس دانوں کی خدمات اور سائنس کی طرف سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا سائنس کے ہی دلائل کی روشنی میں جواب تیار کیا گیا، اسی طرح اسلام کے سیاسی، سماجی، معاشی، قانونی اور اخلاقی نظام کو معاصر نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ گجراتی زبان میں پیش کیا گیا، نیز ہندوستان کے مسلمانوں اور بادشاہوں نے بھارت کو کیا دیا، اس پر تفصیلی تاریخی کتاب تیار کی گئی اور خاص کر کے سلطان محمود غزنویؒ، سلطان اورنگ زیبؒ اور ٹیپو سلطانؒ پر ہونے والے اعتراضات کا جواب خود ہندو مصنفین کی کتابوں کی روشنی میں لکھا گیا، یہ سب حضرت فکر ملت کے صدقات جاریہ میں انشاء اللہ تعالی جائے گا۔

حضرت مفکر ملتؒ نے نصاب تعلیم کی انفرادیت واعتدالیت کے ساتھ عربی زبان و ادب، تجوید، انگریزی اور طلبۂ عزیز کے عمومی تعلیمی امور سے دلچسپی کا مظاہرہ کیا، طلبۂ عزیز، اساتذۂ کرام، کتب خانہ، خارجی مطالعہ، طریقۂ تدریس، وقت کی پابندی، مختلف دینی ودنیوی تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی زیارت اور وہاں کی نادر ونایاب کتابوں اور وہاں کے اچھے تجربات سے فائدہ اٹھانا، مدرسہ اور دار الاقامہ میں صفائی کا خوب اہتمام کرنا، کام کرنے والوں کی قدر کرنا، وقتاً فوقتاً موقع کی مناسبت سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو دعوت دینا، تربیت سازی اور افراد سازی کی مہم کو جاری رکھنا، زندگی کے آخری لمحے تک مدارس، علماء کرام اور انتظامیہ کے افراد کو اپنی تقاریر، کتابوں اور انفرادی مجالس کے ذریعہ پند ونصائح اور

تجربات سے فائدہ پہونچانے کے ساتھ دنیوی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے ایمان واعمال کی فکر کرنا، اسکول وکالج کے خدا بیزار نظام پر غائرانہ نظر رکھنا، غرض پوری زندگی تعلیم وتربیت اور اصلاح سے عبارت تھی۔

نصاب تعلیم کے سلسلے میں حضرت مفکر ملت نے عملی طور پر دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث اور تفسیر واصول تفسیر کو لیا اور علم عربیت وادب وانشاء میں ندوۃ العلماء کے نصاب کی کتابیں شامل فرمائیں، اور حضرت مولانا اقبال صاحب دیولوی کے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے مبعوث ہوکر فلاح دارین میں تشریف لانے کے بعد تقابل ادیان، الغزو الفکری، توحید، علوم القرآن اور مصطلحات حدیث وغیرہ جدید مضامین شامل کئے، مدرسہ کی ابتداء سے ہی فارسی اول سے عربی اول تک سماجیات، تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس اور حساب اور عربی ششم تک مرضیات انگلش کی کتابیں بھی مختلف گھنٹوں میں رکھی گئی تھیں۔

نیز اساتذۂ کرام کے انتخاب میں بھی دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم کے فارغین کو دیوبند والے نصاب کی کتابیں سپرد فرمائیں اور ندوہ کے فارغین کو ندوہ کے نصاب والی کتابیں سپرد فرمائیں۔ اس طرح طلبۂ عزیز کو نصاب تعلیم کے ساتھ نظام تعلیم وطریقۂ تدریس میں بھی دونوں نظاموں سے فائدہ حاصل ہوا، حضرت کے اس نصاب پر کافی گفتگو بھی ہوتی رہی؛ لیکن جب اس نصاب اور اس سے زیادہ نظامِ تعلیم وتربیت کے مضبوط ومستحکم اصول نے برگ وبار لانا شروع کیا، تو آہستہ آہستہ دیگر مدارس نے بھی اس راہ کو اپنایا۔

اب تو قدیم نصاب کے علمبردار دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں بھی کافی تبدیلیاں ہوچکی ہیں، جس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا محمد خلیلی قاسمی لکھتے ہیں:

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو درس نظامی کا نام دیا جاتا ہے، جو کسی حد تک صحیح

کہا جاسکتا ہے، لیکن کچھ لوگوں کو اس نام سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ نصاب بعینہ بارہویں صدی ہجری کا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کے اس نصاب کی بنیاد وہی درس نظامی تھا جو قیام دارالعلوم کے وقت عموماً ہندوستانی مدارس و درس گاہوں میں رائج تھا، لیکن دارالعلوم کے قیام کی ابتدا ہی سے درس نظامی جوں کا توں کبھی بھی نصاب نہیں رہا اور بعد میں حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، اگر کوئی شخص ملا نظام الدین کے درس نظامی کا آج کے دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے موازنہ کرے تو اسے دارالعلوم کے نصاب کو درس نظامی کا نام دینے میں بھی ہچکچاہٹ ہوگی؛ کیوں کہ اس میں علوم عالیہ کے ساتھ علوم آلیہ کی کتابوں میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں، درس نظامی کی متعدد کتابوں کو بالکل نکال کر دوسری کتابوں کا اضافہ کیا گیا ہے، جب کہ بہت سے موضوعات کی کتابوں کو بدل دیا گیا ہے، نصاب دارالعلوم میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل اور حذف و اضافہ کا عمل مسلسل جاری ہے۔

اسی طرح مولانا شوکت علی صاحب قاسمی بستوی لکھتے ہیں:

بڑے شد و مد سے یہ راگ الاپا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند و ملحقہ مدارس میں قدیم فرسودہ درس نظامی رائج ہے، جس میں معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہے اور کتب دینیہ خال خال ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس نصاب میں قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے، لے دے کے صرف تفسیر جلالین اور بیضاوی شریف کا کچھ حصہ شامل نصاب ہے، لیکن آپ ملاحظہ

فرمائیں تیسری جماعت سے ہی تفسیر (ترجمہ قرآن) داخل ہے، سال سوم، چہارم و پنجم میں قرآن کریم کا ترجمہ وتفسیر شامل ہے، اس طرح تین سالوں میں پورے قرآن کریم کا اردو ترجمہ، مختصر تفسیر اور نحوی وصرفی اجراء وغیرہ مکمل کرایا جاتا ہے۔ پھر تجوید سال اول سے سال ہشتم تک ہر سال لازمی ہے، اسی طرح فقہ کی کتابیں سال اول و ہشتم کے علاوہ تمام جماعتوں میں ہیں اور ہشتم یعنی دورۂ حدیث شریف میں بھی فقہ السنہ امتیازی شان سے پڑھایا جاتا ہے۔ نیز سیرت، اخلاقیات، عقائد کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں شامل نصاب ہیں۔

درس نظامی کا ایک نقص یہ بھی بیان کیا جارہا ہے کہ اس میں تاریخ داخل نہیں ہے، آپ نے دیکھا دارالعلوم کے نصاب میں اسلامی اور ملکی تاریخ کی کتابیں کئی داخل ہیں، پہلے درس نظامی میں کل دو ہی کتابیں حدیث کی رہی ہوں گی، لیکن اب تو کل ۱۳ کتابیں ہیں۔ تین دورۂ حدیث سے قبل اور باقی دورۂ حدیث میں، اور حدیث شریف تو دارالعلوم دیوبند میں اس شان سے بحمد اللہ پڑھائی جاتی ہے کہ شاید ہی کہیں اور اس طرح پڑھائی جاتی ہو، اور اس طرح شب و روز قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں شاید ہی کہیں بلند ہوتی ہوں، اللہ تعالی قبول فرمائے۔

ایک بات یہ بھی کہہ دی جاتی ہے کہ دارالعلوم میں ادب عربی پر توجہ نہیں ہے، پہلے درس نظامی میں واقعی یہ خلا تھا لیکن اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے، استاذ گرامی، عربی زبان وادب کے عبقری ومثالی معلم حضرت مولانا

وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی کو۔ انہوں نے تمرین عربی کا مکمل کورس تیار فرمایا، مختلف معاجم اور لغات مرتب فرمائیں، اور عربی زبان وادب کے فروغ کا سامان پیدا فرمادیا، اب سال اول و دوم وسوم میں مسلسل تمرین عربی داخل ہے، اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کی نفحۃ العرب، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی القراءۃ الواضحہ کے تینوں حصے، حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی کی مفتاح العربیہ، اسی طرح بہت سے ملحقہ مدارس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب کی قصص النبیین، القراءۃ الراشدہ وغیرہ کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ دیگر مدارس کے ذمہ داران بھی اس جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائیں، رہیں منطق وفلسفہ کی کتابیں تو دارالعلوم کے نصاب میں منطق کی کل پانچ اور فلسفہ کی ۲ ہی کتابیں موجود ہیں۔ (وفاق کے نصاب کا تنقیدی جائزہ)

نصاب کے علاوہ آپ کی توجہ طلبہ کے نظام الاوقات اور کسی استاذ کی غیر حاضری کے موقع پر آفس میں طلبۂ عزیز کو بلا کر تعلیمی وتربیتی امور کی طرف بار بار توجہ دلانے کی ہوتی تھی، اس میں ترغیب وترہیب دونوں امور سے کام لیا جاتا تھا، آپ نے اپنی پوری توجہ طلبۂ عزیز کی تعلیمی وتربیتی ترقی پے لگادی تھی؛ اس لئے آپ کے ارشادات، ملفوظات، خطبات اور نجی مجالس وغیرہ میں مختلف قسم کی تعلیمی وتربیتی باتیں ہی زیادہ ہوتی تھی، اصلاح اور دعوت و تربیت کا کوئی لگا بندھا وقت نہیں ہوتا ہے، جب جب بھی طلبۂ عزیز میں کسی بھی قسم کی کوئی کوتاہی نظر آئی، تو اس کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھا گیا؛ اس لئے آپ کے بیانات و خطبات اور علمی مجالس تعلیم وتربیت واصلاح کے متنوع ومختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ بندہ

نے آپ کے اس قسم کے تمام ارشادات کو مختلف عناوین سے معنون کر کے جمع کیا ہے، جو مدارس اسلامیہ کے طلبہ، اساتذہ، انتظامیہ اور دوسرے ادارے چلانے والوں کے لئے بھی مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کلمات تشکر:

اس کتاب کے مسودہ کی تبییض کے لئے عزیز القدر مولانا **رشید احمد منوبری** کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جو میری تمام عربی، اردو تحریرات کے مسودات کی تبییض اور حوالہ جات کی تلاش و تحقیق میں خندہ پیشانی و قلبی انشراح کے ساتھ بڑا تعاون فرماتے ہیں۔

اسی طرح عزیزم مولانا **ذاکر صاحب پارکھیتی** کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب کے مسودہ کی کمپوزنگ اور اس کی ترتیب و تزیین کے ذریعہ طباعت کے مسئلہ کو آسان کیا۔

نیز مولانا یٰسین صاحب کرماڈی، مولانا یوسف صاحب سندراوی اور جناب ایوب بھائی بھاڑبھوت کا بھی ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے میرا تعاون فرمایا۔

حق تعالیٰ شانہ ان تمام حضرات کے علمی، عملی و روحانی درجات میں ترقی نصیب فرمائے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(حضرت مولانا) **مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی** (دامت برکاتہم)

مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات، الہند

۷؍ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ = مطابق ۵؍ دسمبر ۲۰۱۹ء

ہندوستان کے نصاب ونظام تعلیم کی عہد بہ عہد تاریخ

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اپنی کتاب ''الثقافة الاسلامية فی الهند'' (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں) مترجم مولانا ابوالعرفان ندویؒ) میں فرماتے ہیں:

مصنفین اور مؤرخین نے ہندوستان کے بادشاہوں، امراء اور صوفیائے کرام وشعراء کے حالات میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے بہت محنت بھی کی ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کی علمی تاریخ نہایت تاریکی میں ہے، ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ وقتاً فوقتاً نصاب درس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں، تاریخ سے اسی قدر سراغ ملتا ہے کہ اس سرزمین میں فاتحان ہند کے ساتھ ساتھ علم آیا تھا اور جو تبدیلیاں عراق و ماوراء النہر میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، اس کا اثر یہاں کے نصاب پر بھی پڑتا تھا۔

سب سے پہلے سندھ اور ملتان کے ریگستانوں میں علم کے ذرے چمکے اور ان کی جگمگاہٹ اتنی بڑھتی گئی کہ رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں ان کی روشنی پھیل گئی، اور جب ملوک غزنویہ نے لاہور کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دیا، تو اس شہر نے سب سے پہلے اس روشنی سے فائدہ اٹھایا۔

جب دہلی فتح ہوئی تو بادشاہوں کی قدردانی سے علمائے باکمال ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر دہلی آنے لگے اور ایسے جلیل القدر علماء دہلی میں مجتمع ہو گئے، جن کا شہرہ سن کر دور دور سے لوگ آتے اور فیض یاب ہوتے تھے۔

غیاث الدین بلبن کے زمانے میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بلخی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد، وغیرہ جیسے بیسیوں صاحب کمال تھے، جن کے علم و فضل سے دہلی کا کوچہ کوچہ قرطبہ اور بغداد کا نمونہ بن رہا تھا۔

علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین نحبی، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم، وغیرہ چھیالیس علماء ایسے پایہ کے تھے، جن کی نسبت ضیاء الدین برنی جیسے مشہور مؤرخ کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں ان کا جواب نہیں تھا۔

محمد شاہ تغلق کے زمانے میں معین الدین عمرانی، قاضی عبدالمقتدر، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال علماء تھے، جن کے دامن تربیت میں پرورش پاکر شہاب الدین دولت آبادی ملک العلماء بن کر نکلے اور ایک دنیا کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔

فیروز شاہ کے عہد میں جلال الدین رومی تشریف لائے اور شاہی مدرسہ میں پرنسپل کی خدمات ان کو سپرد کی گئیں، نجم الدین سمرقندی بھی اسی زمانے میں دہلی آئے، اور اپنے فضل وکمال سے لوگوں کو مالا مال کرتے رہے۔

سکندر لودی کے زمانے میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دونامور عالم ملتان سے آئے اور انھوں نے منطق وحکمت کا معیار بڑھا کر نصاب میں نمایاں زور پیدا کر دیا۔

اکبر کے زمانے میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے آکر عضد الملک کے خطاب سے عزت پائی اور تمام ملک میں ان کی دھوم مچ گئی، اسی زمانے میں حکیم شمس الدین اور ان کے بھانجے حکیم علی گیلانی کی وجہ سے طب کو فروغ ہوا اور شیخ عبدالحق نے حدیث کو رواج دیا۔

شاہ جہاں اور عالم گیر کے عہد حکومت میں میر زاہد کا ستارہ اقبال چمکا اور ان کی

موشگافیوں نے تاج فضیلت میں چار چاند لگا دیے، گویا درس نظامیہ کی بنیاد ان ہی کے پرزور ہاتھوں کی ڈالی ہوئی ہے، ان ہی کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی مبارک اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مشہور خاندان تھا، جس میں جناب شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولوی عبدالحئ، شاہ محمد اسمعیل، مولوی محمد اسحاق، مولوی رشید الدین خان، مفتی صدرالدین خان، مولوی مملوک العلی وغیرہ جیسے نامور علماء اور مدرسین پیدا ہوئے۔

لاہور میں علم کا نشوونما دہلی سے پہلے ہوا تھا، مگر دہلی کی ترقی نے اس کو چند روز کے لیے دبا دیا تھا، آخر آخر پھر اس نے سنبھال لیا اور جمال الدین تلہ، کمال الدین کشمیری، مفتی عبدالسلام، ملا عبدالحکیم سیال کوٹی وغیرہ مشاہیر کی وجہ سے ایک مدت تک علم کا چرچا رہا اور ان سے ہزاروں طلبہ فیض یاب ہوئے۔

جونپور میں سلاطین شرقیہ کی قدردانی سے شیخ ابوالفتح شہاب الدین دولت آبادی، مولانا الہداد، محمد افضل استاذ الملک، ملا محمود صاحب شمس بازغہ، دیوان عبدالرشید، مفتی عبدالباقی، ملا نورالدین جیسے باکمال علماء وقتاً فوقتاً ہوتے رہے اور ان کا سلسلۂ تلمذ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔

گجرات میں شیخ محمد طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار، شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی، ملا نور الدین وغیرہ نے علم کی آب یاری کی، اسی زمانے میں قاضی ضیاء الدین باشندۂ نیوتنی نے گجرات جا کر شیخ وجیہ الدین کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور اپنے اہل وطن کے لیے یہ تحفہ لائے، ان سے شیخ جمال نے فائدہ اٹھایا، ان سے ملا لطف اللہ نے علم حاصل کیا، ان کے شاگردوں میں ملا جیون صاحب نورالانوار، ملا علی اصغر، ملا محمد امان، قاضی علیم اللہ بہت زیادہ نامور ہوئے اور ہر ایک صاحب سلسلہ اور صاحب درس ہو گیا۔

الہ آباد میں شیخ محب اللہ، قاضی محمد آصف، شیخ محمد افضل، شاہ خوب اللہ، شیخ محمد طاہر،

حاجی محمد فاخر زائر، مولوی برکت، مولوی جار اللہ اور دیگر باکمال علماء نے ایک مدت تک سلسلۂ درس وتدریس کو گرم رکھا اور تقریباً ایک سو برس تک خوب چہل پہل رہی۔

لکھنؤ میں سب سے پہلے شیخ اعظم اس تحفہ کو جون پور سے لائے، اس کے بعد شاہ پیر محمد نے بزم افادہ گرم کی اور ان کے شاگرد ملا غلام نقشبند نے اس کو خوب رونق دی، اسی زمانے میں شیخ قطب الدین سہالوی کا بھی چرچا پھیلا ہوا تھا، جو عبدالسلام دیوی اور محب اللہ الٰہ آبادی کے سلسلہ میں ایک نام ور عالم تھے، شیخ قطب الدین کی شہادت کے بعد ان کے نامور فرزند ملا نظام الدین نے علم کے دریا بہا دیے اور لکھنؤ کو علم کا مرکز بنا دیا اور جو نصاب مقرر کیا، اس کو ہندوستان کے ہر ایک درس گاہ میں بسر وچشم قبول کیا گیا، اسی خاندان میں ملا حسن، بحر العلوم، ملا مبین، مفتی ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ، مفتی محمد اصغر، مفتی محمد یوسف، مولوی نعیم اللہ، مولوی عبدالحکیم، مولوی عبدالحلیم، مولوی عبدالحی، وغیرہ ایسے ایسے باکمال مدرسین پیدا ہوئے، جن کا جواب کسی خاندان میں نہیں مل سکتا۔

نصاب کے چار ادوار:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دور قائم کریں، اور جو جو کتابیں ہر دور میں مروج تھیں، ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے سیر سے مشائخ کے طبقات سے، شعراء کے تذکروں سے اور مکتوبات وملفوظات سے مل سکتی ہے، یکجا کردیں، دیکھنے کو تو یہ ایک ذرا سا کام ہوگا، مگر مختلف کتابوں کے ہزار ہا صفحے الٹنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں، جو ناظرین کے سامنے آج پیش کرتے ہیں۔

(۱)......دور اول: اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہئے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا، کم وبیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل

فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی، صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث، نحو مصباح، کافیہ، لب الالباب مصنفہ قاضی ناصر الدین بیضاوی (اور چند دنوں کے بعد ارشاد مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی)

فقہ میں ہدایہ۔

اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح اور اصول بزدوی۔

تفسیر میں مدارک، بیضاوی، اور کشاف۔

تصوف میں عوارف اور فصوص (اور ایک زمانے کے بعد نقد النصوص و لمعات بھی ان مدارس میں رائج ہوگیں جو خانقاہوں سے متعلق تھے۔)

حدیث میں مشارق الانوار، اور مصابیح السنۃ (یعنی مشکوٰۃ المصابیح کا متن)

ادب میں مقامات حریری، زبانی یاد کی جاتی تھی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے استاد شمس الدین خوارزمی سے (جو بعد کو شمس الملک ہوگئے) مقامات حریری پڑھی تھی اور اس کے چالیس مقامے زبانی یاد کیے تھے۔

منطق میں شرح شمسیہ۔

فن کلام میں، شرح صحائف اور بعض بعض مقامات پر تمہید ابوشکور سالمی۔

اس طبقہ کے علماء کرام کے حالات تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانے میں منطق و فلسفہ معیار فضیلت ہے، ویسا ہی اس زمانے میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا، حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہوجاتا تھا۔

(۲)......دور دوم: نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان

سے آئے، شیخ عبداللہ دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ سنبھل میں فروکش ہوئے، سکندر لودی نے نہایت کشادہ دلی سے ان کا خیر مقدم کیا، یہاں تک کہ خود بادشاہ ان کے حلقۂ درس میں آکر شریک ہوتا تھا، اور اس خیال سے کہ اس کے آنے سے سلسلۂ درس برہم نہ ہوجائے، مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر ان کی تقریر سے محظوظ ہوتا رہتا تھا اور بعد فراغت کے شیخ عبداللہ کی خدمت میں جاکر ملاقات کرتا تھا۔

کچھ ان دونوں کے فضل وکمال اور کچھ بادشاہ کی قدردانی سے بہت جلد ان کی علمی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی، انہوں نے معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لئے قاضی عضد کی تصانیف مطالع ومواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم سلسلۂ درس میں داخل کیں، اور بہت جلد یہ کتابیں متداول ہوگئیں۔

اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا اور تفتازانی کے شاگردوں نے مطول ومختصر کی بنیاد ڈالی اور تلویح وشرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ اسی زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح ملاجامی بھی رفتہ رفتہ داخل نصاب ہوگئیں۔

اس دور کے سب سے آخر مگر سب سے زیادہ نام ور عالم شیخ عبدالحق محدث ہندوستان سے عرب تشریف لے گئے، اور تین برس رہ کر علمائے حرمین محترمین سے حدیث کی تکمیل کی، اور اس تحفہ کو اپنے ساتھ لائے اور انہوں نے اور ان کی نام ور اولاد نے ہمیشہ اس کی اشاعت کی کوشش کی، مگر افسوس ہے کہ اس کو قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی، یہ شرف زمانۂ مابعد میں جناب شاہ ولی اللہ کے واسطے رکھا گیا تھا، جو ان کو حاصل ہوگیا۔

اس طبقہ کے علماء کرام کے حالات دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانے میں صدرا اور شمس بازغہ منتہائیہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح اس زمانے میں مفتاح

العلوم سکاکی اور قاضی عضد کے مطالع ومواقف منتہائیہ کتابیں سمجھی جاتی تھیں، شیخ عبدالقادر نے منتخب التواریخ میں جا بجا اس کا اشارہ کیا ہے، مفتی جمال خاں کے حال میں لکھا ہے'' بر شرحین مفتاح محاکمہ کردہ وعضدی را کہ کتاب منتہیائیہ است میگویند کہ چہل مرتبہ از اول تا آخر درس گفتہ'' (جلد سوم منتخب التواریخ) شیخ حاتم کے حال میں لکھا ہے'' می گفتند کہ قریب بچہل مرتبہ شرح مفتاح ومطول را از باء بسم اللہ تا تاء تمت درس گفتہ وبریں قیاس سائر کتب منتہائیہ۔''

(۳)......دور سوم: نصاب درس میں جو تغیر دور دوم میں ہوا تھا، اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیار فضیلت کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنی ہو گئے تھے، اسی وجہ سے شاہ فتح اللہ شیرازی کے آتے ہی درسگاہوں میں نئی قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی، دربار اکبری نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا اور علماء نے نصاب درس کے اس اضافہ کو فوراً منظور کرلیا، جس کو شاہ فتح اللہ شیرازی نے پیش کیا تھا۔

مگر نہایت بے انصافی ہوگی، اگر ہم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کو اس موقعہ پر بھول جائیں، یہ بزرگ محقق دوانی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور سب سے پہلے متاخرین کی تصنیفات کو انہوں نے رواج دیا اور اس چشمۂ فیض سے صرف گجرات ہی سیراب نہیں ہوا بلکہ ان کی چھینٹیں وسط ہند تک پہونچیں، قاضی ضیاء الدین نیوتنی کے باشندہ تھے، وہ گجرات سے یہ تحفہ لے کر آئے اور شیخ جمال نے ان سے حاصل کر کے دور دور تک پھیلایا، ملا لطف اللہ شیخ جمال کے ممتاز شاگرد تھے، ان سے ملا جیون صاحب نور الانوار، ملا علی اصغر، قاضی علیم اللہ، ملا محمد زمان وغیرہ نے حاصل کیا، جن میں کا ہر ایک صاحب سلسلہ اور صاحب درس تھا، یہ تو ہوا مگر اس درس کو قبولیت عام اس وقت حاصل ہوئی، جب شاہ فتح اللہ شیرازی نے اس کو رواج دیا اور ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیل گئے، اس لحاظ

سے میر آزاد کا لکھنا بھی صحیح ہے۔

شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۱۷۴ ہجری نے (جو اس دور کے سب سے آخر مگر سب سے زیادہ نام ور عالم تھے) الجزء اللطیف میں اپنی خواندگی یوں ظاہر فرمائی ہے۔

نحو میں کافیہ، شرح جامی، منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، کلام میں شرح عقائد نسفی مع حاشیۂ خیالی، شرح مواقف، فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ (کامل) اصول فقہ میں حسامی، اور کسی قدر توضیح تلویح، بلاغت میں مختصر، مطول، ہیئت وحساب میں بعض رسائل مختصرہ، طب میں موجز القانون، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کل، شمائل ترمذی کل، کسی قدر صحیح بخاری، تفسیر میں مدارک، بیضاوی، تصوف وسلوک میں عوارف ورسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمۂ نقد النصوص۔

اس قدر پڑھنے کے بعد شاہ صاحب عرب گئے اور وہاں کئی برس رہ کر شیخ ابوطاہر مدنی سے فن حدیث کی تکمیل فرمائی، اور ہندوستان کو یہ تحفہ لے کر آئے اور ایسی سرگرمی سے اس کی اشاعت فرمائی کہ باوجود کساد بازاری کے اب تک اس کا اثر باقی ہے، درحقیقت صحاح ستہ کے درس و تدریس کا ہندوستان میں رواج اسی وقت سے ہوا ہے، جب کہ شاہ صاحب اور ان کے نام ور اخلاف نے اس کو رواج دیا اور اپنی اپنی عمر عزیز کا بیش بہا حصہ اس کی اشاعت میں صرف کر دیا۔

شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا، مگر چوں کہ اس زمانے میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درس گاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام وزبان آشنا ہو رہے تھے، اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے نام ور بیٹوں نے زمانے کی روش سے مجبور ہو کر اس کو رواج دینے کی کوشش بھی نہیں کی۔

(۴)......دور چہارم: چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قائم ہوا اور ملا نظام

الدینؒ نے ایسے پرزور ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی کہ اب تک باوجود امتداد زمانہ کے اس میں کا ایک شوشہ بھی کم نہیں کیا گیا، ملا نظام الدین جناب شاہ ولی اللہؒ کے معاصر تھے، لہٰذا ان کے زمانے میں وہی کتابیں رائج تھیں، جو شاہ صاحب کے نصاب درس میں تھیں، ان پر ملا صاحب نے حسب ذیل ترمیم فرمائی۔

منطق میں بجائے شرح مطالع کے سلم العلوم، میرزاہد رسالہ، میرزاہد، ملا جلال، فلسفہ میں شمس بازغہ بڑھایا، کلام میں میرزاہد شرح مواقف، اصول فقہ میں بجائے حسامی کے نور الانوار، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) تفسیر میں بجائے مدارک کے جلالین، اس نصاب کی ترمیم واضافہ کے بعد مندرجہ ذیل شکل قائم ہوئی۔

صرف میں میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ، نحو میں نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، منطق میں صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، حکمت میں میبذی، صدرا، شمس بازغہ، ریاضی میں خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس، مقالہ اولیٰ، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اول، بلاغت میں مختصر المعانی، مطول تا ما ان قلت فقہ میں شرح وقایہ اولین، ہدایہ اخیرین، اصول فقہ میں نورالانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) کلام میں شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میرزاہد، شرح مواقف، تفسیر میں جلالین، بیضاوی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح۔

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبا میں (بشرطیکہ تحقیق کے ساتھ پڑھا ہو) قوت مطالعہ، دقت نظر، احتمال آفرینی اور قوت قریبہ پیدا ہو جاتی ہے، کسی فن میں طالب علم کو بالفعل کمال حاصل نہیں ہوتا، مگر وہ اپنے شوق اور جاں فشانی سے جس علم میں چاہے کمال پیدا کر سکتا ہے۔

میں نے تحقیق کے ساتھ پڑھنے کی قید اس واسطے لگائی ہے کہ اب طریقۂ تعلیم بگڑ گیا ہے، ملا نظام الدینؒ کا طریقۂ درس یہ تھا کہ وہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے؛ بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرز تعلیم نے ملا کمال الدین، بحر العلوم، حمد اللہ، جیسے اہل کمال پیدا کیے تھے۔(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں:۲۱-۳۲)

درس نظامی کے نصاب کا پس منظر

مختلف نصابوں کا مجموعہ:

مولانا محمود احمد غازی صاحب محاضرات تعلیم میں لکھتے ہیں:

جب مغل ہندوستان آئے اور ہمایوں کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کیا، تو برصغیر میں ایک اور روایت متعارف ہوئی، یہ روایت فلسفے اور منطق کی تھی، جس کی ساخت پرداخت اور تانا بانا ایران میں تیار ہوا، اب برصغیر اور مدارس کے علمی روابط ایران کے ساتھ استوار ہوئے، اور ایرانی علماء بڑی تعداد میں بلائے گئے، سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اہل علم وادب یہاں آئے، شاعر، فلسفی، منطق اور دیگر علوم کے ماہرین نے ہندوستان آکر مدارس کے نصاب میں فلسفے اور معقولات یا عقلی علوم کو متعارف کروایا، اب اور اس کے بعد کے دور میں مدرسہ دو مختلف روایات کا امین بن گیا، پہلی روایت وسط ایشیا اور افغانستان کی روایت جو متن، مختصر متن اور متن پر متن کے ذریعہ فقہ اور اصول فقہ پر زور دیتی ہے۔ اور دوسری روایت ایرانی ہے، جس میں زور فلسفے اور منطق پر تھا، عہد مغلیہ میں مدرسے کا یہ بنیادی خاکہ ہے۔

فرنگی محل کا نصاب:

ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی روایات قائم تھیں، جن میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ایک روایت لکھنؤ میں ایک ادارے فرنگی محل میں پروان چڑھی، فرنگی محل

دراصل ایک عمارت کا نام ہے، جسے جہانگیر نے برطانوی تاجروں کے ایک گروہ کے لیے مختص کیا تھا، جنہیں ہندوستان میں کاروبار اور تجارت کی اجازت دی گئی تھی، ان کا دفتر وہیں تھا اور اس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں جب ان سے متعلق شکایات ملیں کہ وہ جہانگیر کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی نہیں کرتے تو اورنگ زیب نے ان کے خلاف انتظامی کارروائی کی اور ان سے وہ عمارت چھین کر انہیں اس سے بے دخل کر دیا، اس کے بعد یہ عمارت مسلمان علماء کی ایک جماعت کو دی گئی، جس میں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا، چوں کہ یہ عمارت ''فرنگیوں'' کی ملکیت میں تھی، اس لیے یہ ''فرنگی محل'' (قصر مغربیاں) کے نام سے معروف ہوئی، یہ مدرسہ بھی مدرسۂ فرنگی محل (فرنگیوں کے محل یا قلعے میں قائم کردہ مدرسہ) کے نام سے معروف ہوا۔ یہ مدرسہ اورنگ زیب عالم گیر کے ایک معاصر فقیہ اور عالم مولانا نظام الدین سہالوی نے قائم کیا تھا، جنہوں نے عالم گیر کے حکم سے فتاوی عالم گیری مرتب کرنے والے دوسو علماء کی کمیٹی کی نگرانی بھی کی تھی۔

آپ کو مدرسہ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جسے آپ نے قائم کیا، جس نے فقہ اور اصول کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برصغیر کی علمی روایت پر غیر معمولی اثر مرتب کیا۔

اصولِ فقہ کو تفقہ اور نئے اصولِ قانون وضع کرنے کے وسیلے کے طور پر پڑھانے کے بجائے الفاظ کی بازی گری کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، جس کا ارتکاز کسی مصنف کے متن پر ہوتا تھا، یہی حال فقہ کا تھا، اس لیے ہماری ناچیز رائے میں مدرسۂ فرنگی محل کے عظیم کردار کے باوجود فقہ اور اصول فقہ کے میدان میں اس کا اثر بے حد محدود تھا، اس عمل کے ذریعے کوئی نئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اگر کچھ نئی کتابیں تھیں بھی تو ان میں کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا گیا،

نہ اس میں اصولِ فقہ کے وسیع میدان کا کوئی حصہ نیا شامل کیا گیا، کم از کم مدرسۂ فرنگی محل کی یہ صورتِ حال مغلیہ سلطنت کے سقوط تک جاری رہی۔

جونپور کا نصاب:

دوسری روایت جون پور کی تھی جو جنوبی ہندوستان، جنوبی یو پی میں قائم تھی، اس کو شیرازِ ہند کہا جاتا تھا، شیراز کی علمی روایت کا ارتکاز زیادہ تر فلسفے پر تھا، جس کو معقولات یا عقلی علوم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، شیرازِ ہند، جون پور نے بعض بڑے جلیل القدر علماء پیدا کیے، لیکن ان کی دل چسپی کی تگ و تاز کی جولاں گاہ، ایران سے درآمد شدہ یا ایرانی علماء کے پروردہ عقلی علوم تھے، جون پور کی تاریخ میں ملا محمود جون پوری سب سے نمایاں شخصیت سمجھے جاتے ہیں، بعض علماء کے نزدیک وہ امام شاہ ولی اللہ کے پایے کی شخصیت تھے، بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ وہ نبوغِ علمی اور فکری عبقریت میں شیخ احمد سرہندی کی ہم سر شخصیت تھے، لیکن ان کا یہ سارا فضل وکمال ایران میں رائج اور مشہور فلسفیانہ بحثوں کی تلخیص واختصار پر مشتمل متون تیار کرنے تک محدود تھا، یہ جون پور کی علمی روایت تھی۔

شاہ ولی اللہ کا نصاب:

جب امام شاہ ولی اللہ عرب دنیا کے تقریباً پندرہ ماہ کے قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان لوٹے تو انہوں نے ان تعلیمی نظاموں میں کچھ تبدیلیوں اور بہت پیش رفت کو متعارف فرمایا، آپ نے فلسفے، الفاظ و متون کی جادوگری اور کتب قواعد کی شروح وحواشی کے بہ کثرت استعمال میں ضرورت سے زیادہ توغل کا الغاء کر ڈالا اور ایک بہت سادہ اور نئے نصابِ تعلیم کی آب یاری کی، جسے اولاً ان کے والد گرامی، شاہ عبدالرحیم نے متعارف کروایا تھا، امام شاہ ولی اللہ نے اس میں اپنے والد کی سرپرستی میں پڑھے ہوئے نصاب کی

تفصیل اپنی خود نوشت سوانح ''الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف''میں ذکر کی ہے، انہوں نے اس نصاب کے مختلف پہلوؤں اور متون پر بھی گفتگو کی ہے، ابھی تک فرنگی محل، جون پور یا دیگر متعدد اداروں یا مدارس کے نصاب میں قرآن وحدیث کو کوئی نمایاں اہمیت نہیں دی گئی تھی، تعلیم کسی حد تک عمومی تھی اور اس میں کئی مضامین داخل تھے، ایک صاحب علم کے اندازے کے مطابق ایک چھت تلے اور ایک نظام کے تحت تقریباً چھپن مضامین کی تدریس ہوتی تھی، مقصد یہ پیش نظر ہوتا تھا کہ طالب علم کو علم کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہی فراہم کی جائے، اس کی بنیاد مختصر متون تھے، جن کا یاد کرنا طالب علم کے لیے ناگزیر تھا، تاکہ مختلف علوم وفنون کے بنیادی مسائل کی ایک کلید اس کے ہاتھ آجائے، اس نصاب میں طب، حساب، جیومیٹری اور اس طرح کے دیگر فنون شامل ہوتے تھے، جن کی اساس ایران، وسط ایشیا یا عرب دنیا کے علماء کے تیار کردہ مختصر متون تھے۔

امام شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ یہ نصاب اس پایے کا اہل اور جید عالم تیار کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا جو ان کے پیش نظر تھا، دیگر اداروں میں مروج یونانی فلسفے کے مقابلے میں آپ نے قرآن ، حدیث اور اسرارِ شریعت کے مطالعے پر زور دیا، شاہ صاحب نے متعدد متون تحریر کیے جنہیں داخلِ نصاب کیا گیا، متنِ حدیث کے مطالعے کے لیے موطا امام مالک مع شروحات لازمی قرار دی گئی، متن پر ضرورت سے زیادہ کی روایت کم کی گئی، انسانیت، برصغیر اور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پہلا تعارف تھا جس میں نصاب کو قرآن، حدیث اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیاد پر استوار کرنے کی سنجیدہ اور منضبط کوشش کی گئی۔

دارالعلوم دیوبند کا نصاب:

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کوکب اقبال کے مکمل طور پر غروب

ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام مدارس کو ختم کر کے رکھ دیا، اوقاف کا نظام تلپٹ کر دیا اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو پس پشت ڈال دیا، مسلم عدالتیں باقی نہ رہیں، نفاذِ شریعت کا معاملہ کالعدم ہو گیا اور قاضیوں اور مفتیوں کا وجود مٹ کر رہ گیا اور سب بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

مدارس کو اوقاف کی امداد، مرکزی حکومت کی توجہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم صوبائی حکومتوں یا امارتوں کی اعانت سے محروم کر دیا گیا اور کسی اسلامی تعلیم کی روایت کو باقی رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

اس صورتِ حال میں مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حاجی محمد عابد حسینؒ اور بعض دیگر حضرات سامنے آئے اور دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم اور اس کے اداروں کے ختم کرنے کی جو لہر برپا تھی، اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اور روایت کی حفاظت کی ممکنہ حد تک حفاظت کی جاسکے، یہ لوگ اسی روایت کے تربیت یافتہ اور درسِ نظامی کے متون اور کتب کے فاضل تھے، اس لیے انہوں نے مدرسے کے نصاب کے لیے درسِ نظامی ہی کو اختیار کیا تاہم اس میں دو بنیادی ترمیمات کیں، ابتدا میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ منطق اور فلسفے کی کوئی کتاب بھی داخلِ نصاب نہیں کی جائے گی، ان کا خیال تھا کہ اس وقت چوں کہ اصل مسئلہ اسلامی علوم کی حفاظت کا ہے، اس لیے قرآن، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا جائے اور ان ہی کو پڑھایا جائے، اس لیے ان کے نزدیک فلسفے، منطق اور دیگر مضامین کے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اس لیے ابتدا میں دارالعلوم دیوبند میں ترمیم شدہ درسِ نظامی کے اندر منطق، فلسفہ اور دیگر علوم شامل نہ تھے۔

دوسری اہم ترمیم یہ تھی کہ درسِ نظامی کے اختتام پر حدیث کے محض تعارفی نصاب کو شامل کیا گیا اور پھر آخر میں ایک مستقل سال حدیث کے خصوصی مطالعے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ خاص کیا گیا، ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم دیوبند کی تقریباً نوے سالہ طویل مدت کے دوران متعدد تبدیلیاں کی گئیں، بعد میں فلسفے اور منطق کے علاوہ حدیث کی کچھ مزید کتابیں (طحاوی، مشکاۃ اور موطا امام محمد) بھی شامل کی گئیں۔

کافی بعد میں متنِ قرآن کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا، جو غالباً دوسرے یا تیسرے سال سے شروع ہوتا تھا، اور آخر تک چلتا تھا، جس کے نتیجے میں مکمل قرآن ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو گیا، اصولِ تفسیر پر بھی کچھ متون شامل کر دیے گئے، شاہ ولی اللہؒ کی قرآنی فلسفے اور تفسیری اصولوں پر کتاب ''الفوز الکبیر'' داخلِ نصاب کی گئی۔

یہ تبدیلیاں مختلف وقفوں سے کی گئی، بیسویں صدی کے آغاز میں، غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں امام شاہ ولی اللہؒ کی شاہ کار کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو ایک تکمیلی ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا، یہ کتاب دارالعلوم کے فضلاء کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس طرح درسِ نظامی ہم تک پہنچا ہے، ۱۸۶۷ء (جب عہدِ برطانیہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی) سے ۱۹۴۷ء (جب ہندوستان خود مختار بنا) تک دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں (جن کی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں (ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد تھی) کے بنیادی مقاصد دو تھے۔

(۱) مختلف مساجد میں امام اور خطیب مہیا کرنا۔

(۲) دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں میں اساتذہ کی فراہمی۔

(محاضراتِ تعلیم: ۵۶ - ۶۳)

درس نظامی کی وجہ تسمیہ:

مولانا نور الحسن کاندھلوی اپنے تحقیقی مقالے میں رقمطراز ہیں:

معلوم نہیں کیوں اس نصاب کو درس نظامی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، نظامی کی یہ نسبت اگر شہرۂ آفاق مدرسہ نظامیہ بغداد سے ہے تو کس وجہ سے، اور اگر خاندان علمائے فرنگی محلی کے جد امجد حضرت مولانا ملا نظام الدین سہالوی (وفات ۹/ جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ- مئی ۱۷۴۸ء) سے ہے، تو کس طرح؟

کیوں کہ اول تو یہ ثابت نہیں کہ ملا نظام الدین نے اپنا کوئی ایسا نصاب تعلیم مرتب فرمایا تھا جو ملا صاحب کے حلقۂ درس اور ان کے شاگردوں میں معمول و مروج تھا، اور اسی ترتیب پر بعد کی نسلوں کو منتقل ہوا۔ ملا نظام الدین صاحب نے ایسا کوئی نصاب مرتب نہیں کیا(۱)، اگر کیا بھی ہو تو وہ اب موجود نہیں؛ بلکہ اس کی تفصیلات بھی مفقود ہیں۔

جن خاص کتابوں کی وجہ سے اس نصاب کو درس نظامی کہا جاتا ہے، ان میں کئی ایک تو وہ ہیں جو ملا فتح اللہ شیرازی کی باقیات اور ان کے علمی معقولی اثرات کا ایک حصہ ہیں، اور چند ایسی بھی ہیں جو ملا صاحب کی وفات کے بعد وجود میں آئی تھیں؛ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ملا

---

(۱) ملا صاحب کا قریب ترین تذکرہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' (مؤلفہ ۱۱۶۶ھ) میں کیا ہے، ص: ۲۲۰- ۲۲۴ طبع اول (آگرہ: ۱۳۲۸ھ- ۱۹۹۰ھ) مگر ملا صاحب کے کسی نصاب کا ذکر نہیں کیا، نیز اس وقت کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں سے تذکرۂ علمائے ہند، مؤلفہ مولوی رحمان علی انالی، ص: ۲۴۱، ۲۴۲ (طبع دوم- نول کشور لکھنؤ ۱۳۳۲ھ- ۱۹۱۴ء) تک کسی نے بھی اس نصاب تعلیم کا ذکر نہیں کیا۔ اس خونوادہ کے ایک فاضل اور مولانا ملا نظام الدین پر فاضلانہ کتاب: ''بانی درس نظامی'' کے مؤلف محمد رضا انصاری صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ایک پورا باب درس نظامی پر لکھا ہے، ص: ۲۵۹- ۲۶۹ (لکھنؤ ۱۳۹۳ھ- ۱۹۷۳ء) مگر اس سے بھی یہ رہنمائی نہیں ملتی کہ ملا صاحب نے یہ نصاب کب مرتب فرمایا تھا اور اس کا استناد کس طرح ثابت ہے۔

صاحب نے ان کتابوں کو پڑھایا؛ بلکہ دیکھا بھی ہو، جو کتابیں بنیادی اصول وقواعد اور فقہ و دینیات پر مشتمل ہیں، ان میں سے اکثر کتابیں صدیوں سے ہندوستان کے مختلف حلقہائے درس میں رائج اور قدیم ترین نصاب ہائے تعلیم کا حصہ رہی ہیں؛ اس لئے ان کو بھی ملا صاحب کے نظام سے وابستہ اور مختص نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا اس نصاب کی ملا صاحب سے نسبت درست نہیں۔

خیرآباد و دہلی کالج کا نصاب:

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جو نصاب تعلیم تقریباً ڈیڑھ سو سال سے معمول و مروج ہے، وہ برصغیر ہند کے چار اہم نصاب یا حلقہائے درس کا خلاصہ وانتخاب ہے:

(۱) خاندان علمائے فرنگی محلیؒ

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اسلاف واخلافؒ کا نصاب تعلیم

(۳) علمائے خیرآباد کا نصاب درس

(۴) دہلی کالج کا نصاب تعلیم

ان چاروں کے اثرات کو اس طرح سمجھا اور تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اس نصاب میں شامل کتب حدیث اور صحاح ستہ کا اہتمام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور خانوادۂ ولی اللہیؒ کا فیضان ہے، فقہ حنفی کی اہم کتابیں اس نصاب درس کا حصہ تھیں جو عہد مغلیہ؛ بلکہ اس سے بھی پہلے عہد سلطنت سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں جاری تھا۔ منطق و فلسفہ کا شغف مولانا ملا نظام الدین اور سلسلۂ فتح اللہ شیرازی کا اثر ہے۔ فلسفہ یونان کی قدیم اور دقیق کتابیں شفا شیخ الرئیس ابن سینا، اسفار اربعہ ملا صدرا شیرازی، شرح اشتہارات محقق طوسی، افق المبین میر باقر داماد وغیرہ کا ذوق علمائے خیرآباد کا ورثہ ہے۔ عربی ادب کی کتابیں خصوصاً معلقات، جاہلی شعراء نیز حماسہ، متنبی وغیرہ دہلی کالج سے منتقل ہوئی ہیں۔

دار العلوم دیوبند ومظاہر العلوم:

دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے بانیان گرامی- جو خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے دست گرفتہ اور جرعہ نوش تھے- دہلی کالج کے فیض علم سے مملو تھے اور معقولات کے قدیم سلسلوں سے بھی فیض پائے ہوئے تھے؛ اس لئے وہ ان تمام نسبتوں، صلاحیتوں اور علوم کے جامع تھے، انہوں نے اپنے مدارس کے لئے مرتب نصاب تعلیم میں تمام نسبتوں اور چشم ہائے علم سے استفادہ کا گویا اعتراف کیا اور خیال رکھا، ان حضرات کے علمی، تعلیمی، تدریسی کمالات میں اعلی درجہ کے سرکاری اداروں، کالجوں میں مسند درس وتعلیم سنبھالنے اور شعبۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی جامعیت، رچاؤ اور اثر اندازی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، جس کو وسیع تعلیمی تجربات نے بڑی بلندی اور معنویت عطا کر دی تھی، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک نے جب پرانے تمام مدارس اور مراکز تعلیم کو بے نام ونشان کر دیا تو ان حضرات نے اپنے علمی تعلیمی تجربہ کو نئے ماحول کے لئے نئے انداز سے مرتب کیا، جس کا ایک نتیجہ ان مدارس کا وہ سب سے پہلا نصاب تعلیم بھی ہے، جو ان حضرات گرامی نے دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں ان کے پہلے سال میں مرتب ونافذ فرمایا تھا۔

دیوبند وسہارنپور کے دونوں اسلامی مدرسے (جو بعد میں دار العلوم اور مظاہر علوم کے نام سے موسوم ومشہور ہوئے) ایک ہی سال میں، ایک ہی مقصد سے، اور ایک ہی نہج پر قائم ہوئے تھے، دار العلوم کا افتتاح یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۶؍مئی ۱۸۶۶ء) کو ہوا تھا، مظاہر علوم کا اس کے چھ مہینہ بعد، رجب ۱۲۸۳ھ- ۲۴ نومبر ۱۸۶۶ء میں۔ یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ دونوں مدارس نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی، دس سال کا مکمل نصاب تعلیم منتخب اور وضع کر لیا تھا، جس سے ان مدارس کے بانیین کرام کی بلند نظری، رفعت پرواز اور نہایت دور رس

منصوبوں اور عالی مقاصد کا بھی ضمناً اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہ صرف ایک اتفاق یا توارد نہیں کہ دونوں مدرسوں کے ذمہ داروں نے سال اول یا آغاز تعلیم سے فراغت وفضیلت یا آخری کتابوں تک، عربی کی کتابوں اور دینیات کا نصاب ایک ہی طرح کا اور ایک ہی نہج پر مرتب فرمایا تھا، اگرچہ مظاہر علوم کے نصاب میں چند (صرف پانچ) کتابیں دارالعلوم سے زائد تھیں۔

ابتدائی نصاب میں علوم عصریہ کی شمولیت:

دارالعلوم دیوبند کے اس ابتدائی نصاب میں جو جامعیت، ہمہ گیری، حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں کی ایک خاص تریب پر تعلیم، عقلی علوم خصوصاً ہیئت (ASTRONOMY)، ہندسہ (GEOMETRY) اور ریاضی (ARITHMETIC) وغیرہ کی ضروری فنی تعلیم، فارسی کا اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے ذریعہ فاضلانہ درس، اور عربی، فارسی، اور اردو تینوں زبانوں سے ایک دوسری زبان میں ترجمے کی ترتیب تھی، وہی اس نصاب کا خاص جوہر اور بنیادی حصہ تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۲۹۰ھ (جنوری ۱۸۷۴ء) میں دارالعلوم کے جلسہ سالانہ میں ان مدارس کے نظام اور مقاصد پر ایک اہم اور معرکہ آراء تقریر فرمائی تھی، جس میں اس کی صراحت فرمائی تھی کہ علوم دینیہ اسلامیہ کی تکمیل کے علاوہ ہماری غرض اعظم یہ ہے کہ طلبہ میں ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہنی قوت پیدا او بیدار ہو، جس کے ذریعہ سے وہ قدیم علمائے اسلام کے ہم قدم شمار ہوں، ان کا نمونہ اور مثنی بن سکیں۔ حضرت مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> **”ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے، فقط علوم دینی پر اکتفاء نہیں؛ بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے، جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم، بڑی**

بڑی استعداد و قوت کے اہل اسلام میں بہ کثرت پیدا ہوئے۔''

حضرت نانوتویؒ کا یہ ارشاد برصغیر ہند میں سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد قائم تمام مدرسوں اور دینی تعلیمی اداروں کے لئے ایک اصول اور نظریہ ساز دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اور ان تمام مدارس کے مقاصد کا ایک اہم ترجمان بھی ہے، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگرچہ ان مدارس کی وجہ تاسیس اور ان کا اصل بنیادی مقصد، علوم دینیہ اسلامیہ شرعیہ کی حفاظت و بقاء کی جد و جہد اور ان کی تعلیم و اشاعت کی فکر کرنا ہے، ان مدارس کے قائم کرتے وقت اسی کو اصل اصول بنایا گیا تھا، مگر معقولات میں منطق و فلسفہ کے علاوہ، وہ تمام عقلی فکری موضوعات علوم و مباحث بھی - جن سے نظام عالم جڑا ہوا ہے - ان مدارس کے مقاصد اور نصاب تعلیم سے خارج نہیں ہیں، ان مدرسوں کے فارغین دین و شریعت میں اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ ضروری عقلی علوم سے بھی آشنا ہوں گے، تو ان کا دائرہ فکر و عمل بہت وسیع ہو جائے گا، اور ان کی رہنمائی اور جد و جہد کے اثرات و ثمرات زیادہ عمیق اور ایسے دوررس نتائج پیدا کرنے والے ہوں گے جس طرح قدیم زمانہ کے منتخب روزگار علماء اور ماہرین کے ہوتے تھے۔ حضرت مولاناؒ کی رائے میں معقولات کا دائرہ کس درجہ وسیع تھا، اس کی اسی تقریر کے ایک اور اہم فقرہ سے وضاحت ہو رہی ہے، فرماتے ہیں:

''معقولات سے صرف منطق و فلسفہ مقصود نہیں؛ بلکہ اس میں ہیئت، حساب، فلکیات، ریاضی اور الٰہیات بھی شامل ہیں۔''

(روداد: سنہ ۱۲۹۰، ص: ۱۵، مطبوعہ حرم ۱۲۹۱ھ)

یعنی حضرت نانوتویؒ کے پیش نظر جو وسیع تعلیمی مقاصد اور مستقبل کے لئے دیرپا اور ہمہ جہت نظام تعلیم تھا، اس میں معقولات کے لئے صرف منطق و فلسفہ کی تحدید و نشاندہی نہیں تھی؛

بلکہ معقولات کو اس کے وسیع اور صحیح معنوں میں لیا گیا تھا، جس میں تمام اہم موضوعات کی تعلیم وتدریس شامل تھی، حضرت مولانا کی صراحت کے مطابق وہ علوم- جو بلاشبہ معقولات کا حصہ ہیں اور ان مدارس میں پڑھائے جانے چاہئیں- یہ تھے:

حساب ———————— MATHEMATICS

ریاضی ———————— ARITHMETICS

ہیئت ———————— ASTRONOMY

فلکیات ———————— COSMOLOGY

یہاں یہ بات خاص توجہ چاہتی ہے کہ حضرت مولانا مدارس کے لئے منتخبہ، پسندیدہ عقلی علوم ومباحث میں:

الٰہیات [مابعدالبعیات] METAPHYSICS کو بھی شامل فرمارہے ہیں۔

اگرچہ حضرت مولانا کی اس تقریر میں تذکرہ نہیں؛ لیکن دارالعلوم ومظاہرعلوم دونوں کی حضرت مولانا نانوتوی کی حیات میں شائع رودادوں سے صاف معلوم ہورہاہے کہ ان دونوں مدرسوں میں درج بالا علوم ومضامین کے علاوہ:

الجبرا (یاجبر ومقابلہ) ———————— ALGBRA

مساحت ———— MENSURATION(GEOMETRY)

اقلیدس ———————— EUCALEIDES

بھی پڑھائے جاتے تھے اور شامل نصاب تھے، یہی نہیں بلکہ طلبہ میں مزید لیاقت و قابلیت کے لئے دو اور موضوعات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بھی نظام بنایا گیا تھا: طب ومعالجات اور فن تعمیر ونقشہ سازی (CIVIL AND ARCHITECT ENGG)۔

جب علامہ رشید رضا مصری اواخر الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ [۱۵/اپریل سنہ ۱۹۱۲ء] میں دارالعلوم دیو بند آئے تھے، اس وقت ذمہ داروں نے علامہ کو کہا تھا کہ دارالعلوم میں جدید فلسفہ کی ابتدائی کتاب ''النقش کالحجر'' بھی نصاب میں شامل ہے، علامہ رضا نے اس کتاب کے شامل نصاب کئے جانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا، مگر اس موضوع پر اور کتابوں کے لانے کی بھی رائے دی تھی، جو اس سے زیادہ مفید ہوں۔ علامہ کی تقریر کے مذکورہ فقرہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''ایک جماعت ہم میں ایسی بھی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے، جو اسلام پر کئے جاتے ہیں، خصوصاً وہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم وفنون کی بنا پر کئے جاتے ہیں، مگر ایسے شبہات کا رفع کرنا، بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔
>
> مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس سلسلہ کو شروع کیا ہے اور جدید فلسفہ کی ایک ابتدائی کتاب ''النقش کالحجر'' کو درس میں داخل کیا ہے، میرے نزدیک یہ کتاب ناکافی ہے، میں آپ کو ایسی کتابیں بتلاؤں گا جو اس سے زیادہ مفید ہوں گی۔ (روداد: سنہ ۱۳۳۰ھ، ص: ۳۵-۵۰)

علامہ رشید رضا کی تقریر میں **النقش کالحجر** کے تذکرہ اور اس تقریر کی دارالعلوم کی روداد اشاعت کے بعد اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب **النقش کالحجر** دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھی، مگر روداد سے اس کا تعارف نہیں ملتا، اس کے لئے اس کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

النقش کالحجر علوم طبیعیہ کے تعارف اور ابتدائی اصول پر مشتمل ایک درسی کتاب

ہے جو چھوٹے چھوٹے آٹھ حصوں پر مشتمل ہے، ان کے مندرجات ومضامین کی ترتیب یہ ہے:

حصہ اول: **مبادی عامہ فی الطبعیات** [طبعیات کے ابتدائی اصول]

حصہ ثانی: **الکیمیاء** [کیمسٹری] CHEMISTRY

حصہ ثالث: **الطبعیات** [طبعیات] PHYSICS

حصہ رابع: **الجغرافیة الطبعیة** [جغرافیہ طبعی] PHYSICAL GEOGRAPHY

حصہ خامس: **الجیولیجیا** [علم طبقات ارض] GEOLOGY

حصہ سادس: **الھیئة** [ہیئت] ASTRONOMY

حصہ سابع: **علم النباتات** [نباتات] BOTANY

حصہ ثامن: **اصول المنطق** [اصول منطق] PRINCIPLES OF LOGIC

یہ کتاب مشہور امریکہ نژاد مستشرق کرنیلوس فنڈ یک(CORNELIUS YANDYCE پیدائش ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء۔ انتقال ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء) کی تالیف ہے، جو عرب ممالک خصوصاً شام اورلبنان وغیرہ میں مغربی اقداراورعیسائیت کی اشاعت کا رکن رکین، بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بانیوں میں سے ایک، امریکن مشنریز کا عرب دنیا میں سب سے بڑا نمائندہ، متعصب پادری اور بائبل کا عربی مترجم بھی تھا، فنڈ یک کی ایک اور مشہور کتاب جو ہمارے مدارس کے نصاب میں شامل رہی اور غالباً اب بھی مولوی فاضل وغیرہ کے نصاب میں ہے، محیط الدائرہ ہے، جو عروض وقوافی کے موضوع پر ہے۔

(اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع: ص: ۴۰۱-۴۰۳، الاعلام لزرکلی: ص: ۲۲۳، ج: ۵)

علامہ رشید رضا نے اپنی تقریر میں **النقش کالحجر** کے تذکرہ کے علاوہ اس اہم پہلو پر بھی توجہ دلائی تھی کہ ایسے شبہات کے اعتراضات کے جوابات کے لئے جو ان علوم و

فنون کی بناء پر کئے جاتے ہیں جو مغرب سے آرہے ہیں، فلسفۂ جدید سے واقفیت نہایت ضروری ہے، علامہ رشید رضا کا یہ مشورہ- جو وقت کی ایک اہم ضرورت کے احساس اور گہرے وسیع مطالعہ وتجربہ پر مبنی تھا- دیوبند کے لئے نیا نہیں تھا، یہ حضرات اس ضرورت سے اس سے بہت پہلے سے واقف تھے اور اس کے لئے ایک حد تک مناسب تدبیریں بھی فرمارہے تھے۔

دین وشریعت اور عقائد واحکام اسلامیہ پر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے تھے، شام کے ایک بڑے عالم اور فلسفۂ اسلام ومغرب کے فاضل شیخ حسین مصطفیٰ جسر نے ان اعتراضات کے مغرب کے نظریات وفلسفہ کی روشنی میں نہایت عمدہ اسلوب میں فاضلانہ جوابات لکھے، جس میں اسلامی احکامات کی افادیت وحکمت اور معنویت کو اس طرح واضح کیا کہ عالم اسلام میں اس کتاب کی دھوم مچ گئی۔ یہ کتاب حمیدیہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس کا پورا نام ''**الرسالة الحميدية في حقيقة الديانة الاسلامية وحقية الشرع المحمدية**'' ہے۔ یہ کتاب ہندوستان بھی پہونچی، یہاں ہر طبقہ کے بڑے علماء اور اہل نظر نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور یہ کتاب مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم کے اعلیٰ نصاب میں شامل کی گئی۔

اس کتاب کے عمدہ اسلوب تحریر اور نافعیت کی وجہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے ایک ممتاز شاگرد، اور جید عالم مولانا محمد اسحاق بردوانی کانپوری سے اس کا اردو ترجمہ کرایا تھا، جو اسلام اور سائنس کے نام سے حضرت مولانا تھانویؒ کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا تھا اور اپنے موضوع پر حد درجہ مفید کتابوں میں شمار کیا گیا، حضرت مولانا تھانویؒ نے اس ترجمہ کو حرفاً حرفاً دیکھا اور درست کیا تھا اور اس پر تقریظ لکھی تھی، جس میں تحریر ہے کہ:

''مدت سے یوں دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسی کتاب جمع کی جاوے جس سے

ان خیالات کی اصلاح ہو، جو بوجہ ناواقفیت علوم دینیہ کے بعض نوجوانوں کو تعلیم فلسفۂ جدیدہ سے اسلامی فروعی و اصول میں پیدا ہو گئے، اسی اثناء میں ایک کتاب حمیدیہ نام نظر سے گذری، جو اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی و وافی ثابت ہوئی۔''

اس تحریر کے آخر میں فرماتے ہیں:

''اب خدا تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ یہ ترجمہ چھپ جاوے اور ہر طالب علم عربی وانگریزی مدارس کا اس سے منتفع ہو اور ان سب کے لئے یہ سرمایہ ہدایت و اہتدا ہو۔آمین۔''

درج بالا معروضات وتفصیلات سے واضح ہے کہ قدیم مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم اور مظاہر میں ان کے آغاز کے وقت سے قدیم صالح کے ساتھ جدید نافع کا امتزاج تقریباً پچاس سال تک نہ صرف جاری رہا؛ بلکہ ہر دور میں اس میں نئے اور مفید اضافے بھی ہوتے رہے، یہ روایت تقریباً سنہ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء سے کمزور ہونی شروع ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد نصاب میں تبدیلی:

ممکن تھا کہ جدید علوم سے استفادہ اور ان کے دائرۂ علم کی مدارس میں شمولیت کا عمل اور آگے بڑھتا اور اس میں کچھ نئے موضوعات و مضامین شامل ہوتے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۷- ۱۹۱۴) شروع ہوگئی، جس میں خلافت اسلامیہ ترکی، جرمنی کے علاوہ خصوصاً تمام مغربی ملکوں کی یلغار کا نشانہ رہی، اس جنگ میں اور اس کے بعد سے مغربی ملکوں کا خلافت ترکی کے خلاف خصوصاً تمام عالم اسلام اور مسلم ملکوں کے خلاف عموماً جو سازشی نہایت تکلیف دینے والا، خونخوار چہرہ سامنے آیا اور جس طرح ان ملکوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی خیریت،

حرمت و آبرو پامال ہوئی، اس سے پوری مسلم دنیا میں ایک آگ لگ گئی تھی، برصغیر ہند کے مسلمان بھی- جو عالم اسلام کے نظام کا ایک بڑا حصہ ہیں- اس سے بے حد متأثر ہوئے اور یہاں بھی انگریزی استعمار اور یورپ کے تمام ملکوں کے ظلم وستم اور سیاسی جنگی منصوبوں کے خلاف بلند اور طاقتور آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں، جنہوں نے جلد ہی ملک گیر تحریکات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تحریک خلافت، ریشمی رومال تحریک، تحریک ہجرت، تحریک خدام کعبہ وغیرہ متعدد تنظیموں اور تحریکات نے پورے ملک میں ہل چل مچادی تھی۔

اس وقت انگریز کے خلاف عدم تعاون (None Co Opration) کے علاوہ اور بھی کئی پہلوؤں سے اظہار ملامت ونفرت کیا گیا تھا، جس میں ایک ناپسندیدہ عنصر یہ بھی شامل ہوگیا کہ نفرت صرف انگریز کے سیاسی نظام اور استعمار کی قوتوں کے خلاف نہ رہ کر ان سب چیزوں اور مباحث وموضوعات وایجادات ومستعملات کے خلاف ہوگئی تھی، جس کا مغرب خصوصاً برطانیہ کے تعلیمی اداروں اور علوم وفنون اور کارخانوں سے کسی طرح کا کچھ تعلق تھا یا جس کی وہاں تعلیم، تحقیق اور تشکیل ہورہی تھی، اس کے اثر سے ہمارا ایک طبقہ متأثر ہوا، جس سے اور نقصانات کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ایسے موضوعات کو جو کالجوں، یونیورسیٹیوں میں پڑھائے جاتے تھے، انگریز دشمنی میں ایک ایک کر کے دینی نظام تعلیم یا مدارس سے خارج کرنے کی جد وجہد شروع ہوئی، اور بالآخر وہ وقت آیا کہ ان سب ہی کی تعلیم فضول اور ناپسندیدہ قرار پائی، یوں ہم ان تمام علوم وفنون مباحث وموضوعات سے محروم ہو گئے جن کو موجودہ بلند مقام تک پہنچانے میں امت کے بے شمار اعلیٰ دماغ اور بارہ سوسال کی محنت صرف ہوئی تھی؛ حالانکہ ان علوم کا اور مغربی سیاسی نظام کا باہمی کوئی رشتہ نہیں تھا، یہ تو ایک تحقیق، ایک تجربہ اور جد جہد ہے جو اس میں لگے گا، وہ دنیاوی سیاسی ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔

یہ بھی ایک بڑا المیہ ہے کہ اب وہ تمام علوم وفنون جن کو ہم نے اپنے دینی ملی ورثہ سے خارج کر کے مغرب کے سرمایۂ علم کا حصہ سمجھ لیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے عہد تک نہ صرف عالم اسلام بلکہ برصغیر ہند میں بھی ہمارے اکثر مدارس کے نصابات اور تعلیمی نظام کا ایک حصہ تھے، علمائے کرام انفرادی واجتماعی طور پر ان کا درس دیتے اور اپنے طلبہ کو ان میں ایسا ماہر ومشاق بنا دیتے تھے کہ کئی مرتبہ مغربی ماہرین کو بھی ان کی لیاقت وصلاحیت پر رشک آتا تھا اور وہ ان کو اپنے طرۂ کمال میں ٹانکنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

(مقالہ مولانا نورالحسن راشد صاحب بحوالہ ماہنامہ الفرقان جولائی ۲۰۰۷)

درس نظامیہ کی خصوصیت:

ڈاکٹر مولانا محمود احمد غازی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ملا نظام الدین نے برصغیر کی روایات کے مطابق سارے تعلیمی ورثے کو سامنے رکھ کر ایک نصاب تیار کیا، جس کی کئی ایک خصوصیات نمایاں تھیں:

بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ تین بنیادی علوم فقہ، اصول فقہ اور منطق پر مشتمل تھا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جتنے علوم اس زمانے میں مسلم ہندوستان میں مروج تھے، وہ اس میں شامل تھے، کوشش یہ تھی کہ اس نصاب کا فارغ کسی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ ہو، چاہے وہ سائنس ہو، طب ہو، انجینئرنگ ہو، جو بھی اس زمانے کی سائنس اور انجینئرنگ تھی، وہ اس میں شامل تھی، اقلیدس، الجبرا، جومیٹری اور ریاضی کے مضامین اس زمانے میں بھی نصاب میں شامل تھے، آزاد معاش کا طریقہ اختیار کرنے میں مدد دینے کے لیے طب شاملِ نصاب تھی، یہی وجہ تھی کہ اس درس کے پڑھے ہوئے بے شمار لوگ طبیب، مہندس، منتظم اور معمار ہوئے۔ (درس نظامی سے پہلے جو شکل نظام تعلیم کی تھی، اسے ہم درس

نظامی کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں) چنانچہ وہ ماہر مہندس جس نے تاج محل تعمیر کیا، یعنی استاد احمد معمار، وہ اسی درس کا پڑھا ہوا تھا، معماری کا یہ فن اس نے مدرسے ہی میں بیٹھ کر سیکھا تھا، یہ درس اس زمانے میں ایک اپ ٹو ڈیٹ معاشرے کو چلانے کے لیے ہر لحاظ سے مکمل تھا، معاشرے کی ضرورت کے مطابق تمام علوم وفنون اس میں شامل تھے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصاب نہایت ٹھوس اور مشکل تھا اور فارغ ہونے والے کے لیے ہر فن کی اعلی سے اعلی کتاب سے گزرنا ضروری تھا، یہ اس لیے کیا جاتا تھا کہ کوئی کتاب آگے چل کر اس کے لیے مشکل نہ رہے، بعض لوگ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور مشکل کتابوں کو ختم کر کے آسان کتابیں شامل کرانا چاہتے ہیں، لیکن میں ذاتی طور پر اس کو درست نہیں سمجھتا، اس مشکل پسندی میں آج بھی بڑی معنویت ہے، اگر طالب علم کو مشکل کتابوں کا یہ پہاڑ عبور کرالیا جائے تو اس کا مطالعہ اتنا ٹھوس ہوجاتا ہے اور ذہن میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اسے پھر آج کل کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں اور درس گاہوں کا نصاب اور علوم بڑے آسان معلوم ہوتے ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ اتنی اعلی سطح پر جو مباحث پڑھائے جاتے ہیں، ان میں علمی اعتبار سے اس کے لیے کوئی مشکل اور ناقابل فہم چیز نہیں ہے، بہ شرطے کہ طالب علم اس وسیع ذخیرے سے اچھی طرح واقف ہو، اس لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو باقی رکھا جائے۔

درس نظامی کی کتابوں کی بالخصوص اور علوم اسلامیہ کی بیش تر کتابوں کی بالعموم ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا آپس میں نہایت گہرا اور مضبوط ربط ہے، اسلامی علوم وفنون دوسری اقوام کے علوم وفنون کی طرح ماضی سے لاتعلق بہ الفاظ دیگر یتیم نہیں ہیں، ان کا اپنے ماضی سے بہت گہرا تعلق ہے اور ماضی سے تعلق کا یہ سلسلہ کہیں بھی منقطع نہیں ہوتا، ان سب علوم اور کتابوں میں ایک غیر منقطع فکری وحدت اور فکری تسلسل پایا جاتا ہے، اس کے برعکس

مغربی علوم میں یہ خوبی نہیں ہے، مثلاً انگریزی قانون کے کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھی جائے اور وہ مقبول ہو جائے تو اچھی کتاب ہے، اس سے بحث نہیں کہ اس سے پہلے کس نے کیا کہا، مسلمانوں میں یہ بات نہیں ہے۔

فقہ اور فلسفے کی کتابیں مشکل تو ہیں، لیکن ضروری ہیں، کیوں کہ ایک دوسرے پر ان کا دارو مدار ہے، ذاتی طور پر میں ہرگز اس کا قائل نہیں ہوں کہ درس نظامی کی مشکل کتب کی جگہ آسان کتابیں رکھی جائیں۔

البتہ اپنے گزشتہ تیس سالہ درس وتدریس کے تجربے کی روشنی میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ عربی زبان اور صرف ونحو سے تعلق رکھنے والی کتابوں میں آسانی اور جدت کی ضرورت ہے۔

درس نظامی میں نئے علوم وفنون کا اضافہ:

ایک اور اہم پہلو درس نظامی میں بعض نئے علوم وفنون اور مضامین شامل کرنے کا ہے، آج ان علوم وفنون کی دین کی نشر واشاعت کے لیے ایسے ہی ضرورت ہے جیسے کبھی یونانی علوم وفنون کی ضرورت تھی۔

کفار، بت پرستوں اور یونانیوں کے علوم وفنون کو مسلمانوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا کہ وہ علوم جو اسلام پر حملے کے دوران اسلحے کے طور پر استعمال ہو رہے تھے، ان کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا جانے لگا، پھر ایک ہزار سال تک منطق کے اسلوب واستدلال سے کام لے کر اسلامی عقائد وتعلیمات کو پیش کیا گیا، منطق کے بارے میں مسلمانوں میں محدثین ومفسرین کے نقطہ نظر کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، جن کا منطق کے خلاف اتنا شدید ردعمل تھا کہ بعض نے کہا کہ منطق کی تعلیم ہی سرے سے حرام ہے، حتی کہ منطق کی کتابوں سے نجاست دور کرنا بھی جائز ہے، بعد میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ امام غزالیؒ اور

امام رازیؒ کی ''المستصفی'' اور ''المحصول'' جیسی مذہبی کتابیں منطقی اسلوب پر لکھی گئیں۔

یہی چیز آج ہمیں درپیش ہے اور وہی تین نقطہ ہائے نظر اور رویے آج ہمارے سامنے ہیں، انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی علوم ہمارے ہاں آئے تو ایک رویہ قدیم طرز کے علماء کا قدیم محدثین ومفسرین کی طرح یہ سامنے آیا کہ یہ سب کچھ ناجائز اور ناپاک ہے، اس کو چھیڑنے اور چھونے کی ضرورت نہیں، دوسرا رویہ ان لوگوں کا تھا، جو کلی طور پر ان علوم کے رنگ میں رنگ گئے، ایک درمیانہ نظریہ- جو اعتدال اور توازن پر مبنی تھا- یہ تھا کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں، ان کا مطالعہ کریں اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں، جو چیز غلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے یہ ثابت کریں کہ یہ غلط ہے، جیسا کہ امام رازی، امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے دور میں تردید کر کے یہ ثابت کیا کہ منطق وفلسفے کی فلاں فلاں چیزیں، اصول اور عقائد غلط ہیں اور یہ بات انہوں نے منطق ہی کے دلائل سے غلط ثابت کی، جو چیزیں درست تھیں، انہیں اسلامی علوم کی خدمت کے لیے برتا اور استعمال کیا، یہی کام آج مغربی علوم وفنون کے بارے میں کرنا چاہیے، ان علوم میں جو عناصر ہمارے نقطہ ہائے نظر سے غلط ہیں، ان کی تردید ان ہی کے دلائل سے کریں، اہل علم اور علمائے کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں، ان کے پانچ علوم ایسے ہیں جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں اور جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے وہ اکثر وبیشتر ان ہی پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:

(۱) علم نفسیات

(۲) علم بشریات

(۳) علم عمرانیات

(۴) علم سیاسیات

(۵) علم معاشیات

علمائے کرام کو ان پانچ علوم وفنون کا مطالعہ کر کے ان میں موجود غلط اساسات و تصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل وشواہد کے ساتھ کرنی چاہیے، جو چیزیں درست ہیں، ان سے ہم کو پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے مہارت حاصل کرنی چاہیے، ہمیں چاہیے کہ ان علوم وفنون کے رائج الوقت اسلوب اور طرز استدلال سے کام لے کر ہم اپنے عقائد وتصورات کو آج کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ جدید دنیا کے لیے زیادہ قابل فہم ہوں، کیوں کہ ایک عقلی سانچہ پہلے سے ان کے ذہن میں موجود ہے، جس کی بنیاد پر وہ معاملات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اس طرح ان میں عدل وانصاف رکھنے والے لوگ ان سے متاثر ہوں گے اور پھر فکری اخذ وعطا کا عمل شروع ہوجائے گا، جو منطق علوم اور یونانی ذخیرے کے ساتھ مسلمانوں نے اختیار کیا، شروع میں بہت سے مسلمان ان سے متاثر ہوئے، جس طرح آج ہو رہے ہیں، آج ان کی کتابیں موجود ہیں، آپ اخوان الصفا کی کتابیں دیکھیے، ان میں بڑی مرعوبیت ملتی ہے، ابن رشد بڑے فقیہ تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی یونانی علوم سے مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے، اس طرح کندی جو فیلسوف العرب اور حکیم العرب کہلاتے ہیں، ان کے ہاں مرعوبیت کے خاصے جراثیم ملتے ہیں، جس طرح مرعوبیت کے جراثیم ہمارے ہاں مغربی علوم وفنون کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہ عارضی اور وقتی چیز تھی، بالآخر معتدل نقطہ ہائے نظر رکھنے والے علمائے کرام کی کاوشیں رنگ لائیں اور دیگر دونوں طبقوں (مخالفین اور موید ین) کا زور گھٹتا چلا گیا۔

(محاضرات تعلیم: ۲۶۰)

معاصر دینی تعلیم، مشکلات واحوال، تقاضے اور دشواریاں:

حضرت مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب کی مشہور کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' ہمارے دینی مدارس کے نصاب کی عہد بہ عہد ترقیوں، تبدیلیوں، خوبیوں اور خرابیوں سب کی بہترین داستان ہے، ہمارے ''درس نظامی'' پر ایرانی ثقافت کا کتنا گہرا اثر رہا ہے؛ اس کا اندازہ اس کتاب سے لگایا جاتا ہے۔

میر باقر داماد کی لغو ولا یعنی کتاب ''الأفق المبین'' نے کتنے دنوں تک لوگوں کے ذہنوں کو اپنا اسیر رکھا، صدرالدین شیرازی کی ''اسفار اربعہ'' اور پھر ''صدرا'' اور ملا محمود کی ''شمس بازغہ'' وغیرہ کیوں لکھی گئیں اور طبقہ علماء کے نصاب کا جز کس طرح بنیں؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے اور اس پس منظر کو رکھے بغیر نصاب کی بہت سی کتابوں کے بارے میں ہمارا ذہن ودماغ صاف نہیں ہوسکتا، اور نہ اس طرح کی کتابوں سے جذباتی وابستگی ختم ہوسکتی ہے۔

قدیم وجدید دونوں نصابوں میں کمی:

تجربات کی روشنی میں قدیم نصاب تعلیم اور جدید نصاب تعلیم کے علمبردار دونوں ہی فریق کے دلائل وزنی ہیں؛ لیکن ہماری رائے میں دونوں ہی طرز کے نصاب پر اکتفا کرنے والوں میں نقص کے کچھ پہلو ایسے رہ جاتے ہیں کہ نہ تو قدیم نصابِ تعلیم ہی کافی قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ مروجہ تبدیل شدہ نصاب سے ہی دینی ''عالم گری'' کی صنعت کو فروغ ملتا ہے؛ بلکہ ''کچھ اور'' کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور یہی ''کچھ اور'' وہ ہے جس کی تلافی یا جس کے حصول کا وسیلہ ہماری بحث وگفتگو کا عنوان اور اس کا حاصل ہونا چاہئے۔

جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا یعقوب

نانوتویؒ کو دارالعلوم دیوبند کی ’’پیداوار‘‘ نہیں کہا جاسکتا بلکہ ’’دارالعلوم دیوبند‘‘ ان کی پیداوار ہے اور خود ان کی اپنی تعلیم تو دہلی کالج کے مولانا مملوک علی صاحبؒ اور دیگر اعیان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے اور پھر قدرت کی طرف سے خصوصی فیض اور عطیہ کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ نہ تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ’’پیداوار‘‘ ہیں اور نہ ندوۃ العلماء کے نصاب کو پڑھ کر ان کو علم وفضل کا وہ مقام ملا جس پر وہ فائز تھے، علامہ شبلیؒ کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ وغیرہ تھے، اور سید صاحب کی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دیگر روایتی مدرسوں میں ہوئی تھی اور مولانا محمد علی مونگیریؒ تو خود ندوہ کے بانی ہیں، ’’ندوہ‘‘ ان کا بانی نہیں ہے۔

اس لئے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ دینی وادبی علوم وفنون کی مہارت نہ تو محض اس مدرسہ کی دین ہے اور نہ اس مدرسہ کی۔ ’’درس نظامی‘‘ کی ترتیب سے پہلے بھی ائمۂ دین پیدا ہوتے رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بغیر بھی محدث، مفسر، فقیہ اور ادیب ومصنف سبھی کچھ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

دراصل شخصیت سازی یا علماء گری میں نصاب تعلیم ہی بنیادی عامل نہیں ہے؛ بلکہ بہت سے دیگر عوامل میں سے ایک عامل یہ بھی ہے، اس لئے موجودہ علمی انحطاط کو نصاب تعلیم سے جوڑنا صحیح نہیں ہے، آج بھی محض درس نظامی پڑھنے والوں میں اچھی صلاحیت کے لوگ پیدا ہورہے ہیں اور درس نظامی کو چھوڑ کر دوسرے نصاب تعلیم کو اپنانے والوں میں بھی باصلاحیت لوگوں کی کمی نہیں ہے، البتہ اگر تناسب دیکھا جائے تو دونوں ہی سلسلوں میں زبردست انحطاط پایا جاتا ہے، جس کی بڑی وجہ آئیڈیل شخصیتوں کی کمی اور ائمہ علم وفن کا فقدان ہے، نمایاں شخصیتیں نہ نصاب سے بنتی ہیں اور نہ تدریس وتعلیم کے نظام سے، شخصیتوں کی تعمیر میں سب

سے زیادہ مؤثر عنصر آئیڈیل شخصیتوں کا وجود ہے، چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے گرد سارے عقلائے روزگار جمع ہو گئے تھے اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں میں ہر ایک شخص دائرۂ علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ علامہ محمد یوسف بنوریؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، مولانا سعید احمدؒ اکبر آبادی، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سبھی حضرات شاہ صاحبؒ کی مثالی شخصیت اور نادرۂ روزگار وجود کو دیکھ کر عظیم شخصیتیں بنی تھیں۔

اسی طرح علامہ شبلی نعمانیؒ کے گرد جس طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، مسعود عالم ندویؒ وغیرہ جیسے قلمکار جمع ہو گئے تھے، وہ شبلی صاحبؒ ہی کا اثر تھا، اس طرح کے نمونے ہمیشہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے گاؤں میں بیٹھ کر بڑے بڑے محدثین پیدا کئے، جو محض ان کی شخصیت کا فیض تھا؛ نہ مدرسہ کا، نہ نصاب تعلیم کا۔

اس کے باوجود نصاب ونظام تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جہاں تک معاملہ ''معاصر دینی تعلیم'' اور عصر حاضر کے تقاضوں کا ہے تو بلا شبہ اس وقت ہمارے ادارے جس طرح چل رہے ہیں ان میں نہ تو وقت کے تقاضوں کا پورا ادراک ہے اور نہ واقعی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے اسباب؛ اس لئے ان کارخانوں سے جو خام مال تیار ہو رہا ہے اس سے مارکیٹ کی ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی ہے اور ''خدمت دین'' کا نعرہ لگانے والوں کی کثرت کے باوجود خدمت دین کے بیشتر محاذ خالی نظر آ رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء مغربی علوم یا یوروپی ثقافت وتہذیب اور زبان ولٹریچر کو پڑھنے

پڑھانے سے متوحش ہیں، سوال یہ ہے کہ ''یونان'' کہاں ہے؟ اور کیا یونانی علوم اس زمانہ کے ''مغربی علوم'' کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر یونانی منطق وفلسفہ کی اتنی محبت اور ان کی حمایت پر اتنا زور اور موجودہ مغربی علوم کے مفید عنصر سے اتنی نفرت کیوں؟

مسئلہ اس وقت صرف منطق وفلسفہ کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے یا ان کو اپنے نصاب کے جز کے طور پر باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس خواہ ''درس نظامی'' کے سلسلہ کے ہوں یا تبدیل شدہ نصاب کو رائج کرنے والے؛ کیا ان سے ہماری دینی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور ''دعوت دین'' یا ''دفاع عن الدین'' کی عوامی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے نیز ''تفقہ فی الدین'' رکھنے والے اس ''طائفہ'' کو تیار کرنے میں ہمارے یہ دینی قلعے کامیاب ہیں، جو عصر حاضر میں پیدا ہونے والے نئے اور پیچیدہ مسائل کا فقہی حل پیش کر سکیں؟

ہماری نظر میں - دعوت دین علی وجہ البصیرۃ

- دفاع عن الدین عن کفاءۃ واقتدار

- اور '' تفقہ فی الدین'' رکھنے والے گروہ کی تیاری میں ہمارے دینی مدارس کی کامیابی مبصرین کی نظر میں مشکوک ہوتی جا رہی ہے، اور رب کائنات کی طرف سے ''ذہانت وقوت حفظ'' کی عطا میں کمی نہ ہونے کے باوجود ''ائمہ دین'' یا فقہ وحدیث وتفسیر کے ماہرین کا پیدا ہونا ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ضرور ہو گیا ہے۔

اگر ''طرز کہن'' پر ہی اڑنا ہے تب بھی مولانا ظفر احمد عثمانی ؒ کی مرتب کردہ اور شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ ''قواعد فی علوم الحدیث'' یا اس طرح کی کوئی اور کتاب پڑھانا بیحد ضروری ہے۔ فنی اصطلاحات سے اجمالی طور پر روشناس کرنے کے

لئے شیخ محمود الطحان کی ''تیسیر مصطلح الحدیث'' بھی اچھی ہے۔

اسی طرح اصول تفسیر میں بھی محض شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فارسی کتاب کا عربی ترجمہ پڑھا دینے سے علم تفسیر کی مبادیات کا بھی پورے طور پر علم نہیں ہو پاتا، اور نہ پڑھنے والوں کے ذہن و دماغ میں تفسیر و تاویل کا فرق، وحی کی شکلیں، قرآن کے اعجاز کی وجوہ، نزول قرآن کی ترتیب، معتمد و غیر معتمد اور ماثور و غیر ماثور تفسیر کے بارے میں بنیادی معلومات آپاتی ہیں؛ اس لئے ضرورت ہے کہ عرب یونیورسیٹیوں کی طرح شیخ مناع القطان کی ''مباحث فی علوم القرآن'' یا صبحی الصالح کی ''مباحث فی علوم القرآن'' یا عبدالعظیم الزرقانی کی ''مناهل العرفان'' کی تلخیص وغیرہ نصاب کا جز ہوں، تاکہ علم تفسیر میں اختصاص رکھنے والے کی دلچسپی محض جلالین کی شروحات اور بیضاوی کے حواشی تک محدود نہ رہے۔

اس وقت جتنے نصاب رائج ہیں؛ سبھی میں کمی بیشی یا کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہے، نہ ''درس نظامی'' ہی قرآنی منصوصات میں سے ہے اور نہ ''تبدیل شدہ'' نصاب کے نتائج ہی فقہ و حدیث و تفسیر کے ماہرین پیدا کرنے میں سو فیصد کامیاب کہے جاسکتے ہیں، دونوں کے بیچ کی راہ نکالی جاسکتی ہے اور عرب یونیورسیٹیوں میں قائم کلیۃ الشریعہ کے طرز تعلیم سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، جہاں کتاب نہیں ''مواد'' کی تعلیم ہوتی ہے۔

''مواد'' کی تعلیم کے لئے اس طرح کے اساتذہ پہلے تیار کرنے ہوں گے، متن اور اس کے حواشی پر اکتفا کے بجائے پورے موضوع پر دستیاب مصادر سے فائدہ اٹھانے اور ان کی بنیاد پر ''محاضرات'' کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا۔

اس نظام کی خرابی یہ ہے کہ اس میں ''فقہ'' کے پورے ذخیرے سے آشنائی نہیں ہو پاتی، اور ہدایہ، مسلم الثبوت اور اس طرح کی کتابوں سے استفادہ کی یونیورسٹی کے طلبہ میں

صلاحیت بھی نہیں پیدا ہو پاتی، جتنے ''مواد'' تین چار سالوں میں پڑھ لئے ان پر تو خوب ذہن حاوی ہو جاتا ہے؛ لیکن ''غیر مظان'' سے مسائل تلاش کرنے کے لئے پھر پرانے طرز کے علماء کی ہی ضرورت پیش آتی ہے۔ (معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال: ۵۲-۶۴)

مولانا نانوتوی اور مولانا مونگیری کا مقصد تاسیس مدارس:

مولانا سید سلمان صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں:

علامہ شبلی ہوں یا مولانا محمد علی مونگیری یا مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان کے سامنے جو مقاصد تھے اور وہ جس نظام کے داعی تھے آج ہمارے مدارس اس سے بہت زیادہ دور جا چکے ہیں، انہوں نے جس نظام کو جاری کیا وہ وحی الٰہی نہ تھا، اپنے عہد میں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسی مسلم نسل کی آبیاری کی جائے اور ایسے علماء تیار کئے جائیں جو زمانے کے چیلنج کا جواب دے سکیں اور ملت کو صحیح قیادت فراہم کرسکیں، ان کا فہم دین راسخ ہو، اور ساتھ ہی ساتھ ان میں داعیانہ اسپرٹ ہو، وہ زمانے کے نبض شناس ہوں اور اپنے عوام کے سامنے اسلام کے پرزور ترجمان ہوں، جو ذہن و دماغ کو آسودگی اور اطمینان عطا کرسکیں اور قلب کو راحت و سکون، ان کی ترجمانی دین سے یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ دین (Out of date) ہے، وہ اس دور کی رہنمائی نہیں کرسکتا، بلکہ نئی نسل کو اس ترجمانی سے یہ یقین حاصل ہو کہ دینی نظام ہی دنیا کے لیے راہ فلاح ہے اور اسی سے ہمارے تمام سماجی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

افراط و تفریط:

افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام افراط و تفریط کا شکار ہے، وہ کہیں روایت پرستی میں مبتلا ہے، تو کہیں قلت رسوخ اور سطحیت میں،

بعض مدارس میں قدیم پر بہت زور دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ امور جو عہد بعہد بدلتے رہتے ہیں یعنی زبان، اصطلاحات، فلسفیانہ افکار، علمی نظریات ان کی قدامت پر بھی انہیں اصرار ہے، اوران کی قدامت نے قدامت پرستوں کی نگاہوں میں ان کو ''مقدس'' بنارکھا ہے، خواہ وہ قدیم ملحدوں کے افکار وخیالات پریشاں ہوں یا وثنیت پرستوں کے اور پھر وہ اپنی چھری کانٹے سے لیس ہوکراورافکار پارینہ اورتعبیرات قدیمہ کا سہارا لے کرعوام کوبھی مخاطب کرتے ہیں اورخواص کوبھی، اورجدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ سمجھنے پر مجبور کردیتے ہیں کہ دین کا عقل وعلم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؛ بلکہ دین تومحض بعض اقداراورسماجی روایات کا مظہر ہوتا ہے، صحیح عقائد رکھنےوالے بھی بے سروپا روایات، خرافات اور کشف وکرامات کی حکایات اور قدماء کے خیالات خاص مدرسی زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اسلام کو''کیتھولک'' (Catholic)اور''پروٹیسٹنٹ''(Protestant)دوحلقوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

کشمکش جدید وقدیم:

دوسری طرف ہمارے وہ مدارس ہیں جوجدید جدید کی رٹ اتنی لگاتے ہیں اوران کے طلبہ ایسے جدید بن جاتے ہیں کہ ان کے لئے قدیم اصطلاحات کا سمجھنا ناممکن ہوجاتا ہے، وہ جدید کی فکر میں قدیم صالح سے بھی محروم ہوجاتے ہیں، جدت پسندی کے شوق میں وہ علماء کی وضع قطع بھی ترک کر بیٹھتے ہیں، نتیجۃً وہ جدید علم سے زیادہ ''جدید فیشن'' میں پڑ جاتے ہیں، ان کا علم دینی ان کومولویانہ وضع قطع کی طرف کھینچتا ہے، اوران کا ''شوق جدید'' ان کو''مسٹر'' بنانا چاہتا ہے، پھرنہ مولوی بن پاتے ہیں، نہ مسٹر، وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔

حقائق کا منصفانہ جائزہ:

یہ سب نتائج ہمارے سامنے ہیں، اورافسوسناک شکل اختیار کرتے جارہے ہیں؛ لیکن

اس کے علاج و معالجہ کی جیسی فکر ہونی چاہئے اور مدارس کے ذمہ داروں کو اپنے نظام اور نصاب پر جس قدر غور کرنا چاہئے ، آج اس کا اتنا ہی فقدان نظر آرہا ہے، اور ہر کھٹا دہی بیچنے والا اپنے دہی کو مسلسل میٹھا بتائے چلا جارہا ہے، یہ محض خوش فہمی اور مغالطۂ نفس ہے، جس کی قلعی واقعات کی کسوٹی پر کھلتی جارہی ہے،ضرورت ہے کہ حقائق کا منصفانہ اور بے لاگ جائزہ لیا جائے ، اپنے بانیان مدارس اور واضعین نصاب کے مقاصد پیش نظر رکھے جائیں، اور ان کا اختیار کردہ طریقۂ کار بھی، اور ان دونوں کا موجودہ حالات کی روشنی میں معروضی مطالعہ کیا جائے، نئے تجربات سے پورا فائدہ اٹھایا جائے، اور اس ہدایت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **''الحکمة ضالة المؤمن''** (حکمت و دانشمندی مومن کا گم شدہ مال ہے) کو کسی مرحلہ میں فراموش نہ کیا جائے۔(ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص:۱۱۹-۱۲۱)

اچھا نصاب کیسا ہو؟

ڈاکٹر محمود احمد غازی رقمطراز ہیں:

ایک مثالی نصاب تعلیم وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تعلیم کے مقاصد کا حتمی طور پر تعین کرلیا جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ وہ مقاصد اور اہداف اس نصاب میں مکمل طور پر منعکس ہوتے ہوں، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اکیسویں صدی میں دینی قیادت کے لیے آمادہ حضرات کی غالب اکثریت اکیسویں صدی کے فکری رجحانات سے واقفیت حاصل کرنے کے بجائے آٹھویں نویں صدی کے فلسفیانہ مسائل اور عقلی مباحث کے پڑھنے پڑھانے میں اپنا وقت صرف کرتی ہے،ایک مثالی نصاب تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نصاب کے تحت تعلیم پانے والے طلبہ کو مقاصد تعلیم سے سرشار کردیا جائے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آج دینی مدارس کے فضلاء کی بڑی تعداد جن مقاصد سے سرشار محسوس ہوتی

ہے، وہ عمومی ملی اور اسلامی مقاصد نہیں ہیں، ان میں بیش تر لوگ گروہی اور فرقہ وارانہ مقاصد سے سرشار نظر آتے ہیں، ان کی سرگرمیوں کا بیش تر ہدف اسلام اور اسلامی فکر کا فروغ نہیں ، بلکہ اپنی کسی محترم دینی شخصیت کے انداز فکر کو فروغ دینا اور دوسرے اسالیب فکر پر اس کی برتری جتانا معلوم ہوتا ہے،اس وقت دینی مدارس کے نصاب میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں جن سے مضمون کا ذوق طالب علم میں پیدا ہونے کی بجائے اس کو لفظی پیچید گیوں اور عبارت کی بھول بھلیوں میں گم کردیا جاتا ہے،اس وقت ہزاروں، یا شاید لاکھوں کی تعداد میں ایسے طلبہ موجود ہوں ، جو صرف ونحو کی باریکیوں اور شذوذ پر متاخر شارحین اور حاشیہ نویسوں کی موشگافیوں سے تو خوب واقف ہوں گے،لیکن عام صرفی ونحوی اغلاط سے پاک چند فقرے لکھ لینے کی اہلیت سے عاری ہوں گے۔

ایک اچھا نصاب تعلیم طالب علم کو نہ صرف تحقیق اور جستجو کا خوگر بنا دیتا ہے، بلکہ اس میں نئے آفاق علم کے انکشاف کی امنگ بھی پیدا کردیتا ہے،اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج ہمارا دینی نظام تعلیم بانجھ محسوس ہوتا ہے، تحقیق وجستجو کا ذوق نہ عصری جامعات کے فضلاء میں نظر آتا ہے اور نہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات میں۔

آزاد اور باثر قوموں کا نصاب تعلیم طلبہ میں اپنی تہذیب وتمدن سے گہری وابستگی پیدا کرتا ہے، تہذیب وتمدن سے وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ نصاب کی تدوین تہذیبی ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جائے ،ایک زندہ تہذیب کے تقاضے زندہ انسانوں کے تقاضوں کی طرح ہوتے ہیں، مردہ تہذیب کا مطالعہ ماضی کی تاریخ کے حوالے سے تو کیا جاسکتا ہے،لیکن اس کو روزمرہ زندگی کے وقائع وحوادث سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا، اس وقت ہمارے مذہبی نصاب تعلیم کا بیش تر حصہ ہمارے جدید تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ

نہیں،ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید،علم تفسیر،علم حدیث،علم فقہ اور علم کلام کی تعلیم زندہ علوم کے طور پر دی جائے، ان کو کسی سابقہ دور کے از کار رفتہ مضمون کے طور پر نہ پڑھایا جائے،اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ سلف کی تحقیقات اور امت کے متفقہ عقائد کے بارے میں کوئی مصالحانہ رویہ اپنایا جائے، بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ تمام اسلامی علوم وفنون کو ایک زندہ، مسلسل رواں، ہردم دواں اور ہرآن وسعت پزیر علم کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جائے، اسلامی علوم وفنون کی حیثیت ایک دریائے رواں، بلکہ ایک محیط بے کراں کی ہے، جس کا ہر حصہ اور ہر دور زندگی سے بھرپور اور عصری تقاضوں سے مسلسل ہم آہنگ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر میں کبھی بھی ماضی اور حال کے درمیان خلا پیدا نہیں ہونا چاہیے،اس کا حال ہر وقت ماضی سے اسی طرح وابستہ رہتا ہے،جیسے درخت کی شاخیں اپنے تنے سے اور تنا اپنی جڑ سے وابستہ ہوتا ہے،اس کا حال اس طرح مستقبل کو جنم دیتا رہتا ہے،جیسے ایک ثمر آور اور بارآور درخت کی شاخیں پھل اور پھول پیدا کرتی رہتی ہیں،اسلامی علوم وفنون کے ایسے نصاب کی تیاری ناگزیر ہے جس میں ماضی،حال اور مستقبل کے ایسے ہی رشتوں کی ضمانت دی گئی ہو۔

اکیسویں صدی میں شاید سب سے نمایاں تبدیلی جو تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالے سے پیش آنے والی ہے، بلکہ پیش آرہی ہے،وہ تعلیمی اداروں کے کردار میں بڑھتی ہوئی کمی کا وہ رجحان ہے جو روز بہ روز نمایاں ہوتا چلا جارہا ہے،آنے والا دور رسمی تعلیم سے کہیں زیادہ غیر رسمی تعلیم کا دور ہے، یہ غیر رسمی تعلیم جو ذرائع ابلاغ سے دن رات برس رہی ہے، ہماری نسلوں کو بری طرح متاثر کررہی ہے، یہ غیر رسمی تعلیم ہر قسم کی جغرافیائی،تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی حدود سے آزاد ہے،اس کا کردار روز بہ روز بڑھتا چلا جارہا ہے، مستقبل میں تعلیم کے کردار کا تعین اور اس کے اہداف کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ابلاغ کے اس ہمہ گیر اور کثیر الجہات کردار

سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہے گا، اس کے لیے فوری غور وخوض اور گہری منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، معلومات کے اس سیلاب اور افکار ونظریات کے اس طغیان میں اسلامی عقائد ونظریات کا تحفظ کیوں کر کیا جائے اور لا اخلاقیت کے اس سمندر میں گھر جانے والے اخلاقی جزیروں کو پہنائیاں کیسے عطا کی جائیں؟ یہ مستقبل کا سب سے بڑا تعلیمی چیلنج ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں تعلیم کا مقصد جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ Nation State کے تصورات کو جاگزیں کرنا تھا، اس دور میں تمام اجتماعی اور انسانی علوم کی اٹھان ریاست، جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ کے تصورات پر تھی، اس لیے اس دور میں سارا مغربی فلسفہ اور تصور تعلیم، بالخصوص وہ تصور تعلیم جس سے مشرق کی غلام اقوام کو مانوس کیا گیا، ان ہی تصورات کی آب یاری کے لیے وقف تھا، اس کے برعکس اکیسویں صدی میں مغرب میں تعلیم کے مقاصد (ان کے تصورات کے مطابق) امن، انسانی حقوق اور جمہوریت ہوں گے، وہاں آج کل زور وشور سے ان موضوعات پر بین الاقوامی کانفرنسیں ہو رہی ہیں، اکتوبر ۱۹۹۴ء میں جنیوا میں ایک مشہور ادارے انٹرنیشنل کانفرنس آن ایجوکیشن کا اہم اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ آئندہ تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے امن، انسانی حقوق اور جمہوریت کے مقاصد کے لیے کن خطوط پر کام کیا جائے گا، اس کانفرنس میں غیر گریزی (زینوفوبیا) تشدد پسندی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مظاہر وظواہر پر غور کیا گیا، آج ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ان بدلتے ہوئے اہداف وتصورات میں ہمیں کون کون سے نئے چیلنج پیش آسکتے ہیں اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟

(محاضرات تعلیم: ۲۷۱-۲۷۷)

تحریک مدارس کا آغاز:

مولانا وحید الدین خان صاحب اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

مدارس دینیہ کی تحریک کا فکری آغاز متعین کرنا ہو تو غالباً وہ ۱۸۳۴ء ہوگا، جیسا کہ معلوم ہے ، اسی سال برطانیہ کا مشہور مدبر لارڈ میکالے(Thomas Babington Macaulay) لندن سے ہندوستان آیا، اس وقت یہاں برٹش اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ لارڈ میکالے نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک تعلیمی اسکیم بنائی، اسی اسکیم کی بنیاد پر اس کے بعد ہندوستان میں وہ نظام تعلیم جاری ہوا جس کو انگریزی نظام تعلیم کہا جاتا ہے، اس تعلیمی نظام کو جس مقصد کے تحت بنایا گیا تھا وہ خود میکالے کے الفاظ میں یہ تھا؛ تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو کہ پیدائش کے اعتبار سے ہندوستانی اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو:

So that a generation may arise,which is
Indian in birth and English in thought.

یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا، مدارس دینیہ کی تحریک اصلاً اسی چیلنج کے جواب کے طور پر ظہور میں آئی، علماء کی اس تعلیمی اسکیم کا نشانہ لارڈ میکالے کے مذکورہ بیان کی روشنی میں بتایا جائے تو وہ غالباً یہ ہوگا؛ تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندوستانی اور اپنے فکر وخیال کے اعتبار سے مسلمان ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ لارڈ میکالے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا اور علماء ہند کا منصوبہ اللہ کی توفیق سے کامیاب رہا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر ہند میں مسلمان اپنی دینی شناخت کے ساتھ پوری طرح موجود ہیں، مغربی تہذیب کا طوفان مسلمانوں کی ملی شناخت کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا، اور یہ زیادہ تر انہیں مدارس کا کارنامہ ہے جن کو علماء نے اپنی قربانیوں سے قائم کیا تھا۔

اہل مدارس کی قربانیاں

ہندوستان کو''دار التعلیم'' قرار دینے کے بعد پچھلے ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک میں مدارس دینیہ کا جو پھیلاؤ ہوا ہے وہ اپنے آپ نہیں ہو گیا؛ بلکہ وہ ہزاروں علماء کی خاموش قربانیوں کا نتیجہ ہے، ڈیڑھ سو سال پہلے کوئی عالم صرف یہ کرسکتا تھا کہ وہ ایک تعلیمی منصوبہ پیش کرے یا ایک ابتدائی مدرسہ کا قیام عمل میں لائے ،مگر کوئی بھی ایک عالم اپنی محدود عمر میں یہ نہیں کرسکتا کہ وہ ایک پورے خطۂ ارض میں مدارس کا جال بچھا دے اور نسل در نسل ایک پوری امت کو تعلیم یافتہ بنا تا رہے،اس کے لئے ضرورت ہے کہ مسلسل ایسے معاون علماء اٹھیں جو اس منصوبہ کو آگے بڑھائیں، جو اس کو عملی صورت دینے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرتے رہیں۔

پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک کے ہزاروں علماء نے ایثار وقربانی کا یہی عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، ان میں سے کچھ لوگوں کو آج ہم جانتے ہیں اور بہت سے لوگ وہ ہیں جو وفات پا کر اپنے رب کے پاس چلے گئے اور اب انہیں کوئی نہیں جانتا،مگر ان میں سے ہر ایک کی قربانیاں یکساں طور پر عظیم ہیں، ان میں سے کسی کا مشہور ہونا اور کسی کا مشہور نہ ہونا صرف ایک اضافی چیز ہے نہ کہ کوئی حقیقی چیز۔

ان علماء کے لئے تعلیم کے اس منصوبہ میں شرکت کوئی سادہ بات نہ تھی، یہ گویا ملت کو زندہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مٹا دینا تھا، یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس میں سادہ زندگی گزار کر مر جانا تھا،کم آمدنی پر اپنے آپ کو ساری عمر کے لئے راضی کر لینا تھا،حتی کہ بعض اوقات کسی مشاہرہ یا معاوضہ کے بغیر ساری عمر ایک ادارہ کی خدمت انجام دینا تھا، یہ ایک ایسے کام میں ساری زندگی گزار دینا تھا جس کی بابت پیشگی طور پر معلوم تھا کہ اس میں کوئی دنیوی عزت

ملنے والی نہیں، مزید یہ کہ یہ ایک ایسا پر خطر کام تھا جس میں اپنے اہل و عیال کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر کے قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس تعلیمی منصوبہ کو عوامی چندہ کے ذریعہ چلانا تھا۔ اور چندہ کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر (وفات: ۱۹۳۱) نے درست طور پر کہا تھا کہ چندہ مانگنا اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بندہ بنانا ہے۔ مدرسہ کو چلانے کے لئے یہ سب سے بڑی قربانی تھی جو علماء کو دینی پڑی، مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خاطر ان تمام چیزوں کو برداشت کیا اور اس مشکل ترین تعلیمی مہم کو جاری رکھا، حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں علماء اگر ایک کے بعد ایک اس تعلیمی مہم کے لئے کھڑے نہ ہوتے اور ہر قسم کی قربانی کے باوجود اس کو مسلسل جاری نہ رکھتے تو یہ منصوبہ صرف ایک نظری منصوبہ بن کر رہ جاتا، وہ کبھی تکمیل کے مرحلہ تک نہ پہنچتا۔

یہ علماء قناعت کی بوریوں پر بیٹھ کر ملت کے بچوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے، اور معاشرہ کا حال یہ تھا کہ وہ عزت دینے کے بجائے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ برصغیر ہند میں تعلیمی منصوبہ کو مختلف مصلحتوں کی بنا پر فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کے اصول پر چلایا گیا تھا، اس اصول نے اہل مدارس کے کام کو مزید مشکل بنا دیا۔

مدارس کے ملک گیر اور انتہائی وسیع نظام کو فری ایجوکیشن کے اصول پر چلانا ایک بے حد مشکل منصوبہ تھا، جب کہ علماء کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ اس کو حکومت کے تعاون کے بغیر آزادانہ طور پر چلانا ہے، اس انتہائی مشکل منصوبہ کو علماء اسلام نے اس طرح ممکن بنایا کہ اس کا سارا بوجھ خود اپنے اوپر لے لیا، علماء نے توکل اور قناعت اور کفایت شعاری کو اختیار کر کے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا، اللہ کے یہ بندے دنیا کے نفع اور نقصان سے بے نیاز ہو کر تعلیم و تدریس کے اس

خشک کام میں مصروف رہے، حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں فری ایجوکیشن کے اس وسیع منصوبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا یہ ایک انوکھا تجربہ ہے، جس کی کوئی دوسری مثال اتنے بڑے پیمانہ پر شاید کسی اور انسانی معاشرہ میں نہیں ملے گی۔

اب اہل مدارس کے حالات کافی بدل چکے ہیں، ماضی کی قربانیوں کا صلہ اب علماء کے موجودہ گروہ کو یہ مل رہا ہے کہ آج ان کی خدمات کا عام طور پر اعتراف کیا جانے لگا ہے، اسی کے ساتھ جدید سہولتوں نے قدیم مشکلات کی جگہ لے لی ہے، تاہم اس تبدیلی کے لئے تاریخ کو ڈیڑھ سو سال کا انتظار کرنا پڑا۔

شریعت کی رہنمائی

اسلامی شریعت کی رہنمائی کا تعلق کچھ محدود مسائل سے نہیں ہے؛ بلکہ اس سے زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی ملتی ہے، مدارس کی تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو اس معاملہ میں شریعت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں چلایا گیا، یہی وجہ ہے کہ مدارس کی تحریک کو وہ کامیابی ملی جو موجودہ زمانہ میں کسی دوسری تحریک کو نہیں ملی، یہاں اس سلسلہ میں اس کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی میں جو علماء اس تحریک کو لے کر اٹھے، ان کی ایک سوچ یہ ہو سکتی تھی کہ پہلے موجودہ عسر کو ختم کرو، یعنی برطانی حکمرانوں کو ہلاک کرو، انگریزی نظام تعلیم کے ڈھانچہ کو تباہ کرو وغیرہ، اس کے بعد ہی ہمارے لئے وہ وقت آ سکتا ہے جب کہ ہم اپنی پسند کا تعلیمی نظام اس ملک میں قائم کریں۔

اگر ہمارے علماء کی یہ سوچ ہوتی تو ان کی یہ تحریک شروع ہو کر چند سال کے بعد ہی ختم ہو جاتی، اس کا کوئی مثبت نتیجہ ملت مسلمہ کو نہ ملتا، جیسا کہ اس قسم کی بہت سی متشددانہ تحریکوں کا

کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا، مگر علماء کو اللہ تعالیٰ نے یہ بصیرت (vision) دی کہ وہ دونوں طریقوں کے فرق کو سمجھیں، چنانچہ انہوں نے تخریب غیر کے بے فائدہ کام کو چھوڑ کر تعمیر خویش کے مفید میدان میں اپنی ساری طاقت لگادی، اس کا نتیجہ اتنا کامیاب نکلا کہ یہ تحریک حدیث-**إن اللہ یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف**.(صحیح مسلم: کتاب البر)-یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جس کو وہ سختی پر نہیں دیتا کی ایک عملی مثال بن گئی۔

ہندوستان اسپین بننے کے خطرے سے کیوں بچ گیا:

انیسویں صدی میں جب ہندوستان میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہاں کی مسلم نسلوں کے لئے بھی اسپین کی طرح اسی قسم کا خطرہ پیدا ہوگیا، یہاں بھی تعلیم وتدریس کا پورا کام حکومت کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا، حکومت کے خاتمہ کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اس کے نتیجہ میں خارجی سرپرستی تقریباً ختم ہوگئی، مگر اس نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے علماء اسلام کو کھڑا کیا، انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ حکومت کے تعاون کے بغیر عام مسلمانوں کی مدد سے تعلیم دین کا نظام چلایا جائے، اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے یہ منصوبہ کامیاب رہا اور بڑھتے بڑھتے یہ حال ہوا کہ سارے ملک میں چھوٹے بڑے بے شمار مدارس کا جال بچھ گیا۔

اسی تعلیمی منصوبہ کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان اسپین جیسے حالات سے مکمل طور پر بچ گیا، ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملک کے مسلمان آج پوری دینی شناخت کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں، ان کی دینی زندگی یہاں اتنی مستحکم ہوچکی ہے کہ بار بار یہاں مختلف قسم کے طوفان آتے ہیں مگر وہ مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہیں بنتے، ایک انگریزی مثل کے مطابق اس ملک کے مسلمان ہر موقع پر طوفان کی بڑی چڑیا (big bird of the storm) ثابت ہوئے ہیں اور یہ سارا کریڈٹ بڑی حد تک علماء کے قائم کردہ اس تعلیمی نظام کو جاتا ہے جس کو

مدارس دینیہ کا نظام کہتے ہیں جو نسل در نسل مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا کام انجام دے رہا ہے۔

ذہنی بُعد کا خاتمہ

مدارس دینیہ کے ذریعہ ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس کی وجہ سے ملت کے خواص اور ملت کے عوام کے درمیان وہ نقص پیدا نہ ہوسکا جس کو ذہنی بعد (intellectual gap) کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں یہود کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ ان میں ایک فریق وہ ہے جو علم و عقل رکھتا ہے۔ (البقرہ:۷۵) یہاں ''فریق'' سے مراد یہود کے علماء ہیں جن کو احبار کہا جاتا تھا، اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ یہود میں دوسرا طبقہ ان کے عوام کا ہے، ان کی بابت قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ (البقرہ:۷۸) یعنی اور ان میں ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر آرزوئیں، ان کے پاس گمان کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کی اس آیت میں امیون کا لفظ آیا ہے، امیون جمع کا لفظ ہے، اس کا واحد امی ہے، امی عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہ لکھنا جانتا ہو اور نہ پڑھنا جانتا ہو۔ (من لایکتب و لا یقرأ) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، الجزء الثانی، ص:۵.

یہود کے علماء اور عوام کے درمیان ذہنی بعد (intellectual gap) قائم ہوگیا، ان کے عوام نہ خود اپنی مذہبی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے علماء کی علمی باتوں کو سمجھ سکیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام دھیرے دھیرے علماء سے دور ہوتے چلے گئے، مذہب کے نام سے ان کے پاس توہمات (superstitions) اور آرزوؤں (wishfulthinking) کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا، خواص اور عوام کے درمیان اس ذہنی بعد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی اصلاح ناممکن ہوگئی، کیوں کہ گہری اصلاح کی بات آسمانی کتابوں

کے حوالہ سے کرنی پڑتی ہے، اور ان کے عوام اپنی جہالت کی بنا پر اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ کتابی زبان اور علمی اسلوب کو سمجھ سکیں۔

یہی حال قدیم زمانہ میں تمام قوموں کا تھا، اس کی ایک مثال ہندوستان میں دیکھی جاسکتی ہے، ہندوستان میں ہزاروں سال سے خواص وعوام کی یہی تقسیم بہت بڑے پیمانہ پر قائم تھی، علم کا پڑھنا لکھنا صرف برہمن خاندانوں کے درمیان محدود تھا۔ ایسے تعلیمی ادارے موجود نہ تھے، جہاں عوام لکھنا پڑھنا سیکھیں، اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم زیادہ تر کچھ برہمن خاندانوں میں منحصر ہو کر رہ گیا اور ملک کے ۹۵ فیصد عوام اپنی جہالت کی بنا پر توہمات کو مذہب سمجھ کر اس میں مبتلا رہے۔

مدارس سے غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہونچا:

علماء اسلام نے تعلیم وتدریس کا جو کام شروع کیا اس کا فائدہ فطری طور پر یہاں کی غیر مسلم آبادی کو بھی پہنچا، یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلم دور کے آغاز سے پہلے ہندوؤں میں صرف برہمن اور اعلیٰ حیثیت کے کچھ لوگ تعلیم حاصل کر سکتے تھے، ہندو عوام زیادہ تر اس سے محروم تھے، مسلم عہد میں جب ملک میں عمومی تعلیمی ادارے کھولے گئے تو مسلم طلبہ کے ساتھ ہندو طلبہ بھی اس میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنے لگے، اس کے بعد جب ۱۹ ویں صدی میں مسلم علماء نے زیادہ بڑے پیمانہ پر مدارس کھولنا شروع کیا تو ان مدارس کے ذریعہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچنے لگا۔

مدارس کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ گاؤں گاؤں میں کھولے جارہے تھے، اس طرح ہر خاندان کے لئے ممکن ہوگیا کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیج کر تعلیم دلائے، فطری طور پر والدین اپنے چھوٹے بچوں کو دور کسی شہر میں بھیجنے پر راضی نہیں ہوسکتے تھے؛ لیکن جب ان کی

اپنی بستی میں مدرسہ کھل گیا تو ان کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے بچہ کو مدرسہ کی تعلیم میں شامل کر دیں، مدارس کے اس عمومی پھیلاؤ سے بڑی تعداد میں غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچا، مثال کے طور پر آزاد ہندوستان کے پہلے پریذیڈنٹ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے اپنے بچپن میں ابتدائی تعلیم بہار کے ایک مسلم مدرسہ میں حاصل کی تھی۔

اس طرح اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے عوام اور خواص کے درمیان ذہنی بعد (intellectual gap) کے تباہ کن نقصانات کو سمجھا اور اس کو دور کرنے کی مؤثر کوشش کی۔

اسلام کی اس روایت کو ہندوستان کے علماء نے اس ملک میں بھی پوری طرح باقی رکھا، برصغیر ہند میں علماء نے مدارس کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا ایک اہم فائدہ یہ تھا کہ خواص اور عوام یا علماء اور عوام کے درمیان ذہنی بعد (intellectual gap) کا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا۔

مدارس اور اچھے شہری

مدارس دینیہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ملک کو اچھے شہری فراہم ہو رہے ہیں، اچھے شہری، یعنی ایسے لوگ جو اخلاقی اصولوں اور انسانی قدروں کے مطابق جینے والے ہوں، ایسے افراد کی ضرورت ہر سماج کو ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اچھے شہری کے بغیر کوئی سماج اچھا سماج نہیں بن سکتا۔

مگر آج کے ہندوستان میں ایسے ادارے موجود نہیں جو اچھے شہری بنانے کا کام کر رہے ہوں، ملک میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جو تعلیمی نظام قائم ہے وہ سیکولرزم پر مبنی تعلیمی نظام ہے؛ چنانچہ ایسے افراد کی تیاری اس کے مقاصد میں شامل ہی نہیں، اس تعلیمی نظام کا واحد نشانہ لوگوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی معاشی اور مادی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

ایسی حالت میں مدارس دینیہ کا نظام ہی ملک میں وہ واحد بڑا نظام ہے جو اس اخلاقی

مقصد کی تکمیل کر رہا ہے یا کر سکتا ہے، ان مدارس کا مقصد لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینا ہے، مکتب کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر دار العلوم تک ہر مرحلہ میں یہی مقصد اس کے سامنے رہتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اسلام کیا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **بعثت لاتمم حسن الاخلاق.** (مؤطا امام مالک) یعنی میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ میں حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: **اکمل المومنین ایمانا أحسنهم خلقا** (مسند احمد) یعنی سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جو اخلاق میں سب سے زیادہ اچھا ہو۔

مدارس دینیہ میں نوجوان تعلیم و تربیت پاتے ہیں، وہ اپنی پوری تدریسی مدت میں اسی قسم کی باتیں پڑھتے اور سنتے ہیں، مدارس کا پورا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ وہاں آدمی کو صبح و شام اخلاق و انسانیت کی تربیت دی جاتی ہے، وہاں رسول اور اصحاب رسول کو زندگی کے لئے رول ماڈل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مدارس عملاً ملک کے لئے اچھے شہری اور بہتر انسان فراہم کرنے کے ادارے بن گئے ہیں۔

یہاں میں اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں دوں گا، ایک بار میں ہماچل پردیش کے ایک مدرسہ میں گیا، اس مدرسہ کو دیوبند کے ایک عالم نے قائم کیا ہے، اس مدرسہ کے آس پاس زیادہ تر ہندوؤں کی آبادیاں ہیں، یہ مدرسہ جب قائم ہوا تو ان پڑوسی ہندوؤں کو تشویش ہوئی، وہ سوچنے لگے کہ مدرسہ کے لوگ پتہ نہیں کس قسم کی مصیبت ہمارے لئے کھڑی کریں گے، مگر ان کا یہ خوف بے بنیاد تھا؛ چنانچہ تجربات کے بعد دھیرے دھیرے وہ ختم ہوتا چلا گیا۔

مثال کے طور پر مدرسہ کے قریب ہندوؤں کے ایک گاؤں میں آگ لگ گئی، یہ رات کا وقت تھا، جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو مدرسے والوں کو اس کی خبر ہوگئی، وہ کسی طلب کے بغیر دوڑ کر اس گاؤں میں پہنچے اور آگ بجھانے میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو گئے،

اللہ کی مدد ہوئی اور فوراً آگ بجھ گئی۔

اس طرح کے واقعات و تجربات کے بعد ہندولوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں، وہ مدرسہ کو اپنے حق میں ایک نعمت سمجھنے لگے، یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ یہ ہندو اپنے ذاتی نزاعات کو حل کرنے کے لئے مدرسہ والوں کے پاس آتے ہیں، کیونکہ ان کو مدرسہ والوں پر پورا بھروسہ ہے۔

اس طرح ایک بار میں ایک اور مدرسہ میں گیا، وہاں مدرسہ سے ملا ہوا ایک باغ تھا، اس زمانہ میں باغ کو ایک ہندو ٹھیکہ دار نے لیا تھا، اس ہندو باغبان سے میری ملاقات ہوئی، تو انہوں نے کہا کہ جب میں یہاں آیا تو میں ڈرتا تھا کہ مدرسہ کے لڑکے ہمارے باغ کا نقصان کریں گے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا، مدرسہ والوں کا حال یہ ہے کہ پیڑ کا پھل توڑنا تو در کنار؛ زمین پر گرے ہوئے پھل کو بھی وہ نہیں اٹھاتے، ملک بھر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس اسی طرح اچھے شہری تیار کرنے کا کام کر رہے ہیں۔اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

غیر سیاسی قیادت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سالہ عمل کے نتیجہ میں اس خطۂ ارض میں مسلمانوں کا ایک پر امن غیر سیاسی ایمپائر قائم ہو چکا ہے، ہر مسجد و مدرسہ اور ہر مسلم ادارہ اس ایمپائر کا ایک غیر متزلزل ستون ہے، آج مسلم قوم کو اس ملک میں جو بقا و استحکام حاصل ہے وہ انہیں لاکھوں اداروں (institution) کی بدولت ہے، اگر یہ ادارے نہ ہوں تو کوئی شہنشاہ بھی ان کو یہ استحکام نہیں دے سکتا۔

یہ واقعہ دور جدید کی بنا پر ممکن ہوا، جدید تبدیلیوں نے سیاسی اقتدار کو ثانوی اہمیت کی چیز بنا دیا ہے، اب طاقت کا حقیقی سر چشمہ ادارے (institution) ہیں، اداروں کی سطح پر آج

وہ سب کچھ مزید اضافے کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کی امید پہلے محدود طور پر صرف سیاسی اقتدار سے کی جاتی تھی۔

سیاسی ایمپائر فوج کی طاقت کے زور پر بنتا ہے، اور غیر سیاسی ایمپائر اداروں (institution) اور تنظیمات (Organizations) کی طاقت سے قائم ہوتا ہے، سیاسی ایمپائر ایک شخص یا گروہ کی عظمت کا مینار کھڑا کرتا ہے، اور غیر سیاسی ایمپائر پوری ملت یا پوری قوم کا محل تعمیر کرتا ہے، سیاسی ایمپائر ایک کے اوپر دوسرے کی حکمرانی کی علامت ہوتا ہے، جب کہ غیر سیاسی ایمپائر مجموعی طور پر پوری انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے، اللہ کی توفیق سے آج یہ غیر سیاسی ایمپائر اس خطۂ ارض کے مسلمانوں کے لئے پورے معنوں میں قائم ہو چکا ہے، **فالحمدلله علی ذلك**

نصاب کے سلسلے میں گذارشات:

مدارس کا موجودہ نصاب دو قسم کے علوم پر مشتمل ہے: علوم عالیہ، علوم آلیہ۔ جہاں تک علوم عالیہ کا تعلق ہے، وہ بلا شبہ مقدس علم کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم یہ تقدس ان کے متن (text) کے لئے ہے نہ کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لئے؛ اس لئے علوم عالیہ میں متن کو علیٰ حالہٖ باقی رکھتے ہوئے ان کی تشریحی اور تفسیری کتابوں میں وقت کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہوتی رہے گی۔

علوم آلیہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، علوم آلیہ کبھی مقدس نہیں ہوتے، وہ مکمل طور پر زمانی حالات اور عصری افکار کے تابع ہوتے ہیں، اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ علوم آلیہ پر مسلسل نظر ثانی کی جاتی رہے۔ جیسا کہ سیکولر نظام تعلیم میں عام طور پر کیا جاتا ہے۔

مدارس کے موجودہ نصاب میں قرآن، سیرت اور تاریخ اسلام کا حصہ بہت کم پایا جاتا

ہے،ضرورت ہے کہ نصاب کی اس کمی کو پورا کیا جائے ،اسی طرح حدیث کو اصلاً حدیث کے طور پر نہیں پڑھایا جاتا؛ بلکہ اس کو فقہ کے ذیل میں پڑھایا جاتا ہے،اس پہلو پر بھی دوبارہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح موجودہ نصاب میں ''فرق ضالہ'' کے نام پر بہت سی چیزیں داخل نصاب ہیں، حالانکہ یہ فرقے قدیم فرقے ہیں، جو اب عملاً معدوم ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طلبہ کو اس کے بجائے آج کے گمراہ فرقوں کے بارے میں معلومات دی جائیں، نہ کہ گذرے ہوئے فرقوں کے بارے میں، اسی طرح معقولات کے نام پر جو کتابیں مدارس کے موجودہ نصاب کا جزء ہیں وہ اب عملاً غیر مفید ہو چکی ہیں،ضرورت ہے کہ اس کے بجائے طلبہ کو جدید معقولات سے واقف کرایا جائے؛ تاکہ وہ آج کے ذہن کے سامنے اسلام کی مدلل نمائندگی کر سکیں۔

اس قسم کی متعدد چیزیں ہیں جو موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہیں، یہ نظر ثانی مدارس کے تعاون ہی کے ذریعہ انجام دی جا سکتی ہے، مدارس سنٹر کا ایک اہم کام یہ ہوگا کہ وہ اس نظر ثانی کے لئے حالات فراہم کرے۔

مدارس کے موجودہ نصاب کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ بڑی حد تک دعوت رخی (dawah- oriented) نصاب ہے، اس نصاب کو بنانے والوں کے ذہن میں غالباً یہ مقصد تھا کہ طلبہ کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ مدارس سے فارغ ہو کر دعوت و تبلیغ کے کام کو مؤثر طور پر انجام دے سکیں۔

یہ بجائے خود ایک صحیح نہج تھا،مگر اب زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو ہمارے مدارس ایسے مخاطبین کے لئے دعاۃ تیار کر رہے ہیں،جن کا اب کہیں وجود نہیں۔مثلاً یہ نصاب طلبہ کو قدیم ''معتزلہ'' کے خلاف ذہنی طور پر مسلح کرتا ہے،مگر آج کے جو زندہ معتزلہ

ہیں ان کے خلاف یہ طلبہ اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے، اسی طرح قدیم ذوق کے مطابق طلبہ کو مناظرہ کے آداب پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ آج مناظرہ کا طریقہ متروک ہو چکا ہے، اور اس کی جگہ سنجیدہ ڈائیلاگ کا طریقہ دنیا میں رائج ہو گیا ہے، مگر ہمارے فارغین مدرسہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ وہ جدید طرز کے سنجیدہ ڈائیلاگ میں حصہ لے سکیں، اسی طرح یہ فارغین مدرسہ قدیم طرز کی قیاسی منطق پر تیار ہوتے ہیں، جب کہ آج دنیا میں سائنٹفک منطق کا دور آچکا ہے، جس سے وہ آشنا نہیں ہوتے وغیرہ وغیرہ۔ (دین و شریعت:۸۹-۱۵۴)

صلاحیتوں کا صحیح استعمال:

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی علماء بالقوۃ طور پر اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں جو آج کے حالات میں قیادتی کردار ادا کرنے کے لئے ضروری ہیں، مگر صرف ایک کمی نے ان کو قیادت کے میدان سے باہر کر دیا ہے، اور وہ ہے انگریزی زبان یا بالفاظ دیگر عصری زبان میں لکھنے اور بولنے پر قادر نہ ہونا، اب آخری طور پر علماء کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ انگریزی زبان کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سیکھیں، بصورت دیگر انہیں آج کی دنیا میں تقدس کا درجہ تو مل سکتا ہے مگر انہیں قیادت کا درجہ ملنا ممکن نہیں، اور یہ خود فطرت کے قانون کی بنا پر ہوگا نہ کہ کسی کی سازش کی بنا پر۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان لازمی مضمون کے طور پر داخل نصاب ہو، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہر بڑے مدرسہ میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو اختیاری مضمون (optional subject) کی حیثیت سے شامل کیا جائے، اور طلبہ کے لئے یہ موقع ہو کہ ان میں سے جو شخص چاہے وہ اس سے استفادہ کر سکے، یہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم مدارس کو یا علماء کو دوبارہ اس قابل بنا سکتے ہیں کہ آج کے حالات

میں وہ اپنا قائدانہ رول ادا کرسکیں۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے دوران مجھے بار بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ دوسرے مذاہب میں ایسے افراد کثرت سے موجود ہیں جو عالمی اسٹیج پر اپنے مذہب کی نمائندگی انگریزی زبان اور عصری اسلوب میں کرسکیں، مگر اسلام کی صفوں میں ایسے علماء مشکل سے ملیں گے جو حقیقی طور پر اس کام کے اہل ہوں اور ان مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وقت کے معیار پر اسلام کی نمائندگی کرسکیں، دینی مدارس کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کے لئے ضروری تدابیر اختیار کریں۔

اس سلسلہ کی چند مزید صورتیں یہ ہوسکتی ہیں: جدید متعلق موضوعات پر توسیعی لکچر (Extention Lecture) کا انتظام کرنا۔ مقرر نصاب کے ساتھ مزید کتابیں تجویز (recommend) کرنا۔ تعطیلات میں طلبہ کے تربیتی کیمپ قائم کرنا۔ طلبہ کی انجمن کے تحت جدید موضوعات پر تقریر و مذاکرہ کا پروگرام رکھنا وغیرہ۔

مدارس اور دعوتی ضرورت:

ہمارے مدارس سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں علماء تیار ہوکر نکل رہے ہیں، مگر وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا کرسکیں۔

اس کا سبب زمانی حالات کا فرق ہے، ہمارے مدارس میں بظاہر آج بھی طلبہ کو نصابی یا غیر نصابی ذرائع سے دعوت وتبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا ہے، مگر یہ تیاری تمام تر مناظرہ کے اصول پر ہوتی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت کے اصول پر، مدارس کے طلبہ علم مناظرہ تو پڑھتے ہیں مگر وہ علم دعوت سے آشنا نہیں ہوتے، وہ اچھے مناظر تو ہوتے ہیں مگر وہ اچھے داعی نہیں ہوتے، یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے مدارس کے فارغین کو عملاً دعوت وتبلیغ کے لئے

غیر موزوں بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ سائنسی تجزیہ کا زمانہ ہے نہ کہ لفظی جدال کا زمانہ؛ چنانچہ پہلے جہاں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اب وہاں سنجیدہ ڈائیلاگ (serious dialogue) کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہے۔

یہ زمانی تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم کو اس سے ہم آہنگ کیا جائے، طلبہ کو مناظرہ اور مجادلہ کے بجائے علمی ڈسکشن (scientific discussion) کے لئے تیار کیا جائے۔

مناظرہ اور ڈائیلاگ میں کیا فرق ہے، وہ فرق بنیادی طور پر یہ ہے کہ مناظر پیشگی طور پر فریق ثانی کو اپنا حریف سمجھتا ہے، مناظر کے دل میں فریق ثانی کے لئے خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہوتا، وہ فریق ثانی کی اصلاح سے زیادہ اس کی شکست سے دلچسپی رکھتا ہے، مناظر کے اس ذہن کی بنا پر مناظرہ کا پورا عمل ایک قسم کی لفظی کشتی بن جاتا ہے، مناظر کی زبان آرا کی طرح تیز ہو جاتی ہے، نہ کہ پھول کی طرح نرم، یہاں تک کہ یہ نوبت آجاتی ہے کہ مناظر کو اس سے دلچسپی نہیں رہتی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، اس کی ساری دلچسپی اس سے ہوتی ہے کہ ایک ماہر وکیل کے مانند کسی نہ کسی طرح وہ فریق ثانی کو میدان مقابلہ میں ہرا دے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہونے والے مناظروں کی رودادیں پڑھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مناظرہ اور دعوت کے فرق کو قرآن کی زبان میں بیان کرنا ہو تو وہ ایک لفظ میں یہ ہوگا کہ دعوت کا نشانہ آدمی کا قلب ہوتا ہے، داعی ایسی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے جو فریق ثانی کے دل میں اتر جانے والی ہو۔ (النساء: ۶۳) اس کے برعکس مناظر کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح فریق ثانی کو مقابلہ کے میدان میں پچھاڑ دے، مگر مناظرہ کا یہ

طریقہ پیغمبروں کی سنت کے مطابق نہیں۔

یہ ایک لازمی ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں مدارس کے نظام کو بدلا جائے، اس کو مناظرہ کے بجائے دعوت کے قرآنی اصول پر قائم کیا جائے۔

دینی مدارس کا امتیاز

دینی مدارس کی اہم ترین امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بنیاد علم حقیقی پر قائم ہے، یعنی دین اسلام پر جو کہ مذہب کا واحد محفوظ ایڈیشن ہے، یہ ایک بے حد اہم بات ہے کیوں کہ دوسرے جتنے بھی تعلیمی نظام ہیں، ان سب کی بنیاد علم ظنی پر قائم ہے نہ کہ علم حقیقی پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں جو لوگ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں، وہ اس حیثیت میں ہوتے ہیں کہ اپنے عقیدہ و عمل کو اعتماد کی بنیاد پر قائم کر سکیں، وہ اس یقین کے ساتھ جئیں کہ انہوں نے جو کچھ پایا ہے وہ عین سچائی ہے، اس میں جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں۔

اکثر دینی مدارس میں قرآن کو تقریباً مکمل طور پر بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ یہی معاملہ حدیث کا ہے، وہ مدارس کے نصاب میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل رہتی ہیں۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس اپنے طلبہ کو ذہنی اور روحانی حیثیت سے ایک ایسی تربیت دیتے ہیں جو کسی اور نظام تعلیم میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ دوسرے اداروں میں اگر تعلیم کی بنیاد انسانی علم پر ہے تو دینی اداروں میں تعلیم کی بنیاد خدائی علم پر ہے، میں چند تقابلی مثالیں دوں گا جن سے اندازہ ہوگا کہ دینی مدرسہ اور غیر دینی مدرسہ میں کیا فرق ہے؟ وہ کون سے امتیازی اوصاف ہیں جو غیر دینی تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں دینی تعلیم گاہوں کو حاصل ہیں۔

غیر دینی درس گاہیں عملاً ایک ہی مقصد کے تحت قائم ہیں، اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا میں اچھا جاب حاصل کر سکے، ہر جگہ جاب رُخی تعلیم

(Job-oriented education) کا رواج ہے، گویا کہ یہ تعلیم گاہیں انسان کو حیوانِ کاسِب (earning animal) بنانے کے کارخانے ہیں۔

دینی مدارس کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ایک لفظ میں کہا جاسکتا ہے کہ دینی مدارس خدارخی تعلیم (God-oriented education) کے ادارے ہیں،وہ انسان کے اندر اعلیٰ مقصدیت کا شعور جگاتے ہیں، وہ انسان کو مادی سطح سے اٹھا کر روحانی یا ربانی سطح پر جینا سکھاتے ہیں۔

غیر دینی مدارس عملی طور پر یہ سبق دیتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزوں کا حصول ہی ہماری زندگی کی آخری منزل ہے۔جب کہ دینی مدارس ہر طالب علم کے اندر یہ ذہن بناتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزیں تمہاری ضرورت ہیں نہ کہ تمہارا مقصد۔

غیر دینی مدارس کا جو فلسفہ ہے اس میں انسان کے لئے آزادی کا پیغام تو موجود ہے مگر آزادی کے حدود (limitations) کا کوئی تعین نہیں،اس کا ایک نتیجہ وہ ہے جو جدید ترقی یافتہ ملکوں میں بے قید جنسی تعلقات اور بے قید لذت پسندی کی صورت میں پایا جاتا ہے۔غیر دینی درسگاہوں میں اس بے قیدی پر روک لگانے کا کوئی قانون نظری طور پر موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سماجوں میں ظاہری ترقیوں کے باوجود حقیقی انسانیت کا ارتقاء ممکن نہ ہوسکا۔

اس کے برعکس دینی درسگاہوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد خدائی شریعت کے اصول پر قائم ہے، چنانچہ دینی درسگاہوں کے فلسفۂ تعلیم میں انسان کے لئے جس طرح آزادی ایک معلوم اصول کی حیثیت رکھتی ہے،اسی طرح یہاں یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ آزادی کے حدود کیا ہیں، کب تک آزادی ایک رحمت ہے، اور وہ کون سی حد ہے جس سے تجاوز کرنے کے بعد آزادی اس کے لئے برعکس طور پر عذاب بن جائے گی۔

غیر دینی تعلیمی نظام میں ایک بڑا خلا یہ ہے کہ اس کو کسی بھی معاملہ میں نقطۂ آغاز (starting point) کا علم نہیں۔ اس کا سارا انحصار ذاتی تجربات اور مشاہدات پر ہوتا ہے۔ انسان اپنی لازمی محدودیت (limitation) کی بنا پر کبھی یہ جان نہیں پاتا کہ کسی معاملہ کا حقیقی نقطۂ آغاز کیا ہے، اس لئے ایسی درسگاہوں میں تربیت پائے ہوئے ذہن ابدی طور پر فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، وہ کبھی علم حقیقی کے درجہ تک نہیں پہنچتے۔ اس کے برعکس دینی درسگاہ اپنے الٰہی علم (divine knowledge) کی بنا پر اس حیثیت میں ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں پہلے ہی قدم پر صحیح نقطۂ آغاز کو پالے اور نتیجۃً فکری ٹھوکر کھانے سے بچ جائے۔

اس کی ایک مثال ڈَارُ وِن کا بندر سے انسان بننے کا ارتقاءِ حیات کا فلسفہ ہے، اس معاملہ میں غیر دینی درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے پاس نقطۂ آغاز کے لئے کوئی معلوم اصول موجود نہ تھا، انہوں نے اٹکل سے حیاتیاتی ارتقاء کا مفروضہ(hypo thesi) قائم کیا، سوسال سے بھی زیادہ مدت تک اس مفروضہ کو واقعہ ثابت کرنے کے لئے بے شمار اعلیٰ دماغوں نے اس پر اپنی عمریں صرف کر دیں، اس پر ہزاروں بلین ڈالر خرچ کئے گئے؛ مگر ان کا مفروضہ آج بھی صرف مفروضہ ہے، بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی بھی درجہ میں وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ نظریۂ ارتقاء کے محقق علماء خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ڈاروِن کا یہ نظریہ اب بھی صرف ایک کام چلاؤ نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت۔

اس کے برعکس دینی درسگاہ میں تربیت پائے ہوئے انسان کا ذہن اول دن سے بالکل صاف ہوتا ہے، قرآن کی بنیاد پر، وہ اول دن سے اس یقین کا حامل ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز خدائی تخلیق کے ذریعہ ہوا؛ نہ کہ محض بے شعور مادی عوامل کے ارتقاء سے، اس طرح دینی

درسگاہ کا ایک انسان حیاتیات کے معاملہ میں اس نقطۂ آغاز کو پہلے ہی دن پالیتا ہے، جس کو غیر دینی درس گاہ میں تربیت پائے ہوئے لوگ سوسال سے زیادہ مدت تک مہنگی قسم کی علمی سرگرمیوں کے باوجود پانے میں ناکام رہے۔

غیر دینی درسگاہوں میں جو فلسفۂ حیات رائج ہے، اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان لذت اور مسرت کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالے، چنانچہ آج غیر دینی درسگاہوں کے تعلیم پائے ہوئے تمام لوگ اسی واحد مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔

اس نظریہ کا عملی تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے، اس ذہن کے لوگ اپنی ساری عمر ان چیزوں کے حصول میں لگادیتے ہیں، جنکو وہ بظاہر خوشی ولذت کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر جب ہزار کوشش کے بعد وہ ان مطلوب چیزوں کا ڈھیر اکٹھا کرلیتے ہیں؛ تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، وہ انہیں لذت ومسرت دینے والی نہیں، اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے لامحدود استعداد (unlimited capacity) کا مالک ہے، جب کہ دنیا کی ہر چیز صرف محدود خوشی اور محدود لذت ہی دے سکتی ہے، گویا انسان اپنی طلب کے اعتبار سے کامل تسکین چاہتا ہے؛ جب کہ مادی چیزیں اپنی محدودیت کی بنا پر اس کو جزئی تسکین ہی دے سکتی ہیں، اسی فرق کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو اکتاہت (boredom) کہا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مادی ساز وسامان کی بے پناہ کثرت ہے، مگر ان سامانوں نے انسان کو جو چیز دی ہے وہ صرف مایوسی (frustration) ہے نہ کہ تسکین، جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ مادی ساز وسامان فراہم کیا گیا تھا۔

دینی مدرسہ میں تعلیم وتربیت پائے ہوئے انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے،

ایسے لوگ جس فلسفۂ حیات کا سبق لے کر اپنی مادر علمی سے نکلتے ہیں، وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کے لئے ہے نہ کہ حصول مسرت کے لئے ، یہ نقطۂ نظر ان کے رویہ کو یکسر بدل دیتا ہے، وہ دنیا کی کامیابی کے بجائے آخرت کی کامیابی کو اپنی منزل بناتے ہیں ، دنیا میں عیش ڈھونڈنے کے بجائے آخرت میں جنت کا حصول ان کا نشانہ بن جاتا ہے۔

سوچ کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم پائے ہوئے لوگ تعیش (luxury) کے بجائے ضرورت کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں، وہ فراوانی (adundance) کے بجائے قناعت کے اصول پر راضی رہتے ہیں، کل کی خوشی کا احساس ان کے لئے آج کے غم کو ہلکا کر دیتا ہے، وہ کبھی مایوسی سے دوچار نہیں ہوتے ، کیوں کہ جو کچھ انہیں موجودہ دنیا میں ملتا ہے؛ اسی کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں، ان کا سینہ حرص اور حسد جیسے منفی احساسات سے پاک ہوتا ہے، کیوں کہ حرص اور حسد جیسے احساسات مادی کمی کی زمین پر ابھرتے ہیں، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ لوگ اپنے غیر مادی ذہن کی بنا پر اس کمزوری سے پیشگی طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔

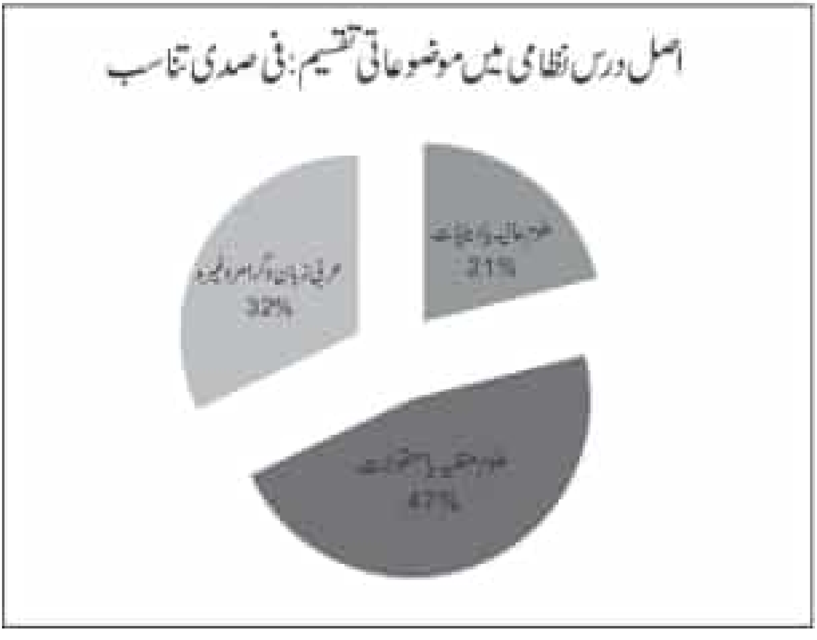
دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کے فرق کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ، وہ اصولی اعتبار سے ہے، جہاں تک عملی حیثیت کا تعلق ہے ، دینی مدارس میں بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، مگر بنیادی بات یہ ہے کہ غیر دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں ہیں وہ عین ان کے اصول اور فلسفہ کی بنا پر ہیں، اور اس اعتبار سے وہ ان کے نظام کا لازمی حصہ ہیں ، جب کہ دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں پائی جاتی ہیں وہ ان کی عملی کوتاہی کا نتیجہ ہیں ، نہ کہ نظریۂ تعلیم میں نقص کا نتیجہ، اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ عملی کوتاہی کو اصلاحی کوشش سے دور کیا جاسکتا ہے، جب کہ نظریاتی نقص کو اس وقت تک دور نہیں کیا جاسکتا ؛ جب تک کہ خود نظریہ ہی کو غلط قرار دے کر اس کو رد نہ کر دیا جائے۔

معاشی پہلو سے بھی دیکھا جائے تو مدارس کا کردار نہایت اہم ہے،صورت حال یہ ہے کہ ملک میں بے روزگاری عام ہے، لاکھوں ڈاکٹر اورانجینیر بے روزگار ہیں، جب کہ حکومت کی رپورٹ کے مطابق صرف گیارہ صوبوں میں چھوٹے بڑے ۲۹,۰۹۸ مدارس ہیں، اگر ہرمدرسہ میں اوسطاً دس افراد کا اسٹاف مانا جائے تو ان کی تعداد ۲,۹۰,۹۸۰ ہوتی ہے، پھراندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کم ازکم پانچ لاکھ مسجدیں ہیں، ہرمسجد میں ایک امام اور ایک مؤذن کی ضرورت پیش آتی ہے،گویا مسجدیں دس لاکھ افراد کیلئے روزگار کا ذریعہ بھی ہیں،اس طرح گیارہ صوبوں کے مدارس اورملک کی مساجد کے ذریعہ ۴۴,۰۷,۹۸۰ رافراد کوروزگار ملتا ہے، یہ تعداد صرف ۱۱رصوبوں کی ہے یہ اس تعداد کے علاوہ ہے جو ملک کی دیگرریاستوں میں مدارس کی ہے،تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں بھی ان مدارس کا اہم حصہ ہے، یہ ضرور ہے کہ ان اداروں میں تنخواہیں کم ملتی ہیں اور مذہبی جذبہ کے تحت معمولی اجرتوں پر لوگ کام کرتے ہیں،لیکن بہرحال یہ ایک بہت بڑی تعداد کیلئے روزگار کا ذریعہ ہیں۔(دین وشریعت:۱۲۵-۱۳۱)

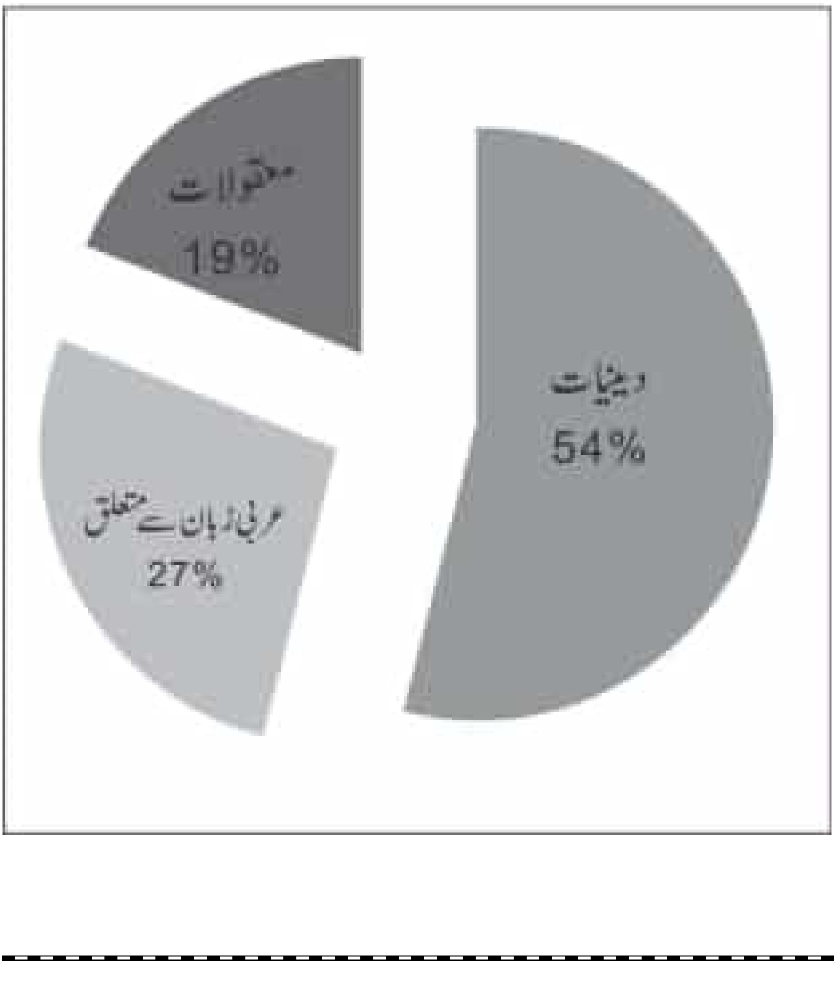
●●●●●

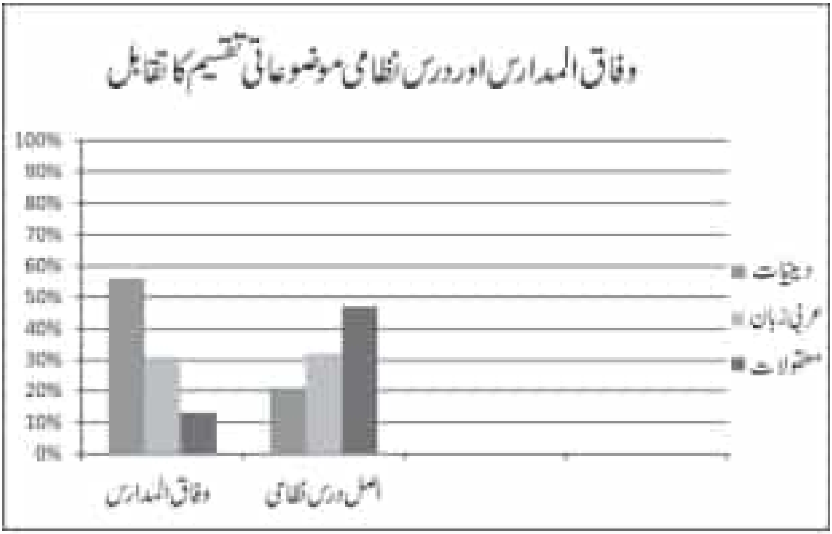
اصل درس نظامی میں موضوعاتی تقسیم

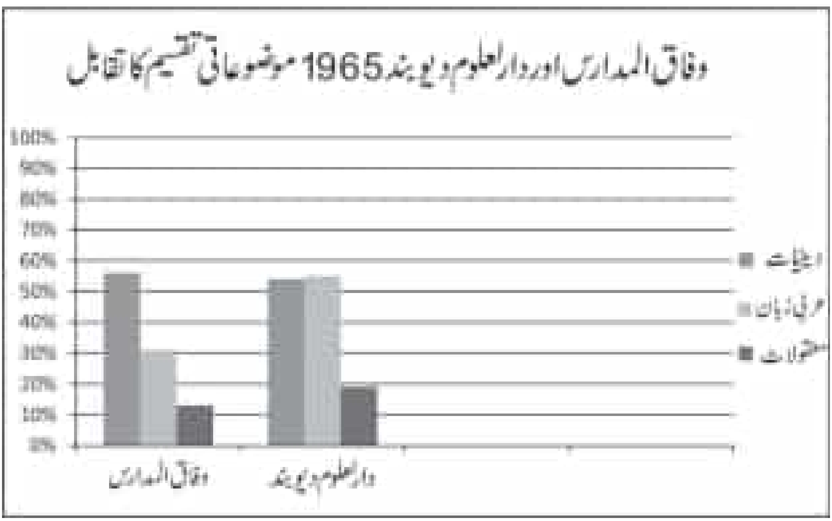
یہاں چند چارٹس پیش کئے جا رہے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ درس نظامی سے لے کر دیوبند سے ہوتے ہوئے موجودہ نصاب تک کا ارتقائی سفر کس طرح طے ہوا اور اس میں مذکورہ تین قسم کے مضامین (دینیات، زبان سے متعلق کتب، منطق و فلسفہ وغیرہ) کی ترجیحی ترتیب کس طرح بدلتی رہی۔



دیوبند کے نصاب ۱۹۶۵ میں موضوعاتی تقسیم

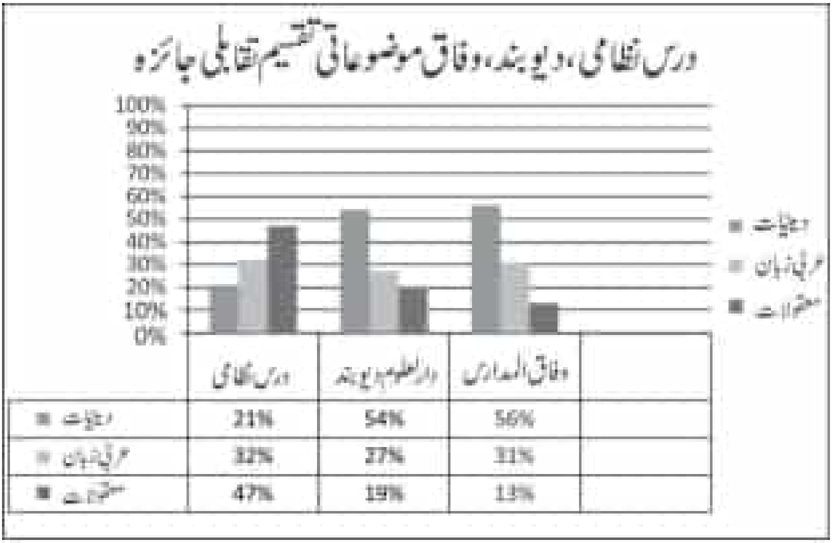



وفاق المدارس اور درس نظامی موضوعاتی تقسیم کا تقابل
100%
90%
80%
70%
60%
50%
40%
30%
20%
10%
0%
دینیات
عربی زبان
معقولات
وفاق المدارس
اصل درس نظامی


وفاق المدارس اور دارالعلوم دیوبند 1965 موضوعاتی تقسیم کا تقابل
100%
90%
80%
70%
60%
50%
40%
30%
20%
10%
0%
دینیات
عربی زبان
معقولات
وفاق المدارس
دارالعلوم دیوبند

وفاق المدارس کے موجودہ نصاب میں موضوعات کی تقسیم: فیصدی تناسب





	درس نظامی	دارالعلوم دیوبند	وفاق المدارس	
دینیات	21%	54%	56%	
عربی زبان	32%	27%	31%	
معقولات	47%	19%	13%	

ان چارٹس میں عربی زبان و گرامر اصل درس نظامی اور وفاق میں تقریباً برابر نظر آرہے ہیں؛ لیکن فرق یہ ہے کہ اصل مد میں ساری ہی کتابیں گرامر اور گرامر کی منطقی توجیہات پر مشتمل تھیں، عربی زبان ادب کی براہ راست کوئی کتاب نہیں تھی، جب کہ وفاق کے نصاب میں عربی سے متعلق کل ۱۲ کتابوں میں سے ۶ عربی گرامر، ۶ عربی زبان و ادب اور دو بلاغت کی ہیں۔

مفکر ملت کا نظریۂ تعلیم وتربیت

”انما بعثت معلماً“

کی نسبت کے امین-تدریسی خدمات کے آئینہ میں

مرتب

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب
(شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر

مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کی پوری زندگی تعلیم و تعلم کی آئینہ دار تھی، البتہ رسمی طالب علمی کے اختتام (۱۹۵۳ء) کے بعد جب آپ نے تدریسی زندگی کے آغاز سے پہلے تک جہاں جہاں ملازمت کی اس کو خود مختصر خودنوشت سرگزشتِ حیات میں یوں تحریر فرمایا ہے:

فراغت کے بعد جہاں جہاں ملازمت کی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❖ ...... ستمبر ۱۹۵۳ء میں ''مجلس خدام الدین سملک'' میں مکاتب کے ممتحن (وزیٹر) کی حیثیت سے ملازمت کی، دسمبر میں کروڈ میں مجلس کا جلسہ ہوا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ ایک ماہ سفر میں جانے کے لیے استعفا دیا۔

❖ ...... ۱۹۵۴ء: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں پہلی بار تدریس کے لیے تقرر ہوا؛ چوں کہ درمیانی سال تھا اس لیے درجۂ اردو سپرد کیا گیا۔

❖ ...... ۱۹۵۵ء: سال دوم میں شوال سے عربی اول کا مکمل درجہ سپرد کیا گیا اور عربی سوم کے دو اسباق بحر الآداب اور دروس التاریخ الاسلامی للخیاط بھی میرے ذمہ رہے۔

❖ ...... ۱۹۵۶ء میں مستعفی ہو کر کاپودرا آ گیا، جہاں رسالہ ''تبلیغ'' گجراتی کے دفتر میں محترم منشی محمود قاسم پانڈور صاحبؒ کے ساتھ کام کیا۔

❖ ...... ۱۹۵۷ء-۱۹۵۸ء: کاپودرا میں رہ کر زراعت کا کام کرتا رہا۔

❖ ...... ۱۹۵۹ء: دوبارہ ''مجلس خدام الدین'' میں بطور ناظم تعلیمات تقرر ہوا۔

❖ ...... ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء: مولوی عبدالرحمن گارڈی اور ان کے بھائی حبیب الرحمن کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں قیام رہا۔

❖ ...... مارچ ۱۹۶۲ء-شوال ۱۳۸۱ھ: ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' میں دوبارہ مولانا

محمد سعید صاحب سملکیؒ کے ساتھ دفتر میں کام کرنے کے لیے تقرر ہوا، دو گھنٹے درس کے لیے مقرر ہوئے، شرح وقایہ، مقامات حریری، (خارج میں انشاء عربی سوم)۔

❖ ...... ۱۹۶۳ ء - ۱۳۸۲ھ: ترجمہ نصف اول، مقامات حریری، نور الایضاح معہ قدوری، روضۃ الادب معہ صفوۃ المصادر، تیسیر المنطق، مرقاۃ، انشاء عربی چہارم۔

❖ ...... ۱۹۶۴ ء - ۱۳۸۳ھ: ترجمہ نصف ثانی، دیوان متنبی، نفحۃ العرب، نور الایضاح معہ قدوری، میزان الصرف، دروس التاریخ الاسلامی، (انشاء عربی سوم۔خ)

❖ ......۱۹۶۵ ء - ۱۳۸۴ھ: ترجمہ نصف ثانی، منیۃ المصلی، نور الایضاح، مختارات، مقامات، سفینہ، البلاغۃ الواضحۃ، دیوان متنبی، انشاء عربی سوم۔ پھر ۱۴/مارچ ۱۹۶۵ء میں تبدیلی ہوئی، اس میں نور الانوار، نور الایضاح پڑھائی۔

۱۹۵۳ء سے لیکر ۱۹۶۵ء تک کا یہ مختصر خاکہ آپ نے پیش کیا اس میں مجلس خدام الدین سملک میں آپ کو مولانا عبدالحق صاحب جیسے تجربہ کار عالم دین سے بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع ملا ہوگا، مکاتب کے اساتذہ، نصاب، نظام وغیرہ کے تجربات حاصل ہوئے ہونگے، اسی طرح کاپودرا میں بھی منشی محمود پانڈور صاحب جیسا گجراتی زبان کا ادیب، حضرت تھانویؒ کے علوم کا امین اورزمانے کی رفتار کے ماہر آدمی کی صحبت نے آپ کو صحافت کے آداب واتار چڑھاؤ سے واقف کیا ہوگا، پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اس وقت کے اساطین علم وفن کی حاضری میں درس وتدریس اور درمیانی مدت میں دارالعلوم دیوبند کے قیام نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، ڈابھیل کی تدریس کے دوران بھی آپ کے اسباق مشہور تھے، آپ کے اسباق چونکہ تحقیق، لغات وادب کے ساتھ دلچسپ بھی ہوتے تھے خاص کر کے دیوان متنبی کے اسباق میں بیمار طلبہ بھی (جو دوسرے اسباق میں غیر حاضر ہوتے تھے) حاضری دیتے تھے۔

ڈابھیل کی تدریس کے سلسلہ میں مزید تفصیل وضاحت کے ساتھ ان شاء اللہ تعالی لسان جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی کی رواں دواں دلچسپ تاریخی معلومات سے لبریز قلم کے ساتھ عن قریب آ رہی ہے، امید ہے کہ مفتی صاحب دامت برکاتہم انتظار کی طویل زحمت سے ہمیں نجات عطاء فرمائیں گے، مفکر ملت کے سلسلے کی کئی اہم وضروری باتیں مفتی صاحب نے زندان راز میں رکھی ہوئی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ مفتی صاحب اس سے جلد سبوک دوش ہو جائے۔

دارالعلوم فلاح دارین

❖ ...... ۱۹۶۶ ء-۸۶، ۱۳۸۵ ھ: ترجمہ قرآن مجید نصف اول، ریاض الصالحین، مختارات اول، شرح وقایہ، قصص النبیین اول، دوم، سوم، القراءۃ الراشدہ (جولائی کے بعد یہ کتابیں دیگر اساتذہ کو منتقل کردی گئیں، صرف ترجمہ اور ریاض الصالحین حصہ اول میرے پاس رہیں۔

❖ ...... ۱۹۶۷ ء-۸۶،۸۷ ۱۳ ھ: صرف اہتمام۔

❖ ...... ۱۹۶۸ ء-۸۸، ۱۳۸۷ ھ: ہدایہ اولین از کتاب النکاح تا کتاب الطلاق، اہتمام کے کام۔

❖ ...... ۱۹۶۹ ء-۸۹، ۱۳۸۸ ھ: ہدایہ اولین (ذی قعدہ تک) ترجمہ نصف ثانی، اہتمام کے کام۔

❖ ...... ۱۹۷۰ ء-۹۰، ۸۹ ۱۳ ھ: تمرین النحو، القراءۃ الراشدۃ، ریاض الصالحین حصہ ثانی، (از ربیع الاول تا اختتام سال)

❖ ...... ۱۹۷۱ ء-۹۱، ۱۳۹۰ ھ: صرف اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۲ ء- ۹۲، ۱۳۹۱ھ: مشکاۃ شریف جلد اول، رسالہ اصول حدیث، اہتمام کے کام۔

❖...... ۱۹۷۳ ء- ۹۳، ۱۳۹۲ھ: مشکاۃ شریف ثانی، اہتمام کے کام۔

❖...... ۱۹۷۴ء- ۹۴، ۱۳۹۳ھ۔۔۔۔۔۔۔اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۵ ء-۹۵، ۱۳۹۴ھ: القراءۃ الواضحۃ، القراءۃ الراشدۃ، علم النحو،......اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۶ ء-۹۶، ۱۳۹۵ھ: طحاوی شریف، مختارات ثانی، متنبی، ترجمہ ثانی، منہاج العربیہ، اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۷ ء-۹۷، ۱۳۹۶ھ: طحاوی شریف، موطائین شریفین، ریاض الصالحین حصہ اول ۲۶ رمحرم الحرام تک، تاریخ الخلفا، تمرین النحو، اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۸ ء-۹۸، ۱۳۹۷ھ: تمرین النحو، انشاء دوم،......اہتمام۔

❖...... ۱۹۷۹ ء-۹۹، ۱۳۹۸ھ: تمرین النحو، انشاء اول دوم،......اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۰ ء- ۱۴۰۰، ۱۳۹۹ھ: مفتاح الدروس (خ) تمرین الصرف، النحو الواضح، علم الصیغہ، اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۱ ء-۱۴۰۱، ۱۴۰۰ھ: صرف اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۲ ء-۱۴۰۲، ۱۴۰۱ھ: صرف اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۳ء- ۱۴۰۳، ۱۴۰۲ھ: صرف اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۴ ء- ۱۴۰۴، ۱۴۰۳ھ: صرف اہتمام۔

❖...... ۱۹۸۵ ء-۱۴۰۵، ۱۴۰۴ھ: طحاوی شریف، ریاض الصالحین، نحو میر، قصص النبیین، (چند ماہ عارضی طور پر) بعض طلبا کو عقیدۃ الطحاوی اور بعض کو عربی کی ....

پڑھائی، ......اہتمام۔

❖ ......۱۹۸۶ ء-۱۴۰۶،۱۴۰۵ھ: صرف سرپرستی۔

❖ ......۱۹۸۷ ء-۱۴۰۷،۱۴۰۶ھ: صرف سرپرستی۔

❖ ......۱۹۸۸ ء-۱۴۰۸،۱۴۰۷ھ: صرف سرپرستی۔

❖ ......۱۹۸۹ ء-۱۴۰۹،۱۴۰۸ھ: صرف سرپرستی۔ (گلدستۂ محبت: ص/۵۵)

دارالعلوم فلاحِ دارین کی تاسیس:

مدرسہ الکوثر رنگون میں ۲۰/نومبر ۲۰۱۲ء کو ایک خطاب کے آغاز میں مفکر ملت خود ہی فلاح دارین کی تاسیس اور نصاب پر گفتگو فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''دارالعلوم فلاحِ دارین'' ضلع سورت کا ایک معروف ادارہ ہے، جس کی تاسیس وہیں ترکیسر کے ایک عالم حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحب نے فرمائی تھی جو ندوہ کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے، اور حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ سے ان کا بہت قریبی تعلق بھی تھا، اس لیے انہوں نے یہ چاہا کہ گجرات کی سرزمین پر جو دینی مدارس ہیں وہ عموماً دارالعلوم دیوبند اور سہارن پور کے ہی مکمل نصاب کو پڑھاتے تھے، مولانا نور گت صاحب نے یہ چاہا تھا کہ تھوڑی سی اس میں تبدیلی کر کے ہم ''ندوہ العلما'' کے نصاب کو بھی پڑھائیں، شروع سے مولانا کا میرے ساتھ تعلق تھا، میں اس وقت ڈابھیل جامعہ اسلامیہ میں مدرس تھا؛ لیکن یوم اول سے میں مولانا کے ساتھ اس کام میں شریک تھا اور نصاب بنانے میں بھی میں شریک رہا اور اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ ''دارالعلوم'' کو شروع ہوئے ابھی دو سال ہوئے تھے کہ کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ مولانا مدرسہ سے ہٹ گئے اور ساری ذمے داری میرے اوپر آ گئی، مؤسس تو مولانا اور ان کے ساتھ دوسرے ترکیسر کے علما ہیں، ہم ایک سال کے بعد پہنچے۔

حضرت مفکر اسلامؒ سے وابستگی:

چوں کہ میرا ابھی تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ سے بہت زیادہ تھا، حضرت مولانا سے میرا بڑا گہرا تعلق رہا اور شاید ہی کوئی کتاب مولانا علی میاںؒ کی ایسی ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو، عربی بھی اور اردو بھی، میں نے اپنے کتب خانہ میں پوری ایک الماری ''ابوالحسنیات'' پر رکھی ہے، مولانا کی چھوٹی بڑی جتنی کتابیں مجھے مل سکیں ان کو حاصل کیا اور مستقل فہرست میں ''ابوالحسنیات'' کے نام سے رکھیں اور جیسے میں ''دارالعلوم دیوبند'' ہر سال جایا کرتا تھا اس طرح میرا دورہ ''ندوۃ العلما'' کا بھی ہوتا تھا اور حضرت بھی دو تین مرتبہ تشریف لائے، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب تشریف لائے، مولانا سلمان صاحب تشریف لائے، مولانا عبداللہ عباس صاحب تشریف لائے تو میں نے ایسی کوشش کی کہ دیوبند، مظاہر علوم اور ندوہ کو ملا کر رہوں گا۔

فلاحِ دارین کا نصاب دیوبند وندوہ کا معجون مرکب:

سال میں ایک دو مرتبہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے علما کو بھی بلاتا تھا، سالانہ جلسہ میں عموماً حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تشریف لاتے تھے اور کبھی بھوپال سے مولانا عمران صاحب کو بلا لیا، وہ بھی ندوۃ العلما کے ۲۵ ؍سال تک مہتمم رہے، کبھی ندوۃ العلما سے کسی کو بلایا تو ہم یہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں طرز فکر چلیں، دیوبندی اور ندوی دونوں طرز فکر کو ملا کر چلیں اور الحمد للہ! اس سے ہمیں بڑا فائدہ ہوا، فقہ کی جتنی کتابیں ہیں جس طرز سے دیوبند، سہارن پور اور ڈابھیل میں پڑھائی جاتی ہیں، جیسے ہم نورالایضاح سے شروع کرتے ہیں، قدوری پڑھاتے ہیں، شرح وقایہ پڑھاتے ہیں، ہدایہ پڑھاتے ہیں، پھر مشکاۃ المصابیح اور اس کے بعد جیسے ہمارے یہاں دورہ ہوتا ہے؛ لیکن الحمد للہ! اس طریقۂ تعلیم سے

یہ فائدہ ہوا کہ ہمارے طلبا ندوہ میں بھی جا کر داخل ہوتے ہیں، تخصص کے درجات میں، عربی ادب کے درجات میں تو وہاں بھی وہ کامیاب رہتے ہیں اور اگر وہ ''دارالعلوم دیوبند'' چلے گئے، مظاہر علوم چلے گئے تو وہاں بھی وہ آگے رہتے ہیں اور ہم نے بڑی کوششیں کیں کہ دونوں مدرسوں کے نصاب کے مطابق طلبا پر محنت کی جائے۔ (صدائے دل: ج/۴، ص: ۲۶۴)

استاذ محترم حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحبؒ الوداعی کلمات میں آپ کی آمد کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''رئیس جامعہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب فروری ۱۹۶۶ء میں بہ حیثیت مدرس ''مدرسہ فلاحِ دارین'' تشریف لائے، ۲/مارچ ۱۹۶۶ء میں موصوف کو عارضی طور پر اہتمام سپرد کیا گیا، پھر ۱۷/مارچ ۱۹۶۶ء ہی میں مستقل طور پر اہتمام کی ذمے داری سونپ دی گئی جو اکتوبر ۱۹۸۴ء تک جاری رہا، اس کے بعد نومبر ۱۹۸۴ء میں ان کو رئیس جامعہ کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ ۳/فروری ۱۹۹۳ء میں موصوف نے استعفا پیش کر دیا جس کو ۱۷/نومبر ۱۹۹۳ء کو بادل ناخواستہ قبول کر لیا گیا۔ اہتمام قبول کرنے کے بعد موصوف چوں کہ علمی ذوق، اعلیٰ انتظامی صلاحیت، مضبوط قوت ارادی، خلق حسن، صبر و ضبط، معاملہ فہمی، دور اندیشی، مردم سازی، وسعت ظرف، دل آویزی اور مہمان نوازی جیسی خداداد اعلیٰ صفات سے متصف تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصے میں موصوف نے اللہ تعالیٰ کے فضل، بزرگوں کی توجہات، اساتذۂ کرام کی اَن تھک محنت اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ادارے کو تعلیمی، تربیتی، تہذیبی اور تعمیری اعتبار سے قابلِ فخر ترقی عطا فرمائی، جس کا ثبوت معائنہ رجسٹر میں مرقوم ان تاثرات سے ظاہر ہے جو ملک کی مؤقر شخصیات کے قلم سے تحریر ہوئے ہیں۔

انہوں نے ملک کے کونے کونے سے ذی استعداد، مخلص، محنتی اور خلیق اساتذۂ کرام

فراہم کیے جنہوں نے اپنا خون پسینہ بہا کر ادارہ کے تعلیمی وثقافتی معیار کو بلند کیا۔

نصاب تعلیم انوکھا اور زمانہ کے تقاضے کے مطابق ترتیب دیا، جس میں دنیاوی ضروری مضامین کو شامل فرمایا، عربی اور انگریزی زبان وادب، نیز فن نحو وقراءت -جن پر عموماً کم توجہ دی جاتی ہے- کو انتہائی اہمیت دی، اس کے لیے ماہر اساتذہ فراہم کیے اور خود اپنے طلبہ کو شوق دلا کر اس قابل بنایا کہ آج وہ اس ادارے کے قابل رشک اساتذہ ہیں۔

موصوف نے عالمِ عرب کا سفر فرما کر نادر اور اہم کتابوں کا ذخیرہ جمع فرمایا جو آج کتب خانے کے لیے بیش قیمت علمی سرمایہ ہے۔

موصوف نے انتہائی جاں فشانی کر کے عالم عرب کے مشہور جامعات سے ادارہ کا معادلہ منظور کرایا اور طلبہ کو وہاں بھیج کر داخلہ دلایا جو آج وہاں سے فراغت کے بعد وقیع جگہوں پر دینی خدمت انجام دے رہے ہیں اور بعض ابھی زیر تعلیم ہیں۔

(گلدستۂ محبت: ص/ ۶۹)

ایک اور موقع پر حضرت مفکر ملت خود تحریر فرماتے ہیں:

۱۹۶۱ء تک قیام کے بعد حضرت مولانا محمد سعید بزرگ سملکیؒ کی دعوت پر ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' میں خدمت کے لیے حاضر ہوا، پانچ سال ڈابھیل میں قیام کر کے جنوری ۱۹۶۶ء میں ترکیسر ''دارالعلوم فلاح دارین'' تدریس کے لیے حاضر ہوا۔ مارچ ۱۹۶۶ء میں اہتمام کی ذمے داری سپرد کی گئی۔ (گلدستۂ محبت: ص/ ۵۱)

فلاح دارین کے قدیم طالب علم حضرت مولانا محمد دودھات صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

احقر ''دارالعلوم فلاحِ دارین'' میں تقریباً پانچ سال زیر تعلیم رہا، صاحب تذکرہ حضرت

مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم ڈابھیل سے بحیثیت مدرّس تشریف لائے تھے۔ حضرت سے شرح وقایہ، مختارات، ریاض الصالحین اور قرآن پاک کی منتخب سورتوں کو پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ہم پہلے ہی سن چکے تھے کہ مولانا مدظلہٗ کو اللہ جل شانہٗ نے علم ادب وتاریخ اور انتظامی صلاحیت اور مہارت کا وافر حصّہ عطا فرما رکھا ہے، اخذِ فیض کے لیے دل میں شوق انگڑائیاں لینے لگا، درمیانِ درس خوب گُل فشانی ہوتی، ادب میں تو ماشاء اللہ اردو، گجراتی، فارسی اور عربی میں یکساں ملکہ رکھتے تھے، جس کا اظہار حسبِ موقع بہترین محفوظات، ملفوظات، مقالات اور لطائف وظرافت کی صورتوں میں ہوتا تھا۔ بہت سے مصنّفین کی کتابوں پر از راہِ خیر خواہی وعنایت آپ کی تقریظ زینتِ توثیق بنی ہوئی ہے۔ دل جوئی وہمت افزائی آپ کا شیوہ تھا، خود میری گجراتی تالیفات بھی اس شرف سے بہرہ ور ہیں، مولانا کا مطالعہ جدید وقدیم کتب کا بڑا وسیع تھا۔

اسی طرح اکابر سے واقفیت بھی بڑی گہری تھی، جس کے نتیجہ میں ان کی مجلسِ درس و تقریر بھی بڑی دل چسپ ہوجاتی، جس سے متعلّمین، علما وعوام کے دلوں میں ایک عجیب لطف وسُرور پیدا ہوتا، جس پر بے اختیار زبان سے نکل جاتا......ع

داتا رکھے آباداں
ساقی تری محفل کو

(گلدستۂ محبت: ص/ ۵۳۰)

ایک اور قدیم طالب علم مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری تحریر فرماتے ہیں:

میں نے دو سال ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں فلاح دارین میں درجۂ عالمیت کی تعلیم حاصل کی ہے، پہلے سال جب داخلہ لیا تو اس وقت فلاح دارین کے مہتمم حضرت مولانا غلام محمد

نورگت صاحبؒ تھے اور میری تعلیم کے دوسرے سال حضرت الاستاذ کی مہتمم کی حیثیت سے دارالعلوم فلاح دارین میں تشریف آوری ہوئی تھی، اس سال میں نے حضرت الاستاذ دامت برکاتہم سے قصص النبیین پڑھی۔ (گلدستۂ محبت: ص/ ۲۸۵)

حضرت مفکر ملت خود تحریر فرماتے ہیں:

''مارچ ۱۹۶۶ء میں جب ''دارالعلوم فلاح دارین'' کے اہتمام کی ذمے داری سپرد کی گئی تو کم عمری اور ناتجربہ کاری کے سبب ضروری تھا کہ بزرگوں سے مشورہ کرتا، اسی مقصد سے ''حضرت مولانا محمد سعید راندیریؒ'' کی خدمت میں راندیر حاضر ہوا، جامعہ حسینیہ کے کتب خانہ میں تشریف فرما تھے، محبت سے بٹھایا، بندہ نے عرض کیا کہ بندہ اس کا اہل نہیں ہے ؎

مٹنے والوں کی رہی ہمیشہ اونچی منزل
پس گیا سرمہ تو آنکھوں میں جگہ پائی

مگر کمیٹی والوں کا اصرار ہے کہ تجھے ہی یہ کام کرنا ہے، فرمانے لگے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کام کام کو سکھلاتا ہے جیسے جیسے کام کرتے جاؤ گے تجربات ہوتے جائیں گے، مشکل پیش آئے تو مشورہ کرتے رہو البتہ ایک بات یاد رکھنا کہ ''چلتے بیل کو گودے مت مارنا'' چھیرنا مت، مطلب یہ تھا کہ مدرسہ میں جو اساتذہ کام کررہے ہیں خواہ مخواہ ان کے کام میں کیڑے نکال کر پیچھے نہ پڑنا، خردہ گیری سے پرہیز کرنا، مہتمم صاحبان کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں پکڑ کرنے میں فائدہ نہیں ہوتا، چشم پوشی بھی کرنی پڑتی ہے۔'' (رشد وہدایت کے منار: ص ۱۹۱-۱۹۲)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دارالعلوم کے انتظامی امور کی ذمے داری بہت کم عمری میں یعنی ۳۳ سال کی عمر میں سنبھالنے کی نوبت آئی، اس لیے بار بار اساتذہ اور اپنے اکابرین کی خدمت میں حاضری

دے کر مشورہ کرتا اور ان ہی کی رہ نمائی میں ٹوٹی پھوٹی خدمت انجام دیتا رہا، اللہ تعالیٰ قبول فرما کر نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین!''

اور ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''۱۹۶۶ء میں بندہ ترکیسر ''فلاح دارین'' میں مدرس ہو کر گیا، مگر دو مہینوں میں وہاں نظام میں تبدیلی ہوئی اور بندے کو اہتمام کی ذمے داری سپرد کی گئی، حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ طلب کیا تو فرمایا ہمت سے کام کرو؛ مگر بندے کی ایک نصیحت یاد رکھنا کہ تدریس کا سلسلہ نہ چھوڑنا، ہمارے اداروں میں مدرسین کی ضرورت تو ہمیشہ رہتی ہے مہتمم کی نہیں اور فرمایا کہ جن مدارس کے مہتمم مدرس بھی ہیں طلبا پر ان کا جو اخلاقی اثر ہوتا ہے وہ ان مہتمم صاحبان کا نہیں ہوتا جو مدرس نہیں ہیں۔'' (حوالہ بالا: ص ۱۴۳)

ان سب تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳/سال کی عمر میں آپ کو منصب اہتمام تفویض کیا گیا اور فلاح دارین کے مہتمم حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحب کے ساتھ آپ کے ڈابھیل کے تدریسی زمانے سے ہی تعلقات تھے؛ نیز نصاب تعلیم کے سلسلے میں بھی دونوں بزرگوں میں ہم آہنگی تھی، البتہ حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحبؒ کے مزاج میں قدرے تیزی تھی جیسا کہ فخر گجرات حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم نے بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے تعزیتی اجلاس میں فرمایا ہے، اور بندہ نے خود بھی ۹ سال فارسی اول سے دورۂ حدیث تک حضرت مولانا غلام محمد صاحب نور گت کو قریب سے دیکھا ہے، حضرت مولانا اصول پسند آدمی تھے، اور وہ حق بات کہنے میں لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، لیکن چونکہ آپ کی آواز بھاری ہوتی تھی، وہ اصول سے ملکر کچھ تیزی و تلخی پیدا کرتی

تھی، لہٰذا ارباب شوریٰ کے ساتھ آپ کا زیادہ نبھاؤ نہ ہوسکا، حضرت مفکر ملت کے ساتھ آپ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، دونوں کی عمر میں بھی کافی تفاوت تھا اور مفکر ملت ابھی گاؤں ومدرسہ دونوں کے لئے نئے تھے، یہ گفتگو کچھ سوالات مقدرات کے جواب میں اشارۃً عرض کررہا ہوں۔

کارے پاکاں را برخود قیاس مگیر ۔۔۔۔۔

کسی بھی مدرس کی تدریسی کامیابی یہ ہے کہ متعلقہ اسباق سے اس کو ذاتی دلچسپی ہو، وہ اس کو ذوقی ووجدانی کیفیت سے پڑھاتا ہو، اس فن میں اس کو کمال حاصل ہو، محض رسمی وقت گزاری نہ ہو، نیز تفہیم کی صلاحیت سے بھی نوازا گیا ہو تو پھر وہ اپنے طلبہ کو مکمل طور پر مطمئن کرسکتا ہے۔ الحمدللہ مفکر ملت میں یہ تمام اوصاف علی وجہ الاکمل موجود تھے، لیکن آپ نے اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم کے طور پر ہی پیش کیا، جنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

ہم سب طالب علم ہیں:

میرے دوستو! میں طالب علم ہوں، آپ بھی طالب علم، ہم سب طالب علم ہیں، کوئی اس میں فرق نہیں ہے، زمانہ کا فرق ہے کہ ہم کچھ ۴۵ / ۱۹۴۴ میں داخل ہو گئے اور آپ شاید کچھ بعد میں داخل ہوئے ہوں گے تو زمانہ کے تقدم وتاخر کا فرق ہے، ورنہ مقصد ہم سب کا ایک ہی ہے کہ ہم سب طالب علم ہیں، لیکن ہمیں تجربات اس وقت ہوئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ہماری معلومات میں کمی اس لیے ہے کہ ہم کتابیں نہیں پڑھ رہے ہیں، علمی ذوق نہیں ہے۔

حضرت مفکر ملت بیک وقت مدرس ومہتمم دونوں عہدوں کو سنبھالے ہوئے تھے، لہٰذا آپ کی تدریس کے اصول وامتیازات درس کے ساتھ کسی مدرس کی غیر حاضری کے موقع پر بھی نمایاں ہوتے تھے، بندہ کو چونکہ آپ سے دونوں موقعوں پر بھرپور فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے، لہٰذا میری گفتگو دونوں احوال سے متعلق ہوگی۔

جہاں تک درسی کتابوں کا تعلق ہے تو ہماری جماعت کو عربی دوم میں حضرت سے دو کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، القراءۃ الواضحہ (حصہ دوم) اور علم الصیغہ (حضرت مولانا ذوالفقار صاحبؒ کے سفر حج کے موقع پر تشریف لے جانے کی وجہ سے) کا کچھ حصہ سبقاً حضرت سے پڑھنے کا موقع ملا، **القراءۃ الواضحہ** کے ساتھ حضرت **الگ سے بھی تمرین کرواتے تھے، اچھے اچھے جملے اور قطعات ومحفوظات یاد کراتے، روزانہ تمرین میں اس کا اعادہ ہوتا تھا،** اسی طرح دورۂ حدیث میں طحاوی شریف اور مؤطا امام محمد بھی حضرت کے پاس تھی، بعد میں موطا امام محمد تو حضرت مولانا یعقوب صاحب دیسائیؒ کے سپرد کی تھی، البتہ طحاوی شریف کا مکمل نصاب حضرت مفکر ملت کے پاس ہی پڑھا، **نظر طحاوی کو سمجھانے کا آپ کا انداز** بہت نرالا تھا، **حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی کے امانیٔ الاحبار اور دیگر شراح کے** حوالے سے بہت صاف اور واضح **انداز میں نظر طحاوی پر کلام فرماتے تھے، جس سے آپ کی محدثانہ شان کا احساس ہوتا تھا۔**

مولانا ادریس صاحب لکھتے ہیں:

حضرت والا کی عادت تھی کہ کبھی کوئی استاذ غیر حاضر ہوتے تو ان کی جگہ خود تشریف لے آتے اور طلبہ کو جانچتے کہ کیا پڑھا، کتنا پڑھا، کیسا پڑھا؟ اور کبھی اپنے دفتر ہی میں طلبہ کو بلا لیتے تو ہم کو بھی ایک دن بلا لیا، اس وقت ہم فارسی کی ایک چھوٹی سی اشعار کی کتاب ''کریما'' پڑھتے تھے، آپ نے اشعار زبانی پڑھنا شروع کیے، اس درمیان معانی ومطلب اور مشکل الفاظ کے لغات بھی پوچھتے گئے، ہم طلبہ کا کام تو صرف ترجمہ رٹ لینا تھا، اس لیے الفاظ کے لغات کچھ معلوم نہیں تھے، پھر کیا کہنا، خوب ڈانٹ پڑی اور کس طرح کتاب کو پڑھا جاتا ہے، لغات سمجھنے اور معانی اور ترجمہ کرنے کا طریقہ سمجھایا، اس دن سمجھ میں آیا کہ

کتاب کیسے پڑھی جاتی ہے، کئی بار حضرت والا کو فارسی اشعار جھوم جھوم کر پڑھتے ہوئے سنا ہے، اشعار کے معانی و مطالب اور نصائح کو طلبہ کے سامنے عجیب انداز سے بیان فرماتے تھے، نیز آج کل کے طلبہ فارسی کے شیریں اشعار کو نہیں سمجھتے ہیں اس پر بھی افسوس کا اظہار فرماتے تھے۔

عربی کتابوں کا طریقۂ تعلیم:

بندہ جب عربی اول میں پہنچا تو چند ماہ کے بعد ایک دن حضرت نے پوری جماعت کو دفتر میں طلب فرمایا اور ''قصص النبیین'' کا سبق سننا شروع کیا، عام طور پر ہم صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے تھے؛ مگر حضرت نے عربی میں سوال بنا بنا کر پوچھنا شروع کیا، چوں کہ ہمارے لیے یہ نیا طریقہ تھا اس لیے ہم اچھی طرح جواب نہ دے سکے، پھر نحوی اور صرفی تحقیق پوچھنی شروع کی، مگر ہم خاموش تھے، اس لیے کہ صرف و نحو کا اجرا نہیں ہوتا تھا، حضرت نے ہمیں سمجھایا کہ اس کتاب کو اس انداز سے پڑھنا چاہیے، الحمد للہ! اس کے بعد شوق بڑھا اور رات میں طلبہ کے ساتھ اسی طریقہ سے تکرار کرنے لگے، اسی طرح عربی کتابوں کو صرفی نحوی ترکیب کے ساتھ حل کر کے ترجمہ کرنے لگے، جس سے کتاب آسانی سے حل ہو جاتی تھی۔

(گلدستۂ محبت: ۱۵۸-۱۶۳)

حضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی استاذ صاحب رخصت پر ہوں تو آپ طلبۂ عزیز کو دفتر میں بلاتے تھے، اس وقت کتاب کے متعلق معلومات کے علاوہ استعداد بنانے کے جوگر بتاتے تھے وہ یقیناً بہت قیمتی تجربات ہوتے تھے، طالب علم کو آپ کے درس سے توانائی ملتی تھی، اس کی بیٹری چارج ہو جاتی تھی اور کئی دنوں تک نئے حوصلے واُمنگ کے ساتھ مطالعہ و تکرار میں لگا رہتا تھا، طلبۂ عزیز کی صرف مدرسہ کی چہار دیواری میں ہی آپ نے نگرانی ورہ نمائی نہیں فرمائی؛ بل کہ فراغت کے بعد بھی ان کی مسلسل فکر رکھتے ہیں، ان کا تفقد کرتے

ہیں، اچھی کتابوں کی طرف رہ نمائی کرنا، معلومات کے تبادلہ کی کوشش کرنا اوراس سلسلہ میں متعدد بار علما کو خطوط کے ذریعہ جوڑنے کی کوشش بھی شامل حال ہے۔

مولانا ادریس صاحب کی جماعت کی طرح ہماری جماعت کو بھی فارسی اول، دوم اور عربی اول میں حضرت مفکر ملت کے آفس میں بلانے پر اسی طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا، اور پھر حضرت کے فرمانے کے مطابق قصص ۱، ۲، ۳، القراءۃ الراشدہ ۱، ۲، ۳، مفید الطالبین اور مختارات ۱، ۲، کے لئے مستقل کاپیاں بنائی، اور ہر ایک میں آنے والے مشکل الفاظ کا مصدر، باب، واحد، جمع، معرب، مبنی وغیرہ کا خاکہ الگ الگ لکیروں کے ساتھ تیار کیا، وہ کاپیاں آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اسی طرح قرآن شریف کے ترجمہ میں بھی عادت بن گئی کہ حضرت کے بتائے ہوئے طریقے پر اس کی بھی کاپیاں بنائی گئی، اس میں مختلف تراکیب کا بھی اضافہ کیا گیا، القراءۃ الواضحہ اول (چند مہینے) ودوم (مکمل) حضرت کے پاس ہی پڑی تھیں، لہذا اس میں تو روزانہ حضرت کا کاپی دیکھنے کا التزام تھا، اس لئے اس میں تو پابندی کے ساتھ لکھتے تھے۔

فقہ میں بھی نورالایضاح کے سبق میں استاذ کی رخصت کے موقع پر بلاتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ سجدۂ تلاوت کی مجلس کے سلسلہ میں طلبہ سے سوالات کئے اور پھر شرح وقایہ منگوائی اور اس میں عبارت زیادہ واضح تھی تو حضرت نے اس کو پڑھا اور پھر ہمیں بتایا کہ کوئی ایک کتاب میں بات سمجھ میں نہ آئے تو اسی فن کی دوسری کتابوں کو دیکھنا چاہئے۔

مختارات میں حاشیہ ضرور پڑھاتے اور مضمون نگار کی خصوصیت پر حضرت مولانا علی میاںؒ نے جو لکھا ہو اس کو پڑھاتے اور پھر طلبہ کے جواب نہ دینے پر خود اس کی وضاحت کرتے تھے، اس نے ہماری بھی یہ عادت بنادی کہ مضمون نگار کی خصوصیت نہ جاننے پر استاذ

محترم سے دریافت کرتے اور تسلی نہ ہونے تک آگے نہیں بڑھتے تھے۔

آپ صرف مہتمم ہی نہیں تھے، بل کہ بہترین مدرس اور باصلاحیت استاذ بھی تھے، ہر فن بل کہ ہر موضوع کی کتاب پر نظر تھی، حواشی اور شروحات کے متعلق طلبہ کی رہ نمائی فرماتے تھے۔

تعلیمی ترقی میں جدید اسلوب اور کار آمد طرق کو اپنانے اور ان کی جستجو کرنے کو اہمیت دیتے ہوئے فرمایا: طریقۂ تعلیم کی تبدیلی سے انقلاب پیدا ہوتا ہے، ہمارے اندر یہ چیز ہونی چاہیے کہ کہیں سے کوئی چیز اچھی ملتی ہو تو ہمیں جا کر سیکھنی چاہیے، علمی غرور سے اللہ حفاظت فرماوے، آمین! آدمی ہر وقت اس تلاش میں رہے کہ بہتر سے بہتر چیز ہمیں کہاں سے ملے۔

''الحکمة ضالة المؤمن'' بلیک بورڈ کے استعمال پر زور دیا تو کسی نے کہا کہ اسلاف کا طریقہ یہ نہیں، حضرت نے اس پر فرمایا یہ ذہن صحیح نہیں ہے، یہ جو تہذیب ہے کہ ہم ایک چیز کو پکڑ کے رکھتے ہیں ہم یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہمیں کوئی نئی چیز اپنانی چاہیے، سکھانی چاہیے، اس چیز نے ہمیں بہت پیچھے دھکیلا ہے۔

اعلیٰ زبان سیکھنا:

اعلیٰ زبان سیکھنے پر زور دیتے تھے اردو، عربی اور انگریزی سب کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر سیکھنے کا زور دیتے، ہر زبان کا محاورہ ہوتا ہے اس کو سمجھنے کی تلقین فرماتے، حضرت فرماتے تھے ''إنما اللغة بالسماع.''

محفوظات:

حضرت دامت برکاتہم کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ کو بہت سی عربی اور اردو کتابوں کی اہم اہم عبارتیں اور اہم اہم قطعات اور اشعار زبانی یاد ہوتے ہیں اور ضرورت کے موقع پر آپ ان کو بغیر جھجک کے بلا تکلف پڑھتے اور سناتے جاتے ہیں، اس کی وجہ شاید مفکر اسلام

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کے بتائے ہوئے طریق پر آپ کا مطالعہ کرنا ہے، خود حضرت ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کوئی کتاب پڑھیں اور اس میں اچھے اچھے مضامین ہوں تو اس کو اتنی مرتبہ پڑھو کہ اس کی عبارتیں آپ کے ذہن میں نقش ہو جائیں، کوئی مضمون اچھا ہے ایک مرتبہ پڑھو، پھر دوسری مرتبہ پڑھو، پھر تیسری مرتبہ پڑھوتا کہ وہ دماغ میں بیٹھ جائے یہ ضروری ہے اور انہوں نے خود فرمایا کہ میں نے احمد امین کی کتاب فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام اور ظہر الاسلام کو اتنا پڑھا ہے کہ ان کے صفحے کے صفحے میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے اور ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے ان کتابوں کو پڑھا نہیں بل کہ چاٹا ہے۔ (کاش کہ حضرت کی اس بات اور مشورہ کو ہر طالب علم اپنے لوحِ دل پر نقش کر لے)

اور ایک جگہ حضرت فرماتے ہیں کہ ہمارے بچوں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ ''محفوظات'' کی طرف دھیان نہیں دیتے، عربی کے نثر اور نظم کے جتنے اچھے قطعات ہیں انہیں عربی اول سے ہی یاد کرنا چاہیے، عمدہ قسم کے اشعار اور عمدہ قسم کے قطعات ہمارے ذخیرۂ حفظ میں ہونے چاہیے، عرب ممالک میں تو ''محفوظات'' کی کتابوں کا بہت رواج ہے اور اس سلسلہ میں کافی کتابیں چھپ چکی ہیں۔''

ذوقِ مطالعہ:

علم میں پختگی اور علمی استحضار کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے، علمی اعتبار سے جتنی

بھی بڑی شخصیات گزری ہیں انہوں نے مطالعہ پر مواظبت فرمائی ہے، حضرت دامت برکاتہم خود ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''چند کتابیں پڑھ کر یا پانچ سال یا آٹھ سال پڑھ کر اپنے آپ کو عالم نہ سمجھیں، علم ایک بہت وسیع دریا ہے جو آٹھ سال میں طے نہیں ہوا کرتا، یہ درس نظامی جو مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے اس کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہمارے اکابر نے جو کتابیں لکھی ہیں ہم انہیں سمجھنے اور حل کرنے کے قابل ہوجائیں، علم کا دروازہ تو اس کے بعد کھلنا شروع ہوتا ہے، وہ بھی اس وقت جب کہ مطالعہ پر مواظبت رہے، اسی لیے سند کے اندر ہمارے اکابر یہ عبارت لکھتے ہیں ''إن استمر علی المطالعة'' اگر یہ طالب علم مطالعہ کے اوپر مداومت کرے گا تو اس سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ یہ دین کا اچھا کام کرے گا تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر عالم کے لیے اہتمام کے ساتھ مطالعہ بہت ضروری ہے تبھی علم تازہ و مستحضر رہتا ہے اور علم میں وسعت اور عمق و گہرائی پیدا ہوتی ہے۔''

حضرت دامت برکاتہم کا روزانہ مطالعہ کا معمول تھا، خود فرمایا کہ:

''میں روزانہ کتابیں پڑھتا رہتا ہوں، بیٹھے بیٹھے کبھی چالیس صفحے پڑھ لیے کبھی پچاس صفحے پڑھ لیے اور فرمایا کہ جب تک ہم زندہ ہیں ہم طالب علم ہیں، اگر آدمی اپنے آپ کو مرتے دم تک طالب علم نہ سمجھے تو وہ علم حاصل نہیں کرسکتا۔''

علم النفس التربوی ایک مستقل فن ہے جس کے ذریعہ طلبہ کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے طرق تعلیم وتدریس اختیار کئے جاتے ہیں، جس سے طرفین کو بڑی سہولت رہتی ہے،

جہاں مدرس میدان تدریس میں مفید ثابت ہوتا ہے وہیں طالب علم تحصیل علم میں بڑی سہولت محسوس کرتا ہے۔ حضرت والا کی اس پر پوری نظر تھی اور اس فن کی جہاں آپ نے کتابیں جمع فرمائیں؛ اس فن کی شخصیات سے بھی آپ واقف تھے۔ چناں چہ آپ نے مدرسہ میں ایک تعلیمی سیمینار منعقد فرمایا اور اس فن کے ماہر و متخصص استاذ حضرت مولانا نذر الحفیظ صاحب مدظلہ العالی کو ندوۃ العلما سے مدعو فرمایا۔

طلبہ کی تربیت:

طلبہ کی تربیت میں حضرت والا مفکر ملت کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے، ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب معاملہ فرماتے، ہر ایک کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکتے تھے اور یہی صحیح طریقہ بھی ہے۔

وقت کی پابندی:

وقت کی پابندی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، مدرسہ کے زمانہ میں بھی ہمیشہ آپ وقت سے پہلے پہنچ جاتے اور چوراہے پر بہت سی مرتبہ کھڑے ہو جاتے، اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی وقت کے پابند ہوتے، کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ تاخیر کرے، اسی طرح اگر کسی سے اپائنٹ منٹ لیا ہو تو ضرور وقتِ مقرر سے پانچ منٹ پہلے پہنچ جائیں گے، ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں فرمائیں گے اور اگر کسی کو آپ نے وقتِ مقرر ملاقات کے لیے دیا ہو تو اپنے ساتھ بھی یہی پسند فرماتے ہیں کہ سامنے والا شخص وقت مقرر پر آ جائے، آپ تیار ہو کر اس کا انتظار فرماتے ہیں، تاخیر پر آپ کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کا مناسب انداز میں اظہار بھی فرما دیتے ہیں، نماز کے اندر بھی یہی حال تھا، کبھی ہم نے نہیں دیکھا کہ رکعت چھوٹ گئی ہو،

فلاحِ دارین کا نصاب:

حضرت مفکر ملت نے ''فلاح دارین'' کے نصاب کی تعیین میں جس فکری اعتدال اور

عصر حاضر کی ضروریات ومقتضیات کا لحاظ فرمایا اور طلبۂ عزیز کومختلف فنون کی کتابیں پڑھانے والے متبحر وتجربہ کار اساتذۂ کرام کوتلاش کر کے جمع کیا، یہ آپ کا ہم طلبہ کے ساتھ بہت بڑا احسان ہے، آپ نے ہمیں ایک فکر عطا فرمائی، **تصلب فی الدین کے ساتھ عصری ضروریات، لسانیات اور مختلف فنونِ جدیدہ کا اضافہ کیا اور ایک متحرک زندہ نصاب سے ایک بہترین ٹیم تیار کی،** آپ کے حسنِ عمل، ذہنی فکر، دلِ دردمند اور زبانِ ہوش مند کے نتیجہ میں جو افراد تیار ہوئے وہ الحمدللہ تعالیٰ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں بہت کامیابی سے خدمات انجام دے رہے ہیں، نصاب کی کچھ جدت نے قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے مضامین کے حصول میں کوئی خلا نہیں محسوس ہونے دیا، عربی زبان کی مسلسل محنت اور نئے اسالیب عربیت نے طلبہ کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ وہ سطحیت جس کا خطرہ دیگر اداروں کے تجربہ سے لوگوں نے محسوس کیا تھا، الحمدللہ تعالیٰ ''فلاح دارین'' میں علیا کے بہترین صلاحیت والے اساتذۂ کرام کی اَن تھک محنت اور حضرت مفکر ملت کی اس طرف خاطر خواہ توجہ نے اعتدال کے ساتھ تمام علوم وفنون میں یکساں بار آوری فرمائی۔ اسی طرح تجوید و قراءت جس کا قرآنی علوم میں سے ہونے کی وجہ سے حق بھی بنتا تھا، اس کو بھی آپ نے اس کا صحیح حق دلوانے میں بہت محنت فرمائی، آج جب کہ سارے مدارس میں اس کی اچھی فضا بن چکی ہے اور ماحول بڑا ساز گار ہے، میری یہ بات اتنی اہمیت نہیں رکھتی ہے؛ لیکن اُس وقت قراءاتِ سبعہ متواترہ کے سلسلے میں لوگوں کی زبانیں جہالت عن القرآن وعلوم القرآن کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ اور حضرت مفکر ملت دامت برکاتہم عربی زبان اور تجوید وقراءت کے سلسلے میں مدارس اسلامیہ کے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ ہر سنی سنائی بات آپ کی طرف منسوب کر کے پھیلائی جا رہی تھی، لیکن آپ نے صبر وثبات سے اس کا مقابلہ کیا اور آج وہی چیزیں مدارس

کے لیے باعث افتخار بنی ہوئی ہیں۔ تلک الأیام نداولھا بین الناس!

نصاب تعلیم پر فلاح دارین کے ہی ناظم تعلیمات اور نصاب پر خود کتاب مرتب فرمانے والے حضرت الاستاذ سید مولانا ذوالفقار صاحبؒ کا مضمون بہت ہی جامع ومانع ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے جامعات ان دنوں جس افتاد کا شکار ہیں اوران کی افادیت بڑھانے کے لیے جو تجاویز اقتدارِ وقت کی طرف سے آرہی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آج سے ۳۸ر سال پہلے نہ معلوم اللہ کی طرف سے الہام یا آپ کی دوراندیشی تھی کہ آپ نے اس وقت ہی ''فلاحِ دارین'' کے نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، حساب، ابتدائی سائنس اور علم معاشرت اور انگریزی کو داخل فرما کر اس کو ایسا بنا دیا تھا کہ آج ۳۸ر سال کے بعد جو مشورے جامعات اور دارالعلوم کے لیے ملک اور بیرونِ ملک میں دیے جارہے ہیں، وہ الحمدللہ! یہاں پہلے سے نافذ تھے، یہ مضامین جہاں دینی طلبہ کے لیے بڑی افادیت کا پہلو لیے ہوئے تھے وہیں آج کے ملکی اعتراض اور سوچ کے لیے وقایہ تھے، کسی کی زبان اس قوم کو دنیوی علوم سے بالکل جاہل نہیں کہہ سکتی تھی، جامعات کے لیے یہ ایک اعلیٰ، کامیاب اور مفید نصاب تھا۔

آج بعض ہندوستانی ریاستوں میں حکومت مدرسہ بورڈ بنا کر اُنہیں مضامین کو نصاب میں داخل کرنے پر زور دے رہی ہے اور وہی مدارس نظر بد سے محفوظ سمجھے جارہے ہیں جن میں دینی علوم کے ساتھ یہ دنیاوی مضامین اور کچھ صنعتی تعلیم بھی دی جارہی ہے۔

آپ نے کمپیوٹر کی تجویز بھی پیش کی تھی، خیاطی اور الیکٹرانک تعلیم بھی جاری کی تھی۔

نیز ہفتے میں بعض اہم مضامین جو کسی جگہ یہاں کے مدارس میں نہیں تھے اور نہ اب ہیں، الغزو الفکری، مقارنۃ الادیان، توحید، علوم القرآن وغیرہ جاری کئے؛ بل کہ مجھے یاد ہے کہ عرب

مما لک میں جو ایک سنجیدہ طبقہ ٹی وی وغیرہ کے زندگی اور تمدن میں نفوذ کو دیکھ کر اس کو اسلامی بنانے کی کوشش میں مصروف ہے؛ تا کہ اس کا بُرا پہلو نکال کر اس کو کس طرح اسلام کی تعلیمات کے فروغ اور دوسروں تک اس کی تبلیغ کے لیے بطور ذریعہ کے استعمال کیا جا سکتا ہے، آپ نے مدینہ سے آنے والے ایک فلاحی فاضل کے ذریعہ طلبہ کو اس کے طریقۂ کار کو سمجھانے کے لیے مقرر فرمایا تھا؛ مگر لوگ اس مصلحت کو نہ سمجھے اور داخلی تنقید نے اس سلسلہ کو زیادہ نہ چلنے دیا۔

آج رجسٹریشن کتنا ضروری ہو گیا ہے، سب اب اس کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں، کوئی وقف بورڈ کے حوالہ کیا جا رہا ہے، کوئی رجسٹریشن کی دوڑ دھوپ میں ہے، کوئی ویلفیئر بنانے میں لگا ہوا ہے، آپ کی خداداد بصیرت نے اس کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

آپ نے ایک کھیپ مدینہ بھیج کر تیار کرائی تھی جو آج مدرسہ کی جان بنی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ادارے کی نیک نامی ہے۔ فنِ قراءت پر وہ توجہ دی جو آج ''فلاحِ دارین'' کا طرۂ امتیاز ہے۔ دنیاوی مضامین کی تعلیم چند سال سے اس وجہ سے نصاب سے یہاں خارج کرنی پڑی کہ ان مضامین کو صحیح طور پر پڑھانے والے اساتذہ مہیا نہیں تھے، کاش کہ زیادہ خرچ کر کے ان کو مہیا کر لیا جاتا تو آج ان مضامین سے محرومی نہ ہوتی''۔

(گلدستۂ محبت: ۶۷)

طلبہ کی خیر خواہی اور اساتذہ کے ساتھ حسن سلوک:

جو طلبہ ذہین اور باصلاحیت ہوتے ان کی خصوصی فکر کرتے تا کہ آئندہ یہ کام کے افراد بنیں، ان کی صلاحیتیں کھانے پینے، گھومنے پھرنے اور دوستوں میں ضائع نہ ہو جائیں، ان کو ضروری شروحات و متعلقات اور مناسب کتابوں کی طرف متوجہ کرتے اور اچھی کارکردگی پر تحسین فرماتے اور ترغیب دیتے رہتے، اسلاف کے واقعات اور ان کی قربانیوں کو پیش فرماتے رہتے۔

اساتذۂ کرام کے ساتھ بھی عجیب حسن سلوک فرماتے، ہمارے اداروں میں ابتدائی سال میں کتابوں کی تقسیم کے وقت آپس میں کچھ رنجشیں پیش آجانا عام ہے، مگر آپ ہر استاذ کی صلاحیت اور اس کے کسی فن میں ذاتی ذوق وشوق کے مطابق ان کو اس فن کی کتاب دیتے اور بعضوں کی ہمت افزائی فرما کر تعریف کر کے آگے بڑھاتے، کبھی طلبہ کے سامنے کسی استاذ کی کوئی کمزوری بیان نہیں کرتے تھے، بل کہ اساتذہ کی قدر، ان کی خدمت، ان سے علمی و روحانی تعلق کی ترغیب دیتے اور کسی میں یہ خوبی دیکھتے تو تعریف کرتے۔

شعبۂ ادب عربی کے سلسلہ میں حضرت والا کے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ سے گہرے روابط رہے۔ حضرت مرحوم ہی کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت الاستاذ مولانا نور محمد صاحب مدظلہ العالی کی خدمات مدرسہ کو حاصل رہیں، جن کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ وشجرۂ پُر بہار حضرت مولانا محمد اقبال صاحب دیولوی کی شکل میں مدرسہ کو فراہم ہوئے جو اس وقت سرگرم عمل ہیں۔ اس نسبت سے حضرت مولانا وحید الزماں کو حضرت والا مدعو فرماتے اور اس شعبہ کی ترقیات کے لیے مشورہ فرماتے۔ اس سلسلہ کا ایک معائنہ ملاحظہ فرمایئے:

''دار العلوم فلاح دارین'' واقع ترکیسر (گجرات) ان چیدہ معاہد اسلامیہ میں ہے جنہوں نے بہت ہی مختصر عرصہ میں اپنے معیار تعلیم اور نظام تربیت میں خصوصی مقام حاصل کیا ہے۔ احقر کو پہلی بار اس باعظمت علمی ادارہ میں ۲۰ / جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۱ / جولائی ۱۹۷۴ء حاضری کا موقع ملا۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ سے مختلف مجلسوں میں مختصر اور طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ درس گاہوں میں جانے اور طلبہ سے مختلف موضوعات پر سوالات کا بھی اتفاق ہوا۔ بفضل اللہ میں نے یہاں وہ سب کچھ پایا جو میرے دل کی آواز تھی۔ درس گاہوں کا نظم، اساتذہ کی تعلیمی دلچسپی اور طلبہ پر غیر معمولی محنت، چھوٹے بچوں کی تعلیم کا

معقول انتظام اوران کی خصوصی تربیت، صفائی، ستھرائی، پابندی اوقات، مدرسین واساتذہ کا باہم ربط وتعلق یہ سب خصوصیات ہیں جو عام طور پر کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

(حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ)

مدارس کے نصاب تعلیم پر حضرت والا کی برابر نظر رہی، مختلف مدارس اسلامیۂ ہند و بیرونِ ہند کے نصاب طلب فرماتے اور حالات حاضرہ سے اپنے نصابِ تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش فرماتے۔

تعلیم وتربیت:

جہاں ملک بھر کے اہلِ علم ودانش وروں کو مدرسہ کی زیارت کی دعوت دیتے تا کہ طلبا میں تعلیم وتربیت کا ذوق وشوق پروان چڑھے وہیں وقتاً فوقتاً خود بھی مجلسِ دعوت وارشاد منعقد فرماتے۔ بچوں کو علم وعمل کی لائن سے آگے بڑھنے کی دعوت دیتے اورانداز ایسا مؤثر ہوتا کہ سب کی بیٹری چارج فرمادیتے۔آپ کے بیانات کے بعد طلبا کو ایک نیا حوصلہ ملتا، جس سے سرگرم عمل رہتے۔ وقت کی پابندی کی تلقین فرماتے، نمازوں میں وقت سے پہلے خود تشریف لاتے اور طلبا آپ کی ایک آواز پر بستر چھوڑ کر مسجد کی راہ لیتے۔اس سلسلہ میں ان لوگوں پر آپ کی کڑی نظر رہتی جو نمازوں میں سست تھے،ان کا فرداً فرداً جائزہ لیتے۔

اساتذہ کی عظمت:

ایک عادت شریفہ آپ کی جو اس وقت نایاب نہ سہی تو کمیاب ضرور ہے، وہ طلبہ کرام کے دل میں اساتذہ کی عظمت بٹھانا۔ جب کبھی کسی استاذ کی غیر حاضری پر طلبہ کو دفتر میں طلب فرماتے اوران کو کتاب سے متعلق معلومات فراہم فرماتے، وہیں استاذ سے متعلق ان کا علمی مقام بیان فرماتے اور اس انداز سے بیان فرماتے کہ طلبہ کے قلوب میں ان کی عظمت

بٹھاتے، ان سے استفادہ کا شوق پیدا فرماتے۔ساتھ ہی ملکی، ریاستی وعلاقائی تعصب کوختم فرما کرطلبہ واساتذہ میں شیروشکربن کررہنے کا ذہن تیارفرماتے، گوآپ کے دوراہتمام میں مختلف المشرب اساتذہ موجود تھےاوران کی طرف سے کبھی کچھ نہ کچھ ناگوار باتیں پیش آجایا کرتی تھیں؛مگر ہر وقت ادارہ،طلبہ وعلم وفن سے متعلق ہونے والے فائدے کومقدم رکھتے ہوئے ان چیزوں سے متعلق فاعفوا واصفحوا ہی ہمیشہ مدنظر رکھتے۔نہ کسی صاحب فن استاذ کے انتخاب میں اس کو حائل ہونے دیا۔دریا دلی اوروسعت ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے اساتذہ کی قبولیت ومقبولیت سے آپ کو بے حد خوشی ہوتی،اس کولوگوں میں بیان فرماتے اورخود بھی عند الناس اساتذہ کی قبولیت میں اضافہ فرماتے۔ ؎

ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہوں جسے

(گلدستۂ محبت:۲۲۷)

اہتمام کانٹوں بھرا تاج ہے:

خطیب الامت حضرت مولانا سید ابراراحمد صاحب دہلویؒ فرماتے تھے کہ:

’’اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اہتمام درحقیقت ’’کانٹوں بھرا تاج‘‘ ہےاور مدرسوں کی دنیا میں مدرس کا کام تو یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرے اور درس دے اور خدام کی شان یہ ہے کہ ان کے اوقات فکس ہیں؛ مگر اہتمام ایک ’’بلا‘‘ ہے اور’’بلا‘‘ کے دو معنی ہیں جیسا کہ آیت کریمہ’’وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم‘‘میں بلا کے دومعنی بیان کیے گئے ہیں’’ابتلا‘‘ اور’’انعام‘‘ تواہتمام میں ’’بلا‘‘یعنی’’نعمت‘‘ بھی ہےاور’’زحمت‘‘ بھی ہے،وہ کانٹوں بھرا تاج ہے،رات دو بجے بھی کوئی معاملہ یا کوئی مسئلہ پیش آئےتومہتمم کو جگایا جاتا ہے کہ مدرسہ میں یہ سانحہ رونما ہوا،مدرسہ میں تعلیم ہورہی ہوتب اور مدرسہ میں چھٹیاں ہوں تب بھی اس پر

نظر، اپنے اس کو تلاش کرتے ہیں اور پرایا کوئی آجائے تو وہ بھی اسی کو تلاش کرتا ہے تو جتنی جہتیں ہیں ہر جہت سے اس کی ذمے داری ہوتی ہے، یہ جو مشہور مصرعہ ہے کہ......

ہر درد کی دوا ہے صل علی محمد

اسی طرح مدرسوں کی دنیا میں ہر درد کی دوا گویا مہتمم ہی ہوتا ہے۔''

فن پڑھانے والے اساتذہ کو ترجیح:

آپ نے اپنے دور اہتمام میں اس بات کا بھرپور اہتمام کیا کہ ''دارالعلوم فلاح دارین'' کی تدریس کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو صرف کتاب نہیں بل کہ ''فن'' پڑھائیں اور اس کے لیے آپ نے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کا سفر کیا اور ''فن'' پڑھانے والے اساتذہ کی ایک اچھی خاصی کھیپ ''دارالعلوم فلاح دارین'' میں لا کھڑی کی اور پھر کیا تھا، مدرسہ تعلیمی میدان میں دن بدن دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا اور صرف گجرات ہی کے اداروں میں اس نے اپنا ایک خاص مقام پیدا نہیں کیا بل کہ پورے ہندوستان کے دینی مدارس میں اس نے تعلیمی و تربیتی اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔

فلاحِ دارین میں اکابرین کی آمد میمون:

آپ نے اپنے دور اہتمام میں اس کا بھی خوب اہتمام کیا کہ ہند و بیرون ہند سے چنیدہ صاحب علم، صاحبِ تقویٰ اور علمی میدان کے ماہرین کو خصوصی دعوت دے کر ''دار العلوم فلاح دارین'' میں وقتاً فوقتاً بلایا اور اس طرح طلبا کو ان کی زیارت و ملاقات اور ان کے علم اور ان کے تجربات سے نیز ان کی علمی و اصلاحی باتوں سے استفادے کا موقع بھی خوب فراہم کیا۔

نصاب میں انگریزی کی شمولیت ایک انقلابی کارنامہ:

حضرت دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد سعید صاحب راندیریؒ (سابق مہتمم جامعہ حسینیہ راندیر، ضلع

سورت) ایک مرتبہ دارالعلوم فلاح دارین میں تشریف لائے، ہمارے گجرات کے کسی مدرسہ میں انگریزی داخل نصاب نہیں تھی اور ہم نے اسے نصاب میں داخل کیا تھا، اس زمانہ میں ہمارے بعض علما کو اشکال تھا کہ انہوں نے ایک نئی چیز مدرسہ میں شروع کی، چناں چہ وہ تشریف لائے اور درس گاہ سے باہر کھڑے ہوکر طلبہ کو بغور دیکھتے رہے، میں سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں حضرت کیا دیکھ رہے ہیں؟ پھر جب مولانا اوپر دفتر میں تشریف لائے تو حضرت نے خود ہی فرمایا کہ مولوی صاحب! میں ہر درس گاہ کے پاس کھڑے ہوکر طلبا کو بغور دیکھ رہا تھا تو آپ کے دل میں یہ بات آئی ہوگی کہ یہ کیا تلاش کر رہا ہے، میں نے کہا حضرت یقیناً یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی، پھر آپ نے فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ انگریزی زبان جو یہاں شروع ہوئی ہے تو کہیں انگریزی ثقافت تو طلبہ میں نہیں آرہی ہے، میں ان کے بالوں کی کٹ دیکھ رہا تھا کہ کسی طالب علم کے بالوں پر انگریزی ٹائپ کی کٹ تو نہیں ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ! مجھے ایک بھی طالب علم اس وقت ایسا نظر نہیں آیا اور پھر مجھ سے فرمایا کہ اس پر قائم رہو، زبان سکھلاؤ، لیکن انگریزی ثقافت کو داخل مت ہونے دو۔''

(صدائے دل: ج:۳، ص:۱۶۵، ۱۶۶)

آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انگلینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک میں جہاں کی اصل زبان انگریزی ہے فلاح دارین کے طلبا بلا تکلف انگریزی زبان میں بیان کرتے ہیں اور نوجوانوں کے دینی سوالات کے جوابات بھی دیتے ہیں اور اس طرح نوجوانوں کی علمی پیاس بجھا رہے ہیں، یہ سب حضرت دامت برکاتہم کی دور اندیشی کا ثمرہ ہے۔

ذاتی کتب خانہ:

حضرت دامت برکاتہم کا ذاتی کتب خانہ بھی اچھا خاصہ ہے، جس میں عربی، اردو اور

دوسری کچھ زبانوں کی کتابیں موجود ہیں اور اس کے ساتھ مخطوطات بھی ہیں اور چند کتابیں تو ایسی نادر اور قیمتی ہیں کہ وہ گجرات کے مدارس عربیہ کے کتب خانوں میں بھی نہیں ہیں، حضرت دامت برکاتہم العالیہ کا یہ معمول اور کوشش اور شوق رہا ہے کہ اپنے لیے اچھی کتابیں خریدی جائیں اور شاید اس کے پیچھے حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب پشاوریؒ کی حضرت کو نوجوانی میں کی گئی نصیحت بھی کارفرما رہی ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے حضرت دامت برکاتہم العالیہ سے فرمایا تھا کہ:

''کسی نائی کو دیکھا ہے کہ دوسرے کے اوزار لے کر حجامت بناتا ہو؟ عرض کیا نہیں، اس کے بعد فرمایا تو پھر مولوی کیوں دوسروں کی کتابیں لے کر پڑھتا ہے اور تاکید فرمائی کہ فقہ، ادب، حدیث شریف اور تفسیر کی ضروری کتابیں خریدنے کی عادت رکھو تاکہ آہستہ آہستہ کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہوسکے۔

حضرت دامت برکاتہم آگے لکھتے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ کی اس نصیحت کا اثر ہوا اور پھر کتابیں خریدنا اور انہیں محفوظ کرنا شروع کیا، جس سے مجھے مدرسہ میں اور گھر پر بہت نفع پہنچا۔'' (رشد وہدایت کے منار: ص ۵۸)

بزرگوں کی صحبت کی تاکید:

حضرت مفکر ملتؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''بزرگوں کی صحبت میں رہنا اور ان سے خط وکتابت کرنا ہر وقت بہت ضروری ہے اور فرمایا کہ جب آدمی اپنے آپ کو کتابوں کے لیے وقف کرتا ہے اور اکابر کی کتابیں دیکھتا ہے اور پھر اللہ والوں سے تعلق پیدا کرتا ہے تو اس میں صلاحیت اور صلاح دونوں باتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو ہے دماغ کو روشن کرنا، یہ کتابوں سے ہوگا، آپ پڑھیں گے تو آپ کا دماغ روشن

ہوگا، معلومات کا ذخیرہ بڑھے گا اور ایک ہے دل کا روشن ہونا، دل کی روشنی اللہ والوں کے پاس ملے گی، حضرات صحابۂ کرام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ دونوں چیزیں ملتی تھیں، آپ کی زبان مبارک سے جو علم ملتا تھا اس سے ان کے دماغ روشن ہوتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے ان کے قلوب پاکیزہ ہوتے تھے۔"

اور حضرت والا علماء اور طلباء سے یہ بات بھی فرمایا کرتے ہیں کہ:

"حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی تقریروں میں ہمیشہ ایک بات یہ فرماتے تھے کہ بھائی دیکھو! اگر آپ نے کپڑوں کے صندوق میں چھوٹی چھوٹی گولیاں رکھ دیں تو جب ایک ہفتہ کے بعد صندوق کھولیں گے تو ان کپڑوں میں سے ان کی بو آئے گی اور اگر آپ نے گلاب کے پھول ان میں رکھے ہیں تو گلاب کی خوشبو ان میں سے آئے گی، حالاں کہ کپڑوں میں خوشبو نہیں تھی لیکن چوں کہ وہ پھول آپ نے ان میں رکھے اس کی وجہ سے ان میں گلاب کی خوشبو آنے لگی، یہ صرف صحبت کا اثر ہے اور طلبہ سے ہمیشہ فرماتے تھے کہ صحبت صالحین اختیار کرو طلبہ اور علما کو اس کی شدید ضرورت ہے۔"

اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"علم کی ضرورت یقیناً پہلے ہے، لیکن صرف علم کافی نہیں، چوں کہ حضرات صحابۂ کرام کو علم کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لیے ان کے علم میں ایک قسم کا جلا اور روشنی پیدا ہوجاتی تھی، آج بہت سے لوگوں کے پاس علم ہے، لیکن وہ علم ان کے لیے فتنہ کا باعث بنا ہوا ہے، کہیں تو آپس میں تقابل ہوتا ہے، کہیں کسی مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں، کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں مناظرہ ہوتا ہے، اس وقت جتنی بھی گڑبڑ اہل علم کے حلقوں میں ہورہی ہے، یہ سب صالحین کی صحبت نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔"

السوال نصف العلم:

آپ کی عادت مبارکہ میں سے ایک عادت اپنے بڑوں اور اہل فن سے علمی سوالات دریافت کرنا رہا ہے، اس کی تین مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) آپ نے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ سے ایک مجلس میں پوچھا کہ احمد امین، طہٰ حسین اور منفلوطی کی کتابیں پڑھتا ہوں، مگر اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا، اس کا کیا علاج ہے؟ فرمایا پڑھتے رہو آہستہ آہستہ مناسبت پیدا ہوگی اور لغات جدیدہ سے مدد لینے کی ہدایت فرمائی، فرمایا اگر ستر اسی فی صد مفہوم سمجھ میں آجائے تب بھی کافی ہے۔

(رشد وہدایت کے منار: ص ۱۳۷)

(۲) حضرت لکھتے ہیں کہ:

''میں نے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ سے سوال کیا کہ حضرت! علم حدیث میں مہارت کے لیے کتنے سال درکار ہیں؟ حضرت نے خاص انداز سے میری طرف دیکھا اور فرمایا ''مولوی صاحب! آپ مہارت کی بات کرتے ہیں ہم نے اپنی زندگی کھپا دی تب کچھ شد بد پیدا ہوئی ہے اور اب کوئی مخطوطہ دیکھتا ہوں تو کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہاں یہ لفظ نہیں ہوگا پھر جب دوسرے مخطوطے سے تقابل ہوتا ہے تو صحیح لفظ مل جاتا ہے۔'' (رشد وہدایت کے منار: ص ۲۰۲)

(۳) ''حضرت مولانا سید معراج الحق صاحب دیوبندیؒ سے دریافت کیا کہ حضرت! اب اس زمانے میں پہلے جیسی استعداد والے فضلا کیوں تیار نہیں ہوتے؟ فرمایا کہ پہلے زمانے میں ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں اور فقہ، اصول، ادب، فلسفہ اور منطق کی کتابیں محنت سے پڑھتے تھے اور اس میں اتنا وقت لگتا تھا کہ ان کی ذہنی صلاحیت اور قوت اخذ پختہ

ہوجاتی تھی، اس کے بعد ہدایہ آخرین، حسامی، بیضاوی اور دیگر علیا کی کتب سمجھنا ان کے لیے آسان ہوتا تھا، اب جو طلبا کم عمری میں اوپر کے درجے میں پہنچ جاتے ہیں ان کی ذہنی صلاحیت ان اونچی کتابوں کے دلائل سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہوتی، پھر فرمایا کہ ''ہدایہ آخرین'' میں مجھے اس کا خوب تجربہ ہورہا ہے۔'' (حوالہ بالا: ص۸۶)

(۴) فرماتے ہیں کہ:

''میں نے حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت! حدیث شریف کے قابل اساتذہ نہیں مل رہے، فرمایا جی ہاں! اب ہم انور شاہ اور شبیر احمد عثمانیؒ کو قبر سے نہیں لاسکتے، اب جو موجود ہیں انہی کو بنانا پڑے گا اور فرمایا کہ ''دوسرے اداروں میں جو اچھے مدرس کام کرتے ہیں اگر وہ مخلص ہیں تو اپنی جگہ چھوڑیں گے نہیں اور جو چھوڑیں گے تو کوئی نہ کوئی بات ہوگی، اس لیے نوجوان باصلاحیت اساتذہ کو ہی تربیت دے کر آگے بڑھانا ہوگا۔''

حضرت دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی اس رائے کی بعد میں بڑی قدر ہوئی۔ (رشد و ہدایت کے منار: ص ۱۵۷)

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں حضرت کے کچھ اصول و آداب

تھوڑے افراد پیدا کریں؛ لیکن ان کے دل میں کچھ تمنا ہو، کچھ علم رکھتے ہوں، وہ سوز لے کر دعوت کے کام کے لیے دنیا میں جائیں، تھوڑے جائیں، پانچ جائیں، دس جائیں تو انشاءاللہ اس سے امت کا کام بنے گا۔

طالب علم کو کتابیں خریدنے کا عادی بناؤ:

طالب علم ہو اور اس کے پاس کتاب نہ ہو، مانگ مانگ کر پڑھے یہ بڑے تعجب کی بات ہے، ہر طالب علم میں ذوق پیدا کرو کہ اپنی کتاب خریدے، اگر اس کے پاس پیسہ نہیں

ہے اور اللہ نے آپ کو دیئے ہیں تو آپ دے دیں، اگر آپ خود نہیں دیتے ہیں تو صاحب خیر آپ کے پاس گاؤں میں ہیں، ان سے کہو کہ بھائی! اپنی رقم بچہ پر خرچ کرو۔

المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ومفردات کا تقابل:

اب ہمارے یہاں مدرسوں میں مفردات امام راغب ہوتی ہے، جلالین یا ترجمۂ قرآن پڑھانے والے کے پاس مفردات راغب اصفہانی ہونی چاہیے، ابھی شام سے ایک عالم نے ''المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم'' مفردات ہی کے طرز کی بڑی اچھی کتاب چھاپی ہے، میں نے دونوں کا تقابل کیا، مفردات کو کھول کر دیکھا اور اس المعجم کو بھی میں نے دیکھا تو محسوس ہوا کہ المعجم میں کچھ تحقیقات زیادہ ہیں، اس میں عربی الفاظ کے بارے میں استشہادا قدیم عربی شعرا کے اشعار بھی کبھی نقل کرتے ہیں، اگر ہم نہ منگوائیں گے تو پھر ہم مفردات ہی دیکھتے رہیں گے، ہم اس کو بھی دیکھیں، ہمیں فائدہ ہوگا، تجزیہ کی صلاحیت پیدا ہوگی، علم جامد چیز نہیں ہے، اس میں تھوڑی ترقی ہوتی ہے، جس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے وہ نت نئے افق تلاش کرلیتا ہے، جتنی کتابیں ہم زیادہ پڑھیں گے، ہم کو اس مسئلہ کی تفہیم میں سہولت ہوگی۔

''النحو الواضح'' کا تجزیہ:

ایک ''النحو الواضح للثانوية'' ہے اور ایک ''النحو الواضح للابتدائية'' ہے، ثانویہ کو آپ دیکھیں گے تو ہدایۃ النحو کے تمام مسائل اس میں ملیں گے؛ لیکن اس میں خاص بات یہ ہے کہ پہلے امثلہ ہیں، چھ سات مثالیں دیتے ہیں، امثلہ کے بعد ''البحث''، بحث کے بعد ''القاعدة'' اور وہ ڈیڑھ سطر کا، کوشش کرتے ہیں کہ لمبا قاعدہ نہ ہو، تاکہ طالب علم کو یاد کرنے میں سہولت ہو، جملہ اسمیہ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے چھوٹا سا جملہ لکھ دیا ''كل جملة ابتدأت باسم فهي جملة اسمية'' چھوٹا سا جملہ تاکہ طالب علم یاد کرلیں، تو جب تک زندہ

رہے گا اس کو یہ جملہ یاد رہے گا ''و کل جملة ابتدأت بفعل فهي جملة فعلية'' یہ چھوٹے چھوٹے جملے طالب علم یاد کر سکتے ہیں اوران کو یاد کرانا چاہیے، اصل میں ہم لوگ اس کو یاد نہیں کراتے تو پھر وہ چیز محفوظ نہیں رہتی، پھر قاعدہ کے بعد ''النحو الواضح'' میں تمرینات لکھی ہیں، اگر آپ ''ہدایۃ النحو'' پڑھا رہے ہیں، آپ ''کافیہ'' پڑھا رہے ہیں تو پڑھائیے۔

طلبہ کے فارغ اوقات بھی ضائع نہ ہونے چاہیے:

ہمارے نونہالوں کی شروع ہی سے ان فکری بنیادوں پر پرورش کی جائے تا کہ بڑے ہو کر ان کے دلوں میں امت کے لیے سوز و اضطراب پیدا ہو، جب ترکیسر میں چھٹیاں ہوتی تھیں تو جو ذہین بچے تھے ان کو بلا کر کہا جاتا تھا کہ کل سے چھٹی ہو رہی ہے، آپ کتب خانے میں جائیں اور فلاں فلاں کتابیں لے آئیں اور چھٹی میں اس کا اردو ترجمہ کر کے لائیں تب آپ کا داخلہ ہوگا اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ چھٹیوں میں کتابوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ منسلک رہیں گے۔

تدریس کا ایک نادر اسلوب:

ہم دیوبند میں تھے، مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سبق میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کی ایک عادت تھی کہ بولتے بھائی! متوجہ ہو جاؤ، میں تمہیں ایک ایسی بات سناتا ہوں جو تمہیں کسی شرح میں نظر نہیں آئے گی، طلبہ کو متوجہ کرنے کے لیے ایسا کرتے تھے تو انہوں نے ایک مرتبہ اپنے انداز میں ایسا کہا تو ایک طالب علم نے کہا حضرت یہ مرقات کے حاشیے پر لکھا ہوا ہے تو کہا چپ بیٹھ تجھے کس نے کہا بولنے کو، بھائی ایک اسلوب ہے ذہن کو متوجہ کرنے کا کہ میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ آپ کو کہیں نہیں ملے گی تا کہ طلبہ متوجہ ہو جائیں۔

صلاحیت سازی کے تین اہم گر:

بھائیو! محنت سے پڑھو، شیخ عبدالرحمن باشا نے تین باتیں ذکر کی ہیں جن کو میں نے ہر

مدرسہ میں ذکر کیا کہ تین چیزیں ہر طالب علم کے لیے ضروری ہیں، فرمایا: **لکل طالب ثلاث: الأول الاستعداد، والثاني الاستماع، والثالث المذاکرۃ.** پہلا کام یہ ہے کہ مطالعہ کر کے دوسرے دن کے سبق کے لیے تیاری کرنا، دوسرا کام یہ ہے کہ استاذ کا سبق دھیان سے سنے، کوئی گورنر بھی درس گاہ کے سامنے سے گزر جائے تو اس کی طرف توجہ نہ دے، یہ ہے ''الاستماع'' جس کے معنی ہیں غور سے سننا، سمع کے معنی سننا ہے، اور استماع کے معنی بغور سننا آتا ہے، **وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ** (سورۂ اعراف: ۲۰۴) ''**زیادۃ اللفظ تدل علی زیادۃ المعنی**''، یہ عربی کا مسلّم اصول ہے، اور تیسری چیز ہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مذاکرہ کرنا، یہی تین چیزیں حضرت تھانویؒ نے بھی لکھی ہیں، حضرت فرماتے ہیں کہ جو طالب علم یہ تین چیزیں کرے گا میں گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ اچھا عالم بن سکے گا۔

اساتذہ شفقت کے ساتھ ذہن سازی کریں:

میرے دوستو! طلبا یوں نہیں بنا کرتے، طلبا بنتے ہیں اساتذہ کی پوری توجہ سے، اساتذہ اگر دل لگا کر طالب علم کے پیچھے پڑ جائیں اور ہر جماعت میں اگر ۲۵ یا ۳۰/ طالب علم ہیں تو ہر ایک کا جائزہ لیں کہ اس کی ذہنی سطح کیسی ہے؟ اس کے حالات کیسے ہیں، یہ کس علاقہ کا ہے، گھر کی پوزیشن کیا ہے؟ اور یہ طالب علم پیچھے کیوں رہ رہا ہے؟ اس کے بات کیوں سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟ کس پہلو میں یہ کمزور ہے اور اس کے پیچھے وہ مسلسل محنت کرتے رہیں، اس کے بارے میں مشورہ کریں، دعائیں کریں تو تجربہ ہمارا بتا رہا ہے کہ طالب علم پھر بن جاتا ہے۔

اساتذہ ان کو اپنے کمرے میں بلا کر خارجی کتابیں پڑھاتے ہیں، ان کا ذہن مطالعہ کا بناتے ہیں تو پھر وہ طالب علم کام کے انسان بن گئے ہیں اور اچھے مدرس بنے ہیں، انہوں نے

قوم کی خدمت کی، وہ جہاں گئے، جہاں رہے نافع وفائدہ مند بن کر رہے، یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر طالب علم معمولی سی غلطی کرتا ہے، ٹھیک سے نہیں سناتا اور استاذ نے اس کو ایسا جملہ کہہ دیا کہ بھائی تم کو کس نے کہا تھا کہ تم مدرسے میں آکر داخل ہو جاؤ، تم فلانی جگہ جا کر بیگن کیوں نہیں بیچتے؟ میں نے خود یہ جملہ سنا ہے، یہ بہت خطرناک بات ہے، اس سے طالب علم بد دل ہو جاتا ہے، **ایک طالب علم بیچارہ علم حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آیا ہے، ہم نے تو یہ جملہ کہہ کر اس کا ضمیر چکنا چور کر دیا، وہ تو دل برداشتہ ہو گیا اور اس میں کم ہمتی، احساس کمتری پیدا ہو گئی** ۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

سیدنا امام شافعیؒ کی جگرسوزی:

استاذ کو تو یہ چاہیے تھا کہ اس کو ہمت دلاتے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے، اس کو اپنے قریب بلاتے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے، اسے کہتے کہ بیٹا! کیا بات سمجھ میں نہیں آتی اور کیوں نہیں آتی؟ آبیٹھ میرے پاس!

میں نے سیدنا امام شافعی علیہ الرحمۃ کا قصہ کسی کتاب میں پڑھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سیدنا امام شافعیؒ کے یہاں مجلس ہو رہی تھی، مسئلہ کی تفہیم فرما رہے تھے، بہت سے طلبہ حضرت کے سامنے تھے، لیکن ایک بیچارہ کمزور ذہن کا تھا (جیسے ہمارے یہاں بہت سے بچے ہوتے ہیں) اور وہ سمجھ ہی نہیں رہا تھا، امام صاحب بار بار ایک مسئلہ کو دہرا رہے تھے، عبارت تو ایسی لکھی ہے "**كَرَّرَ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَمْ يَفْهَمْهُ**" ستر مرتبہ وہ نہیں سمجھا تو وہ شرمندہ ہوا کہ امام صاحب اتنا سمجھا رہے ہیں اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا

ہے ''فَخَرَجَ مِنَ الْغُرْفَةِ خَجِلًا'' شرمندگی کے مارے وہ کمرے سے نکل گیا، ''فَتَبِعَهُ الشَّافِعِيُّ رحمه الله وَ أَجْلَسَهُ فِيْ الْغُرْفَةِ الْأُخْرٰی وَ كَرَّرَ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ حَتّٰی فَهِمَهُ'' عجیب بات ہے، امام شافعیؒ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور اس کے پیچھے پیچھے گئے اور اس کو دوسرے کمرے میں بٹھایا اور فرمایا کہ مایوس ہو کر جانے کی ضرورت نہیں، بیٹھ جاؤ، پھر میں سمجھاتا ہوں، اس کو کہتے ہیں جگر کو پاش پاش کرنا، طالب علم کے لیے پتہ مارنا، طالب علم کیوں نہیں بنتے، اگر محنت ہوگی تو انشاء اللہ بنیں گے۔

ہمیشہ جب استاذ کسی طالب علم کے پیچھے اس طرح محبت و شفقت سے اور اپنے خونِ جگر کو پگھلا کر محنت کرتا ہے تو طالب علم ضرور بنتا ہے، یہ بات غلط ہے کہ طلبا غلط آرہے ہیں، اچھی صلاحیت کے طلبا اب بھی ہمارے مدارس میں ہیں، ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، انہیں حکمت عملی کے ساتھ مہمیز لگانے کی فکر کرنی ہے، اس لیے ہمیں اس پر غور کرنا ہے اور ہم باتیں بہت کر چکے ہیں، بہت تجویزیں ہم نے پاس کر لی ہیں، اب وقت آچکا ہے کہ ہم عملی زندگی میں قدم رکھیں، قوم ہم کو اتنا پیسہ دے رہی ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں،

میرے دوستو! ہمارا اپنا مطالعہ بہت کمزور ہے، ہماری اپنی زبان درست نہیں ہے تو ہمارے طلبا کی زبان کیسے درست ہوگی؟ مدرسہ میں پڑھانے والے استاذ کبھی جب تقریر کرتے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بھائی یہ استاذ ہے اور اس کو اردو زبان میں مذکر و مؤنث کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہو کہ یہ لفظ اردو میں مذکر ہے یا مؤنث، چوں کہ ہمیں اردو زبان سے مناسبت نہیں ہے اور مناسبت اس لیے نہیں ہے کہ ہم اردو کتابیں نہیں پڑھ رہے ہیں، ہمارا مطالعہ ہی نہیں ہے، ہمیں جو کتابیں مدرسہ میں دی گئی ہیں ان کا حاشیہ اور جو مشہور شرح ہے اس کو دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ بھائی ٹھیک ہے ہم پڑھا دیں گے، اپنا فریضہ گویا

پورا ہو گیا، حالاں کہ یہ بات ٹھیک نہیں، ہمیں اوپر کی کتابیں نیچے کی کتابوں کے لیے دیکھنی چاہیے، تاکہ ہم صحیح رہنمائی کریں، ہمیں موجودہ دور میں جو رسائل نکلتے ہیں، جو نئی نئی کتابیں چھپتی ہیں ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔

طلبا پر ہماری کمزوریاں اثر انداز ہوں گی:

میرے دوستو! نئی نئی چیز جو چھپی ہوئی ہے، اگر ہمارے اساتذہ اس سے واقف نہیں ہیں تو وہ طالب علم کو نہیں بنا سکتے، کیوں کہ کنویں میں جو پانی ہوگا وہی باہر آئے گا، برتن سے وہی ٹپکے گا جو اس میں ہوگا، لیکن اگر کنواں خالی ہے تو اس سے کچھ نہیں نکلے گا، ہم اگر کتابوں کے نام سے واقف نہیں ہیں اور اس کا مطالعہ نہیں کرتے، تو ہماری زبان بھی درست نہیں ہو سکتی اور ہم طلبا کی زبان بھی درست نہیں کر سکتے، یہ یقینی بات ہے کہ جتنی کمزوریاں ہمارے اندر ہوں گی وہ کمزوریاں ہمارے طالب علم میں بھی ہوں گی۔

اساتذہ بیدار مغز ہوں:

تو معلوم ہوا کہ اگر اساتذہ بیدار مغز ہیں اور وہ طالب علم کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور ان کی ہر ہر لفظ پر گرفت کرتے ہیں تو ان کی زبان درست ہوتی ہے، ان کا املا بھی درست ہو جاتا ہے اور وہ کچھ بن کر قوم کے خادم بن جاتے ہیں۔ میں ابھی کئی مدرسوں میں گیا اور میں نے اساتذۂ کرام سے درخواست کی کہ دیکھو، میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے اردو اور فارسی کے جو اساتذہ ہیں وہ طلبا کو اردو لکھواتے ہیں تو فرماتے ہیں چلو! لاؤ کاپیاں، اب طلبا کاپی لے کر آئے، انھوں نے دیکھا کہ جو صفحہ ان کو لکھنے کے لیے دیا ہے وہی لکھ لیا ہے تو لال قلم سے صحیح کا نشان لگا دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں دوسری کاپی لاؤ، یہ طریقہ صحیح نہیں، یہ طریقہ بالکل صحیح نہیں ہے، طریقہ یہ ہے کہ اس کے ہر ہر لفظ کو دیکھو کہ اس نے کتابت کی رو سے ٹھیک لکھا ہے، یا

الف کو اس نے ٹیڑھا لکھا ہے، مثلاً ''حامد بازار گیا'' ایک جملہ ہے، اگر حامد کے الف کو اس نے ٹیڑھا لکھا ہے، جیسے ہمارے طلبا کی عادت ہے تو اس کو بتایا جائے کہ الف دنیا میں کہیں ٹیڑھا ہوتا ہے؟ تو نے کتاب میں کیوں ٹیڑھا لکھ دیا۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا انداز:

یہ بات میں نے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ میں دیکھی کہ جتنے بچے ان کے پاس پڑھے ان کا عربی خط بہترین کرا دیا، کیوں کہ طلبا پر انھوں نے محنت کی، قلم پکڑ پکڑ کر سکھایا، خود کو کھپایا، بار بار فرماتے نہیں، ایسا نہیں، صحیح لکھو، موٹا یہاں سے ہوگا، اس کا طریقہ یہ ہے، با قاعدہ دیواری پرچے لکھواتے، تو جب مولانا وحید الزماں طلبا کے خط کو درست کرا سکتے ہیں تو میں اور آپ بھی کرا سکتے ہیں۔ ضرورت ہے محنت کرنے کی اور بنانے کی، تڑپ کی، ہماری کوتاہی یہ ہے، ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم ذرا غلط چل رہے ہیں، جتنی ہماری توجہ طلبا کے لیے درکار ہے وہ توجہ نہیں ہے، یہ میرے تاثرات ہیں، اگر میں غلطی پر ہوں تو آپ مجھے معاف فرمائیں اور میری اصلاح فرمائیں، چوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں!

خارجی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق بھی ضروری ہے:

میرے دوستو! ہمارے علما میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ خارجی کتابیں نہیں پڑھتے، جب کتابیں نہیں پڑھتے تو ان کو اچھی زبان نہیں آسکتی، کبھی بھی نہیں آئے گی، جب تک ہم اچھی کتابیں نہیں پڑھیں گے اچھی زبان بول بھی نہیں پائیں گے، ہم اچھی زبان سمجھ بھی نہیں پائیں گے، ہمارے طلبا کا یہ حال ہے اور ہمارے فضلا کا یہ حال ہے کہ اردو کا ایک شعر ان کی سمجھ میں نہیں آتا، چوں کہ ہم سبق اردو میں پڑھاتے ہیں تو اپنے طور پر یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم تو اردو بہت اچھی جانتے ہیں، حالاں کہ اردو زبان میں بڑی وسعت ہے۔

ذی استعداد استاذ ہی طلبہ کو بنا سکتا ہے:

طلبا کی استعداد وہی عالم بنا سکتا ہے جس کا اپنا علم وسیع ہو اور اس میں سے وہ لے لے کر منتخب کر کے طلبا کو پلاتا ہو اور ان کو مراجع سے واقف کراتا ہو کہ اس کتاب کے سلسلہ میں تم لوگ فلانی کتاب دیکھو، فلانی کتاب دیکھو، استاذ کی معمولی رہنمائی ہی بچے کو حرکت میں لاتی ہے، اس کے ذہن کو کشادہ کرتی ہے، اس میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرتی ہے اور استاذ کی شخصیت ہی متعلم کو زمانہ کے تقاضوں سے واقف کار بناتی ہے۔

فلاحِ دارین ترکیسر کا میرا ایک تجربہ:

میں نے ترکیسر کے زمانہ میں ایک مرتبہ تجربہ کیا تھا کہ جب چھٹی ہوئی تو چہارم اور پنجم کے طلبا کو دفتر میں بلایا، میں نے کہا دیکھئے! آپ گھر جا رہے ہیں اور شعبان اور رمضان دو مہینے کی چھٹی ہے تو جایئے کتب خانہ سے احمد امین کی ''زعماء الإصلاح'' اور ''حیاتي'' لے آیئے، ''کلیلة و دمنة'' بھی نکال کر لایئے۔

تو الحمد للہ! طلبا اپنی اپنی نوٹ بک لے کر شوال میں آئے اور انہوں نے میرے سامنے رکھا، مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے محنت سے ترجمہ کیا، جو کچھ کمی تھی جتنی ہو سکی اصلاح کی۔ الحمد للہ! وہ طلبا جن کو میں نے یہ لکھنے کے لیے دیا آج اچھے مدرسین ہیں، آج وہ کئی مدرسوں میں اوپر کی کتابیں پڑھا رہے ہیں، یہ اس لیے میں نے آپ سے عرض کیا کہ اگر ہم اس طرح طلبا سے کام لیں، ان کو کتابیں دیں، ان سے مفہوم نکلوائیں کہ اس کا ترجمہ کرو، اب بھی میں ایسا کرتا ہوں۔

کتاب کو چاٹ لینے کا مزاج بنائیں:

حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ندوہ کی حاضری پر فرمایا کہ

مولوی صاحب! کسی کتاب کا سرسری طور پر پڑھ لینا کافی نہیں، کسی کتاب کا مضمون آپ کو پسند آئے تو اس کو آپ اتنا پڑھیں، ایک مرتبہ، دو مرتبہ تین مرتبہ کہ ایسا معلوم ہو جیسے کتاب کو آپ نے چاٹ لیا ہے، تب جا کر آپ کے اندر کوئی صلاحیت پیدا ہوگی، ان کے تجربے کی بات تھی، زندگی کا تجربہ انہوں نے ہمارے سامنے رکھا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے مطالعہ کا انداز:

اور پھر اپنی مثال دی، فرمایا کہ میں نے احمد امین کی کتاب ''فجر الاسلام''، ''ضحیٰ الاسلام'' اور ''عصر الاسلام'' کو اتنا پڑھا کہ ان کے صفحات میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے، آپ دیکھیں گے، مولانا علی میاںؒ کی جو عربی زبان ہے اس میں احمد امین کا اسلوب ہے۔ ہمارے اساتذہ کو تو میرے دوستو! اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کس مصنف نے کس کا اسلوب اختیار کیا ہے؟

مقصد تربیت ہے تعلیم نہیں:

میرے دوستو! جب ہماری تعلیم کا یہ مسئلہ ہے تو پھر ساٹھ مدرسے قوم کے کس کام کے ہیں؟ خدا کے واسطے اپنے ضمیر کو ٹٹولیں! میں دردمندانہ آپ سے اپیل کرنے بیٹھا ہوں، اللہ کے واسطے اس پر غور کریں، ہم مدرسوں میں اس لیے نہیں گئے کہ ہماری زندگی کی گاڑی چل جائے، ہم کچھ پیسے کما لیں، تین ہزار مل جائیں، ہم اپنے بچوں کو پالیں، یہ علمِ دین تحصیلِ مال و زر کے لیے نہیں، اگر یہ مقصد ہے تو نیت کا بگاڑ ہے، ہماری ترقی میں سنگِ گراں ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہم ان بچوں کے بارے میں مسئول ہیں اور یہ پوچھے جائیں گے کہ ایک ایک جماعت کس طرح پڑھ رہی ہے، ان کو سبق یاد ہے یا نہیں۔

تربیت سازی پر پوری توجہ دیں:

طلبہ کے پیچھے میرے دوستو خوب محنت کرنی ہے، ان کو مغرب کے بعد بلاؤ، ان کو عصر کے بعد بلاؤ، ان کو اپنے ساتھ رکھو، ان پر شفقت کرو، کھانا کھلاؤ، اپنی جیب سے خرچ کرو، انہیں مانوس کرو، ضروریات کا تکفل کرو، ہمارے متقدمین اساتذہ یہ کام کرتے تھے۔ شیخ ابوبکر کا ایک تربیتی مقالہ ہم نے عربی سے اردو میں نقل کر کے ''دارالعلوم'' میں بھیجا تھا، بہت سال ہوگئے، میں نے دیکھا کہ وہ کبھی کبھی اپنے طلبا کو لے کر مصر کے باغوں میں چلے جاتے؛ تاکہ وہ ذرا تفریح کریں، کھیلیں اور ان کے لیے کھانا پکاتے تھے اور ان کو علم دیتے تھے، ہمارے اسلاف نے اس طرح بچوں کو پڑھایا ہے کہ وہ تنگ بھی نہ ہوجائیں، ان کو کبھی خود لے کر چلتے تھے کہ چلو! کھیلنے جائیں گے۔

حسد و کبر دو خطرناک بیماریاں:

کبر اور حسد دو خطرناک بیماریاں ہمارے حلقوں میں گھس گئی ہیں، تواضع نہیں ہے، کبر ہے اور حسد ہے، دوسروں سے جلنا ہے۔ یہ کچھ مضامین ہیں، جنہیں آپ انشاءاللہ! پڑھیں گے، ایسے مضامین ہیں جن میں ہمارے بزرگوں نے کبر و حسد سے بچنے کی تلقین کی ہے، یہ مضامین تو سب کو دیے جائیں گے، آپ حسد اور کبر سے بچیں، ان دونوں بیماریوں نے ہمیں تباہ کر دیا ہے، ہم قسامِ ازل کی تقسیم پر راضی نہیں، ہم تقدیر کو چیلنج کرتے ہیں، ان سے اپنے قلب و روح کو پاک رکھیں۔

تجربہ کرلیں:

آپ اس کا تجربہ کرلیں، آپ چند طلبہ کا انتخاب کریں اور ان پر محنت کر کے دیکھیں، پھر انشاءاللہ! شعبان میں آپ دیکھیں گے کہ کس طرح ان میں نکھار پیدا ہوا ہے، لوگوں نے جانوروں پر یہاں تک کہ درندوں پر محنت کی اور انہیں سدھا لیا، بڑے بڑے کام لیے، آخر

اگر ہم ان سادہ ذہنوں پر محنت کریں گے تو کیسے ممکن ہے کہ ثمرات ظاہر نہ ہوں۔ ''إن الله لا یضیع أجر المحسنین'' (سورۃ التوبۃ: آیت ۱۲۰)

یہ میری عاجزانہ درخواست ہے ؎

اوروں کے بنانے سے تقدیر نہیں بنتی ہم جہدِ مسلسل سے تقدیر سنواریں گے

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرائیے:

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں بچے بالکل نہیں پڑھتے، سیرت کی کتابوں سے بالکل ناواقف ہیں، دورہ کے بعد بھی کسی واقعہ پر ہمارے طالبِ علم تجزیہ نہیں کر سکتے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سیرت رسول پڑھے بغیر کوئی صحیح معنی میں کچھ بھی نہیں کرسکتا، ہمیں تو سیرتِ رسول کے مقابلے اسکول و کالجز کے طلبا میں کروانے چاہیے۔

سیرت اسوۂ حسنہ ہے:

سیرت النبی تو ہمارے لیے ضروری ہے ''لقد کان لکم فی رسول الله أسوة حسنة' اس اسوہ کو ہم خود نہیں سمجھتے، اس کی سیرت کا گہرا مطالعہ نہیں ہے اور سیرت کا گہرا مطالعہ نہیں ہوگا تو ہماری سیرت نہیں بن سکتی، سیرت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نظر رکھنے سے بنے گی، اس میں زندگی کے ہر شعبہ اور ہر فرد کی رہنمائی ہے، بس اسوہ کو عروج ہی عروج ہے، اسے زوال نہیں، اس سے وابستہ افراد کو کبھی زوال نہیں آسکتا ہے ؎

اک نامِ مصطفی ہے جو بڑھ کر گھٹا نہیں
ورنہ ہر ایک عروج میں پنہاں زوال ہے

کتاب نہیں؛ اصل استاذ ہے:

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مولانا! کتابیں کوئی چیز نہیں

ہیں، کتاب مشکل ہو یا آسان، اگر استاذ قابل ہے تو وہ کسی بھی کتاب سے طالب علم کی مناسبت پیدا کرادے گا، کہا کہ طویل تجربہ کے بعد سید صاحب (سید سلیمان ندویؒ) اس نتیجہ پر پہنچے تھے، ہمارے سید صاحب نے یہ بات فرمائی کہ مولانا! اصل استاذ ہے، استاذ باصلاحیت ہے تو طالب علم کو کسی بھی کتاب سے مناسبت پیدا کرادے گا، اگر استاذ ہی کے اندر صلاحیت نہیں ہے، وہی ادھر اُدھر کچھ اردو کو دیکھ کر بول رہا ہے، بعض مرتبہ اس کو خود انشراح نہیں ہوتا۔

مطالعہ کی کثرت و وسعت، قدیم و جدید علمی ذخیرہ پر اطلاع و واقفیت کے ساتھ اہل زمانہ کی طبائع سے بھی واقفیت اور اس پر جذبۂ خدمتِ خلق سے متصف، آپ برابر اپنے وعظوں اور مجالس میں علما کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں اور ان کو اپنے فرائض کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ ہم سب کو ان نصائح پر عمل کرنے اور اپنے طلبۂ عزیز کے پاس عمل کروانے کی توفیق عنایت فرمائے، اور حضرت کو اپنی شان کے مطابق دارآخرت میں بہترین بدلہ عنایت فرمائیں آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

●●●●●

دل دردمند و زبان ہوش مند کا حسین امتزاج

مرتب

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب
(شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

فارغین علماء کی علمی رہنمائی:

مفکرِ ملت دامت برکاتہم کی شفقتیں وعنایتیں اس عاجز پر زمانۂ طالب علمی سے لے کر آج تک مختلف ومتنوع حیثیتوں سے مسلسل جاری ہیں، ایک مشفق ومربی باپ جیسے اپنی اولاد کی بچپن سے لے کر جوانی اور کہولت میں بھی مسلسل فکر رکھتا ہے، اسی طرح حضرت دامت برکاتہم نے اپنی صلبی اولاد سے بھی زیادہ اپنی علمی وروحانی اولاد کی فکر کی ہے، آپ کے ہر ایک شاگرد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ حضرت کو مجھ سے بہت قریبی تعلق ہے، آپ دامت برکاتہم کی وسیع المشربی نے اپنے فیض اور تعلقات کو ''فلاح دارین'' تک ہی محدود نہیں رکھا بل کہ کسی بھی ادارہ کے فارغ علمائے کرام کی تصنیفی، تالیفی یا تدریسی خدمات کو حضرت دامت برکاتہم نے بہت کشادہ دلی وخندہ پیشانی سے سراہا ہے۔

کئی نوجوان علمائے کرام کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہماری چھوٹی بڑی علمی خدمات کو ہمارے اساتذۂ کرام سے بھی زیادہ حضرت دامت برکاتہم نے سراہا اور مجمع کے سامنے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہے، کتنے نوخیز مصنفین نے مجھے یہاں تک کہا کہ ہماری علمی خدمات کو حضرت دامت برکاتہم کے حوصلہ افزا کلمات نے ہی قائم ودائم رکھا ہے، ورنہ گجرات جیسے حوصلہ شکن ماحول میں؛ جہاں ہماری تالیف کی تعریف وتوصیف تو بہت دور رہی کتاب ملنے پر وصول یابی کی اطلاع تک نہیں دی جاتی، ملاقات کے موقع پر بھی بھول سے تذکرہ تک نہیں ہوتا، وہاں حضرت جیسے مشفق عالمِ دین ہماری اتنی قدر کرتے ہیں کہ آپ کی ملاقات کے بعد ساری حوصلہ شکنیوں کو فراموش کر کے ہم تازہ دم ہو جاتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم کوئی کام کر رہے ہیں۔

ایسے مشفق و مربی استاذ محترم کی کرم فرمائی میں میں کیا لکھوں؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت ساری صلاحیتوں اور صفات سے نوازا ہے، ان میں ہم طالب علموں کے لیے جو سب سے بڑی فائدہ مند علمی منفعت والی چیز ہے، وہ حق تعالیٰ شانہ کا آپ کو مردم شناسی کے وصف خاص سے نوازنا ہے۔

آپ نے ماہر اساتذہ کی تلاش میں لمبے لمبے تکلیف دہ اسفار کیے اور منت سماجت کر کے ایسے لائق و فائق اساتذہ جمع فرمادیے تھے جنھوں نے فلاح دارین کو خونِ جگر اور آہِ سحر سے سینچنے میں آپ محترم کی مکمل معاونت کی اور بنیان مرصوص بن کر فلاحِ دارین کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا۔

آپ کے اہتمام کا زمانہ یقیناً فلاح دارین کا رئیسی دور تھا اور طلبہ میں علمی رسوخ اور ٹھوس صلاحیت پیدا کرنے کے لیے تأسیس و بنیاد تھا، جو آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب سے جگمگا رہا تھا۔

حضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی استاذ صاحب رخصت پر ہوں تو آپ طلبۂ عزیز کو دفتر میں بلاتے تھے، اس وقت کتاب کے متعلق معلومات کے علاوہ استعداد بنانے کے جو گر بتاتے تھے وہ یقینا بہت قیمتی تجربات ہوتے تھے، طالب علم کو آپ کے درس سے توانائی ملتی تھی، اس کی بیٹری چارج ہوجاتی تھی اور کئی دنوں تک نئے حوصلے واُمنگ کے ساتھ مطالعہ وتکرار میں لگا رہتا تھا، طلبۂ عزیز کی صرف مدرسہ کی چہار دیواری میں ہی آپ نے نگرانی و رہ نمائی نہیں فرمائی؛ بل کہ فراغت کے بعد بھی ان کی مسلسل فکر رکھتے ہیں، ان کا تفقد کرتے ہیں، اچھی کتابوں کی طرف رہ نمائی کرنا، معلومات کے تبادلہ کی کوشش کرنا اور اس سلسلہ میں متعدد بار علما کو خطوط کے ذریعہ جوڑنے کی کوشش بھی شامل حال ہے، بندہ کے نام ۱۳/۱۰/ اکتوبر

۱۹۹۹ء کو کینیڈا سے لکھے ہوئے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''بندہ نے ترکیسر عریضہ لکھا تھا کہ ارباب ذوق اساتذہ کی ایک انجمن بنائی جائے، ماہ دوماہ میں مختلف جگہ جمع ہوں اور نئی کتابوں سے مضامین کے بارے میں تبادلۂ خیالات کریں، ایک دوسرے کو اچھی کتابیں پہنچائیں، ''مجلس ارباب ذوق'' یا ''مجلس اخوان الصفا'' نام رکھا جا سکتا ہے۔''

ایک دوسرے خط (۱۲/جون ۲۰۰۱ء کینیڈا) میں تاریخی معلومات لکھتے ہوئے اس قسم کی مجلس کا ذکر کرتے ہیں، تیسرا خط ۱۲/اگست ۲۰۰۱ء کا لکھا ہوا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

''......الحمدللہ! ہمارے بھروچ ضلع کے مدرسوں میں بعض اساتذہ علمی ذوق کے ہیں، جمبوسر، کنتھاریہ، بھروچ، کھروڈ، ہانسوٹ، ترکیسر، راندیر اور ڈابھیل کے ایسے باذوق اساتذہ اپنی ایک انجمن قائم کریں اور ماہ دوماہ میں ایک مجلس ہو جس میں علمی موضوعات نیز کتب جدیدہ پر تبادلۂ معلومات ہوں تو بہت فائدہ ہوگا۔''

ان دونوں خطوط سے حضرت کا فارغ شدہ طلبۂ عزیز کے ساتھ علمی ربط و تعلق اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو، اس کی فکر اور اس سلسلہ میں وہ کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہتے تھے؛ لیکن فارغین کی طرف سے سردمہری دیکھ کر آپ نے خود ہی چند ماہ پہلے ایک علمی مجلس منعقد کروائی اور اس میں گجرات بھر کے مدارس اسلامیہ کے اساتذۂ کرام اور ذمے داروں کو مدعو فرما کر ایک باقاعدہ کمیٹی بنوائی اور ان کی ذمے داری کے خطوط اربعہ طے کرتے ہوئے پھر دوبارہ جمع کیا اور شدید بیماری کے باوجود اس میں بڑی جگر سوزی کے ساتھ احساس ذمے داری کی طرف توجہ منعطف کرائی۔

طلبہ میں مطالعہ کا ذوق کیسے پیدا ہو اور انحطاط کے اسباب کیا ہیں؟ اس پر غور وخوض کے لیے تقریباً ۲۰۰۹ء میں مسجد عائشہ کاپودرا میں ایک بڑی مجلس کا انعقاد کیا گیا تھا، اسی طرح چند سال پہلے ایک مجلس کا انعقاد کر کے مدارس گجرات کے اساتذۂ کرام کو تدریسی اصول و تربیتی نظام وغیرہ سمجھائے گئے، انفرادی مجالس میں بھی آپ کی مسلسل یہ کوشش رہتی ہے کہ مدارس کے فضلا اپنے اوقات عزیزہ وغالیہ کو زیادہ سے زیادہ بارآور ثابت کریں، باہمی علمی اتحاد واتفاق اور تعارف وتناصر کا جذبہ قائم ودائم رکھیں، افراد سازی کی مہم تیز تر ہو، اس عنوان پر مختلف بہانوں سے علمائے کرام کو مدعو کرنا، ان کی خاطر خواہ مہمان نوازی کرنا، کاپودرا میں شان دار کتب خانے کی قیمتی عربی واردو کتابیں مدارس کے اساتذہ کو مطالعہ کے لیے عنایت فرمانا وغیرہ امور آپ کی کشادہ دلی کے ساتھ اندرونی کڑھن اور ایک عظیم مقصد کی بیّن دلیل ہیں۔ مدرسین کے مسائل میں بھی مشورہ کرنے پر صحیح معقول بات کی رہ نمائی کرنا، انتظامیہ کے ساتھ تعاون، طلبۂ عزیز کی علمی ترقی کی فکر وغیرہ چیزوں کی طرف توجہ منعطف کرانا ہوتا ہے تو انتظامیہ کے آنے پر اساتذہ کے ساتھ ہمدردی اور ان کی ضروریات کا لحاظ کرنا وغیرہ باتوں کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس طرح اس وقت الحمدللہ! گجرات کے سارے مدارس علمی، عملی، تربیتی وروحانی نقطۂ نظر سے حضرت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، روزانہ کسی نہ کسی مدرسہ کے اساتذہ یا ذمے داران بل کہ دوسرے دینی ملی، سماجی، رفاہی، سیاسی اور اسکول کالج سے وابستہ تعلیمی حضرات بھی مفکر ملت کی خدمت میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں، مجھے تو حضرت کی طرف سے ان کی مہمان نوازی کا منظر دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت کے گھر کی مستورات کی یہ بہت بڑی قربانی ہے اور ساتھ میں حضرت کی طرف سے بھی مالی خرچ برداشت کرنا آج کی مہنگائی کے دور میں بہت بڑا ایثار ہے۔ آج

کی دنیا تجارتی سوچ والی ہے، نفع نقصان کا تخمینہ لگا کر کسی پر خرچ کیا جاتا ہے، وہیں پر جان ومال اور وقت کو خالصۃً لوجہ اللہ خرچ کرنا بڑی اولوالعزمی کی بات ہے اور ’’إنما نطعمکم لوجه الله لا نريد منكم جزاء ولا شكورًا‘‘ کی عملی تفسیر ہے۔

دارالعلوم فلاح دارین:

جیسے مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح حضرت کا فلاح دارین کے ساتھ تعلق ہے، فلاح دارین اینٹ، ریت اور پتھر کی بلڈنگ کا نام نہیں ہے بل کہ فلاح دارین ایک زندہ، متحرک، علمی اور عملی تربیت گاہ ہے، جس کو آپ نے خون جگر اور آہ سحر گاہی سے سینچا ہے، اس کے ایک ایک کل و پرزے کو درست کرنے اور اس کے گیسُو کو سنوارنے میں آپ نے اپنی حیات مستعار کے اوقات عزیزہ صرف کیے ہیں، فلاح دارین کے در و دیوار اور شجر و حجر کا ہر پتہ و ذرہ آپ کی خدمت و محنت کا شاہد ہے۔ آپ ہر وقت طلبہ، اساتذہ و کارکنان کو ہر طرح کی راحت فراہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ آپ نے سردی، گرمی اور ناخوش گوار حالات کا مقابلہ کرکے دارالعلوم کو ترقی دینے، اس کے گیسو اور نوک و پلک درست کرنے اور اس کو ترقی کی معراج پر پہنچانے کے لیے اپنی ذات وقف کردی تھی۔

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی بھی ادارہ صرف ایک دو آدمیوں کی محنت سے ترقی نہیں کرسکتا، اس کے مختلف شعبہ جات میں ایک مشین کے مختلف کل پرزوں کی طرح مختلف صلاحیت واستعداد رکھنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، فلاح دارین بھی تنظیمی وتعمیری ترقی کے ساتھ تعلیمی وتربیتی ترقی میں ایسے بہترین باصلاحیت، اعلی استعداد رکھنے والے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے حضرات سے مالا مال رہا جنہوں نے اپنے خون جگر اور آہ سحر گاہی سے ادارہ کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا۔

یہ حضرات اساتذۂ کرام آپ کے ہم دم وہم راز بن کر ہر نشیب وفراز اور ترشی وتلخی اور ہر آزمائش میں شانہ بشانہ ہوکر معاصرین واخلاف کے لیے ایثار وقربانی اور وفاداری کا ایک نمونہ قائم کر گئے۔

راوت فیملی کے ساتھ تعلقات:

فلاح دارین کی علمی، عملی وتربیتی ترقی میں جس طرح حضرت مفکر ملت نے اپنے مخلص اساتذۂ کرام کے ساتھ مل کر اس کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا، اسی طرح اس کے ظاہری ومعنوی حسن کو دوبالا کرنے میں راوت فیملی کا بھی بڑا اہم کردار رہا ہے۔ ''فلاح دارین'' کی پچاس سالہ تاریخ میں اس کی تعمیری وبنیادی ضروریات فراہم کرکے اس کو ترقی دینے میں راوت فیملی نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے، ہندوستان سے ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود'' فلاح دارین'' ان کے دل کی دھڑکن تھی اور ہے کسی خاندان کو مسلسل پچاس سے زیادہ سال تک اپنے دین متین کی حفاظت کے لیے منتخب کرنا یہ ان کی عنداللہ تعالیٰ مقبولیت کی دلیل ہے۔

لبیک قبولِ ما است:

اس فیملی نے دارالعلوم کی تمام مالی وانتظامی ذمے داریاں سنبھال کر حضرت مفکر ملت کو تعلیمی کام کے لیے فارغ کر دیا اور آپ نے یکسوئی سے تعلیمی وتربیتی کام کو آگے بڑھایا، اس دوران مفکر ملت کو بہت سارے مواقع پر ناگفتہ بہ حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا تو راوت فیملی حضرت کے ساتھ بنیان مرصوص بن کر جمی رہی اور ایسے نامساعد حالات میں حضرت کو تسلی دی، ہزاروں میل کا سفر کر کے اپنے کاروبار اور بال بچے چھوڑ کر حضرت کی دل جوئی کے لیے حاجی یوسف اور حاجی موسیٰ راوت صاحبان آتے رہے، ہم فلاحی برادری راوت فیملی کے ممنون ومشکور ہیں کہ ہماری علمی وعملی زندگی میں انہوں نے ہمیں ظاہری اسباب کا محتاج نہیں

بننے دیا۔ راوت فیملی نے حسن تدبیر و سلیقہ مندی اور خلوص عمل سے فلاح دارین کو مالیات کی ہر قسم کی فکروں سے مستغنی بنا کر ایک حد تک خود کفیل کر کے مالیات کے نظام کو مزید مستحکم کر دیا۔

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ:

میں نے مفکر ملت کو بار بار حاجی یوسف اور حاجی موسی راوت کا تذکرۂ خیر کرتے سنا۔ آپ نے ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف ہی نہیں کیا؛ بل کہ اس فیملی کے ہر فرد کو اپنا عزیز سمجھا۔ چند دنوں پہلے میری حاضری ہوئی تو فرمایا کہ راوت فیملی کا مدرسہ میں رہنا بہت ضروری ہے اور مولانا خلیل صاحب راوت کے صاحب زادے سلمہ کا خصوصی ذکر کیا کہ میں ''فلاح دارین'' میں ان کی تدریسی خدمت سے بہت خوش ہوں۔

عمومی تعلیمی دل چسپیاں:

حضرت مفکر ملت نے تعلیمی بیداری کے عنوان سے نصاب تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ نظام تعلیم و طریقۂ تدریس پر بھی خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے، چناں چہ ۲۸/ ذی قعدہ بروز جمعرات ۱۴۲۹ھ کا پودرا میں ''مجلس تعلیمی گجرات'' کی زیر نگرانی بڑے مدارس کے اساتذۂ کرام نے شرکت فرمائی، اس موقع پر حضرت مفکر ملت نے جو تاریخی خطاب فرمایا اس میں بہت ہی قیمتی مواد اساتذہ و طلبہ اور منتظمین کے لیے جمع فرما دیا، ہم نے اس خطاب اور اس میں اساتذۂ مدرسہ کی طرف سے پیش کی جانے والی آرا کا گجراتی ترجمہ کر کے دار العلوم ماٹلی والا سے شائع ہونے والے گجراتی پرچہ ''پیغامِ رحمت'' میں شائع کیا تو بہت سارے احباب نے اس پر تحسینی کلمات فرمائے، دعوت و تبلیغ کے ذمے دار علمائے کرام خاص کر کے حضرت مولانا اسماعیل گودھروی صاحب دامت برکاتہم، مولانا عثمان کاکوسی صاحب دامت برکاتہم وغیرہ نے اس کو بہت غور سے پڑھا اور ہمارے ایک رشتہ دار نے حضرت مولانا ابراہیم

صاحب دیولوی دامت برکاتہم کو بھی پڑھ کر سنایا تو حضرت نے بھی اس کو بہت ہی سراہا اور اس کی ضرورت واہمیت ذکر فرمائی، اس کے بعد یہ فکر انگیز خطاب المعہد الاسلامی مانک مئو سہارن پور سے اردو میں شائع ہوا اور اس کا عنوان ''تعلیمی، تدریسی اور فکری بیداری فنی اساتذہ کرام ہی پیدا کر سکتے ہیں'' رکھا گیا۔ (یہ خطاب صدائے دل جلد چہارم میں شاملِ اشاعت ہو چکا ہے۔)

اسی طرح مکاتب کے اساتذۂ کرام کو جمع کر کے ایک خطاب باٹلی (U.K.) شہر میں فرمایا، اس کو بھی ''پیغام رحمت'' میں گجراتی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا گیا، بعد میں مولانا رشید احمد ندوی خان پوری صاحب نے ہماری اجازت سے اس کو کتابی شکل میں شائع کروایا۔

حضرت کا لقب ہی ''مفکر ملت'' ہے جو اسم بامسمیٰ ہے، کیوں کہ آپ امتِ مسلمہ کے تمام طبقات کے دین کی فکر کرتے ہیں، خصوصاً مدارس، مکاتب کے ساتھ آپ کو اسکول کالج کے مسلم طلبۂ عزیز و اساتذۂ کرام کی بھی بہت فکر دامن گیر رہتی ہے۔

اس کے لیے آپ وقتاً فوقتاً اسکول کے طلبہ و اساتذہ کے سلسلے میں لکھتے رہتے ہیں، نیز بیانات میں بھی ان کی رہ نمائی فرماتے ہیں۔

لارڈ میکالے کے لادینی نظام تعلیم کے تدارک کے لیے آپ نے ایک چھوٹا سا رسالہ گجراتی زبان میں شائع فرمایا ہے، جو درحقیقت سورتی سنی وہورا کمیٹی کی ۲۵ رسالہ تقریب کے موقع پر آپ کا دیا ہوا خطاب ہے، اسی طرح اس وقت کی حکومت نے جو نیا تعلیمی نظام و پالیسی پیش کی ہے اس سے بھی آپ بہت فکر مند ہیں، چناں چہ حضرت کے ایماء پر ہی بندہ نے اسکول کی پانچویں کلاس سے لے کر بارہویں تک کے نصاب کا مطالعہ کیا اور اس میں جو چیزیں عقائد، تاریخ، فلسفہ، سماجیات، سیاسیات، سائنس، اقتصادیات اور اصول قانون کے

عنوان سے پڑھائی جاتی ہیں، ان میں اسلام کے خلاف نظریات یا ان میں اسلامی نقطۂ نظر کا ذکر نہ کرنا ایک مسلمان طالب علم اور استاذ کو ذہنی وقلبی طور پر پریشان کرتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس سلسلے میں اسلام کوئی رہ نمائی ہی نہیں کرتا ہے، جب کہ اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات میں اس کا بدل یا اس کا حل موجود ہوتا ہے۔

اس کے تدارک کے لیے بندہ نے عقائد، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، سائنس، اقتصادیات اور اصول قانون کے موضوع پر گجراتی میں کتابیں لکھنے کا آغاز کیا تھا اور الحمد للہ تعالیٰ تمام موضوعات پر کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ **الحمد للہ تعالیٰ علی ذالک!**

اس سلسلے میں حضرت مفکرِ ملت نے ایک کتاب ''مسلم سائنس دانوں کی گراں قدر سائنسی خدمات'' کا گجراتی ترجمہ مولانا فرید بیگ فلاحی صاحب سے کروا کر دوبارہ اس کو شائع کروا کر مختلف اسکول کے ٹیچروں کو پہنچایا ہے۔

مختلف علوم وفنون میں ہمہ جہتی وافراد سازی:

حضرت مفکر ملت کی ایک بہت بڑی خصوصیت افراد سازی کی ہے، آپ نے فلاح دارین میں قیام کے دوران اس بات کا بہت خیال رکھا کہ جس طالب علم میں جس فن کی صلاحیت ہو اس کے مطابق اس کو آگے بڑھایا جائے، دیوبند، سہارن پور، ندوہ وغیرہ میں طلبۂ عزیز کو ان کی فنی صلاحیت وذوق (حدیث، تفسیر، فقہ، ادب) کے اعتبار سے بھیجنے کی کوشش کی؛ تاکہ ہمارے مدارس کے لیے رجال کار تیار ہوں، قاری محمد صدیق صاحب جب فارغ ہوئے تو وہ آگے پڑھنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں؛ تمہیں آیندہ سال یہاں پڑھانا ہے۔ قاری صاحب نے عرض کیا کہ قاری انیس صاحب کی موجودگی میں کیسے پڑھا سکتا ہوں تو مفکر ملت نے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں ہی پڑھانا ہے تاکہ آپ کو کوئی

اشکال ہو، کوئی عبارت حل کرنا ہو تو قاری انیس صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں۔

قاری داؤد کو ساڑی صاحب کو پڑھانے کے لیے تیار کیا، ان کے گھر کے حالات ٹھیک نہیں تھے تو ان کو کہا کہ ہم آپ کو کچھ گھنٹے پڑھانے کے لیے مقرر کریں گے اور کچھ گھنٹے آپ قاری انیس صاحب کے پاس قراءات سبعہ عشرہ پڑھنے میں مصروف رہیں۔ اسی طرح مولانا یوسف صاحب ٹنکاروی کو بھی سبعہ پڑھنے کی ترغیب دی، ان کے دو گھنٹے خالی رکھے، یہ سب اس لیے تھا کہ قراءت کے کچھ متخصصین پیدا ہوں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے ایک وفد رمضان المبارک کے مہینہ میں بنارس اور مالیگاؤں آتا تھا، بنارس سے ''فلاح دارین'' میں خط آیا کہ آپ کے مدرسہ کے کچھ طلبہ کو امتحان کے لیے بھیجیں تو حضرت مفکر ملت نے مولانا رشید دیلوی، مولانا داؤد دہگامی اور تیسرے ایک ساتھی کو بنارس جانے کے لیے تیار کیا۔ رمضان المبارک کی وجہ سے ان لوگوں نے پس و پیش کیا تو مفکر ملت نے فرمایا کہ یہ میرا حکم ہے تم کو جانا ہوگا، یہ لوگ گئے اور دیر سے جانے کی وجہ سے پچھلی نشست گاہ پر جگہ ملی، آنے والے وفد نے چند نحوی و صرفی سوالات کیے تو ان فلاحی فارغین کے علاوہ کوئی اچھے جوابات نہیں دے سکا۔ جب انہوں نے روزانہ اچھے جوابات دیے تو آنے والے وفد کے ارکان نے ان کو آگے کی نشست گاہ پر بٹھایا اور پھر قطر الندیٰ و شرح شذور الذہب کے کچھ سوالات کیے، انہوں نے بہت تشفی بخش جواب دیے تو بہت خوش ہو گئے اور ان کا جامعہ اسلامیہ کے لیے انتخاب ہو گیا۔ اسی طرح مولانا فاروق صاحب بڑودوی نے بھی مالیگاؤں آنے والے وفد کو بہترین عربی اسلوب میں اطمینان بخش جوابات دیے تو وہ حضرات بھی خوش ہو گئے اور مولانا فاروق صاحب کا بھی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ ہو گیا، اس سے پہلے حضرت مولانا اقبال صاحب دیلوی اور حضرت

مولانا ایوب صاحب کوساڑی کو بھی ندوۃ العلما بھیجا، ان حضرات نے وہاں محنت کی اور ان کا بھی سعودی جانا ہو گیا، انہوں نے بھی وہاں ممتاز پوزیشن حاصل کی۔

ایک مرتبہ ''فلاح دارین'' میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی آمد پر مولانا اقبال صاحب کا استقبالیہ خطبہ سن کر حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ بہت خوش ہو گئے اور اپنے خطاب میں مولانا کی عربیت کی تحسین فرمائی، اسی طرح مولانا یوسف صاحب ٹنکاروی اور مولانا رشید احمد خان پوری صاحب اور مولانا ارشد اعظمی صاحب کو تدریب المعلمین کی نسبت سے ریاض بھیجا گیا۔

''فلاح دارین'' میں عربی مجلّات ورسائل جمع کر کے ''**الصحافة العربية اليوم**'' کے عنوان سے طلبہ کے لیے ایک خصوصی مجلس رکھی؛ تاکہ طلبۂ عزیز عالم عربی کے مجلّات وصحائف سے واقف ہوں۔ اسی طرح طلبۂ عزیز کی تحریری صلاحیت اجاگر کرنے کی غرض سے مختلف عنوانات پر مقالات ومحاضرات لکھوائے گئے، سوالات وجوابات کی مجالس منعقد کروائیں تاکہ طلبہ اس موضوع پر علی وجہ البصیرت معلومات حاصل کرسکیں۔ حفظ حدیث کا سلسلہ شروع کروایا گیا تاکہ طلبۂ عزیز کو روایات کا ایک ذخیرہ زبانی یاد ہو۔

اسی طرح طلبۂ عزیز کے لیے مدینہ منورہ میں داخلہ کی محنت اور متعلقہ محکمات سے مسلسل رابطہ رکھنا، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے خصوصی تعلقات وغیرہ چوطرفی محنت کے نتیجہ میں اللہ پاک نے کامیابی عطا فرمائی۔ یہی حال علی گڈھ یونی ورسٹی سے تبادلہ اور فلاح دارین کے لیے اس کی منظوری حاصل کرنے کے مراحل بھی بہت محنت وپیہم کوشش کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچے۔

یہ سب طلبہ کی ذہن سازی اور ان کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی مختلف محنتیں تھیں، ان کے علاوہ آپ ہمارے لیے کیا کیا فکریں کرتے ہوں گے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے

کیا کیا تدابیر کرتے ہوں گے؛ وہ تو مفکر ملت اور ان کو فکر عطا کرنے والی ذات ہی جانتی ہو گی، حق تعالیٰ شانہ اپنے دینِ متین کے لیے فکر کرنے والے اس بندے کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ہم کو بھی اپنے طلبۂ عزیز کے لیے اس فکر اور کڑھن کا کچھ حصہ عطا فرمائے۔ آمین!

عربی زبان کے ساتھ والہانہ تعلق:

عربی زبان کے ساتھ والہانہ تعلق نے آپ کو صاف ستھری سلجھی ہوئی بہترین عربی زبان ارتجالاً بولنے پر قدرت عطا فرمائی۔ گجرات بل کہ ہندوستان کے چند ہی مہتمم حضرات کو ہم نے بہترین عربی، اردو زبان بولنے والا پایا، آپ کو عربی کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد ہیں، اسی طرح عربی نثر کے بھی مختلف جملے آپ کو زبانی یاد ہیں، آپ نے دیوبند سے نکلنے والے پرچے ''الیقظة'' میں جو حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کی زیرنگرانی اور حضرت مولانا عمید الزماں (رئیس التحریر) ومولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم (سیکریٹری التحریر) کی مشترکہ کوششوں سے شائع ہوتا تھا، اس میں شعبان المعظم ۱۳۸۰ھ مطابق فروری ۱۹۶۱ء میں کئی مضامین لکھے ہیں، جن میں سے ایک مضمون کی چاشنی سے آپ کو بھی محظوظ کرنا چاہتا ہوں:

....ونحن نعيش الآن في عهد قد تطورت فيه طرق الحياة الاجتماعية، وشاعت النظريات الجديدة، والفلسفات الغربية الضالة المضلة، وقد تفرقت الشعوب شيعا وأحزابا، فهولاء يدعون إلى اللادينية، وهؤلاء ينادون بالشيوعية، وهؤلاء يهتفون بالقومية والوطنية، وبتعبير فضيلة الأستاذ أبي الحسن علي الندوي ''ردة ولا أبابكر لها''، فواجبنا أن نتسلح بسلاح جديد لمحاربتها والدفاع عن الإسلام.(شعبان المعظم سنة ١٣٨٠هـ

مطابق فبرائر سنة ١٩٦١ء)

اسی پرچہ کے ایک دوسرے شمارہ (اگست ۱۹۶۱ء) میں مولانا عمید الزماں صاحب اپنی اور حضرت مفکر ملت کی حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی خدمت میں ''الیقظۃ'' کے سلسلے میں حاضری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قد حظيت أنا وصديقي الأستاذ عبد الله السورتي بزيارة فضيلة الشيخ أبي الحسن علي الحسني الندوي في شهر ذي القعدة في مدينة "ميرته"، وكانت هذه هي المرة الأولى التي تشرفت فيها بزيارة سماحته، فعرفنا (أنا والأستاذ عبد الله) أنفسنا إليه فاستقبلنا الشيخ استقبالا حارًّا يليق بالصّغار، وأظهر لنا حفاوة زائدة، وعاملنا مُعاملة أب عطوف وأستاذ كريم ومستشار مخلص، وبالغ في إكرامنا عند ما علم أننا نقوم بإدارة اليقظة، وأعرب عن ارتياحه الكبير وسروره البالغ بإصدارنا هذه الجريدة، وشجعنا كثيرا على مواصلة هذا العمل المثمر، واستغرقت زيارته ساعة كاملة، وتحدثنا معه ووجهنا إليه بعض الأسئلة كما طلبنا إليه أن يبدي رأيه من الكتاب القديرين في مصر، كالدكتور طٰه حسين وأحمد أمين وحسن زيات ومحمود عباس العقاد، فعلّق لنا على أسلوب كتابتهم ونقدهم، وأظهر لنا ما هي ميزات كل منهم وما يوجد في كتب بعضهم من نقص في ناحية البحث والحديث.

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ دونوں بزرگوں کی خدمات کو سراہتے ہوئے اور حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے وقیع کلمات سے نوازا، چناں چہ فرماتے ہیں:

ولٰکن صدور صحیفة باللغة العربیة من دار العلوم دیوبند کبری المدارس العربیة في الهند حادث یسترعی الانتباه ویثیر الاهتمام، ویستحق التهنئة والتشجیع، وتعقد به أمال کبار، لذلک نهنئ القائمین علی شئون هذه المجلة علی نشاطهم ویقظتهم، ونتمنی لهم التوفیق والنجاح.

(أبو الحسن علي الحسني الندوي، میرٹھ ۸۰/۱۱/۵هـ)

فضیلۃ الشیخ محمد مجذوبؒ جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے تشریف لائے تھے اور بعد میں ان کی ہی سعی سے فلاح دارین کا جامعہ مدینہ منورہ سے الحاق ہوا تھا، آپ نے فلاح دارین میں چند روز گزارے تھے، حضرات اساتذۂ کرام سے بھی آپ کی کئی مجالس ہوئیں، حضرات اساتذۂ کرام کے ساتھ کئی مسائل پر بحث ہوئی، اس میں ''مؤلفۃ القلوب'' کو زکاۃ دینے کے سلسلہ میں حضرت مفتی احمد بیمات صاحبؒ (شیخ الحدیث) اور حضرت مولانا ابرار احمد صاحبؒ سے مباحثہ ہوا، اس کے بعد فجر میں حضرت مفکر ملت کے سامنے ان اساتذۂ کرام کی بہت تعریف و تحسین فرمائی، مدینہ منورہ جانے کے بعد حضرت مفکر ملت کی شخصیت، عربیت اور اخلاق حمیدہ وغیرہ سے متاثر ہوکر ایک مضمون آپ کی سوانح پر لکھا، اس میں حضرات اساتذۂ کرام کے متعلق ایک جملہ لکھا ہے:

وبلغ مدرسوها الواحد والثلاثین، وفیهم من یضاهي أکابر علماء العالم الإسلامي. (۱) علماء و مفکرون عرفتهم الجزء الثالث: ۱۰۲

فلاحِ دارین کے متعلق شیخ مجذوب کا تبصرہ:

"والداخل إلى ساحته لا يستطيع إلا الموافقة على قول سماحة الشيخ أبي الحسن الندوي عنها بأنها (جنتان عن يمين وشمال)، وحدث ولا حرج عن مدرسيه الراسخين في العلم، و عن طلابه النظاميين، الذين وجدنا فيهم من يستظهر الأجزاء الكثيرة من كتاب الله، ويتلوها في تجويد يكاد يزاحم به كبار المقرئين المشهورين، وهو الذي لم يبارح سن الحداثة". (أيضا: ۱۰۰)

اسی مضمون میں ایک خط شیخ مجذوبؒ نے مفکر ملت کی تعریف وتحسین اور خاص کر کے آپ کی عربیت، فصاحت وبلاغت اور معلومات کی وسعت کے متعلق لکھا ہے، یہ ایک بڑے عرب عالم اور شیخ کی شہادت علمیہ ہے، جو عالم اسلام کے ہزاروں علمائے کرام سے ملاقات کر چکے ہیں اور جن کی فلاح دارین اور حضرت مفکر ملت کی ذات سے کوئی دنیوی منفعت وابستہ نہیں تھی۔

فضیلۃ الشیخ مجذوبؒ فرماتے ہیں:

"سلام عليكم ورحمة الله وبركاته

ولكم أخلص الشكر على هديتكم النفيسة (أضواء على تاريخ الحركة العلمية والمعاهد الإسلامية والعربية في غجرات)، وإنه كتاب قيم أتمنى لو يتاح توزيع مقادير منه على ذوي الثقافة في المواطن العربية، ليتعرفوا من خلاله جهاد الأجيال من أئمة العلوم العربية و الإسلامية في الهند، أولئک الجهابذة الذين ما انفكوا

يتتابعون على إعلاء كلمة الله تحت راية القرآن والسنة، وفي حراسة اللسان المبين الذي جعله الله الوسيلة المثلى لفهمهما والاستضاءة بنورهما.

والحق إنني لم أفاجأ بروعة المضمون ولا بسلامة الأسلوب، لأن الذي عرفته عنكم خلال الأيام المباركة التي تلاقينا بها في تركيسر وندوة العلماء، قد ملأ نفسي إعجابا بمواهبكم (وعربيتكم) وانتظام أفكاركم العميقة، لذالک كانت مطالعتي في الكتاب فرصة جديدة لاستئناف ذلک اللقاء السعيد، الذي أضاف إلى شخصكم الكريم صحبة العشرات من فضلاء الأمة الذين كان لهم النصيب الأوفى من الفضل في الدعوة إلى الوحيين، وفي إعطاء العربية موطنا جديداً تخرج فيه الأكبرون من حماة الفصحى وآدابها.

وحسب الكتاب بعد ذلک أن يضع بين يدي طلبة العلوم الإسلامية فيضا عَمَمًا من المعرفة في صفحات محدودة دون المئتين عددا، ومن أولى ثمراتها أن تزيد وشائج الأخوة بين مسلمي الهند والربوع العربية قوة وتوثيقا۔ وقد قدح جهدكم المبرور في نفسي خاطرة، وددت لو تجد قبولا لدى أولي الفكر والأدب لا في الهند فقط بل في مختلف ربوع الإسلام.

لقد وفيتم حق غجرات بما عرضتم من وجوه إسهاماتها في نطاق

الحضارة الإسلامية على مر العصور، فرأينا مواكب العلماء والحكام الصالحين والمنشآت العلمية على اختلاف مستوياتها، ولم تغفلوا الحديث عن لغتها وتفاعلها مع لغة القرآن العظيم..... وما إلى ذالك من ألوان النشاط الذي كان له مردوده الملموس في عالم الفكر الإسلامي على امتداد أمكنته وأزمنته......فجزاكم الله خير ما يستحق هذا الجهد من بركاته.‘‘

(۱) علماء ومفكرون عرفتهم الجزئ الثالث: ۱۰۶-۱۰۷

فضیلۃ الشیخ مجذوبؒ کا مضمون بارہ صفحات پر مشتمل ہے، طوالت کے خوف سے اس کو نقل نہیں کرسکتا ہوں، اس میں انہوں نے حضرت مفکر ملت کی سوانح کا پورا خاکہ، آپ کی شخصیت، اخلاق واعمال اور فلاح دارین کے شب وروز وغیرہ پر ایک ماہر نفسیات کے انداز میں بہت طویل کلام کیا ہے، حضرت مفکر ملت کی کتاب ’’الاضواء‘‘ کے پرانہ نسخے کے سلسلہ میں یہ لکھا گیا تھا، اگر شیخ اس کے موجودہ نئے نسخے کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور اس پر مزید کلام فرماتے۔

اسی طرح چند دن پہلے مسجد نبوی شریف اور مدینہ منورہ کے استاذ فضیلۃ الشیخ حامد اکرم البخاری اور مسجد نبوی شریف کے استاذِ فقہ ومقاصد شریعت کے ماہر فضیلۃ الشیخ عامر بن محمد فداء بہجت حفظہما اللہ تعالیٰ کا پودرا تشریف لائے تھے، انہوں نے بھی اپنے خصوصی خطاب میں علمی تاثرات کے ضمن میں اور نجی مجلس میں بھی جن کلمات عالیہ سے حضرت کو خطاب فرمایا یہ حضرت کی عنداللہ مقبولیت کی دلیل ہے، حضرت دامت برکاتہم نے بھی ان مہمانوں کا استقبال محض مدینہ منورہ کی عظیم نسبت کی وجہ سے کیا، جنوبی گجرات کے اساتذۂ حدیث کو بھی

مسلسل بالا ولیت والی پُررونق مجلس میں دعوت دے کر آپ نے عرب مہمانوں کو علمائے گجرات کی خدمات سے واقف کرایا اور شان دار دعوت بھی فرمائی۔ فجزاہ اللّٰہ تعالٰی أحسن الجزاء!

حضرت دامت برکاتہم کے علمی خطوط:

حضرت مفکر ملت نے اس ناچیز کے نام کئی خطوط لکھے ہیں، جن میں علمی حقائق، تاریخی معلومات اور جدید کتب کی جان کاری سے متعلق قیمتی باتیں ذکر فرمائی ہیں، ان کا نمونہ پیش خدمت ہے:

''عزیزم مولوی اقبال صاحب ٹنکاروی ودیگر احباب واساتذۂ کرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! امید ہے کہ آپ سب بعافیت ہوں گے، بندہ محمد یوسف نجرامی کی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، اس کتاب کا نام ''**العلاقة السياسية والثقافية بين الهند والخلافة العباسية**'' ہے، دارالفکر، بیروت، لبنان سے طبع ہوئی ہے، اچھی دل چسپ کتاب ہے۔ صفحہ ۱۷۱ پر ''**النشاط الثقافي في بغداد**'' کے عنوان کے ماتحت یہ بات معلوم ہوئی کہ گندھار ضلع بھروچ کی لڑکیاں دارالخلافہ بغداد تک پہنچتی تھیں، جن میں بچوں کی تربیت کرنے والیاں بھی ہوتی تھیں اور گانے والیاں بھی، ان میں خمار ہندیہ بہت ہی مشہور گانے والی تھی، جو گندھار کی باشندہ تھی اور اس کو خدیجہ بنت ہارون بن عبداللہ الربیع کے دادا نے دو لاکھ درہم میں خریدا تھا، اصل عبارت یہ ہے:

''**وخلال دراستنا للعصر العباسي نجد النشاط الثقافي للهنود**

بارزا في بغداد، وقدمت إلى بغداد كثير من النساء الهنديات من السند وغجرات بجنوب الهند، وعشن في بلاط الخلفاء، وامتلئت بهن الأسواق والندوات، ودخلن بيوت العرب كسيدات ومربّيات الأطفال ومطربات، وكانت من أشهر تلك الهنديات (خمار القندهارية)، هذه حكايتها كما روتها خديجة بنت هارون بن عبد الله الربيع أنها كانت من مدينة قندهار، اشتراها جد خديجة بمائتي ألف درهم".

یہ پڑھ کر مجھے یہ عنوان ذہن میں آیا:

''بھروچ کی حسینائیں بغداد کے شاہی محلات میں''

چوں کہ ایک تاریخی معلومات ہے، اس لیے تحریر کردی جس سے بھروچ اور بغداد کے وسیع تعلقات کا پتہ چلتا ہے، ''وامتلئت بهن الأسواق و الندوات'' بتلاتا ہے کہ کثیر تعداد میں یہاں کی عورتیں بغداد جاتی تھیں اوراس طرح دارالخلافہ اوربھروچ کا مضبوط تعلق قائم ہوا، کاش کہ کوئی باہمت شخص گجرات کی قدیم تاریخی کتابوں سے اس موضوع پرمواد جمع کرے، کیا گجرات کے کسی مؤرخ نے بھی اس پرروشنی ڈالی ہے؟اس کے لیے گجرات کے تاریخ دانوں سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بھروچ شہر میں کوئی قدیم تاریخ ہے جوبھروچہ ہال میں تھی؛تحقیق فرمائیں''۔

اس کے جواب میں تحقیق کے بعد یہ خط میں نے حضرت کے نام روانہ کیا تھااوراس کے بعدایک کتاب ''عرب ممالک اورصوبۂ گجرات کے تعلقات'' نامی ۴۸۴ صفحات کی بھی لکھی

ہے،جس پر حضرت مفکر ملت صاحب دامت برکاتہم کی تقریظ بھی ہے۔ بندہ نے حضرت کے استفسار پر خط میں ذکر کردہ تاریخی معلومات کے سلسلہ میں تحقیق کر کے اپنی معلومات کے مطابق مضمون لکھا تھا، وہ بھی پیش خدمت ہے:

’’بخدمت گرامی قدر مفکر ملت جناب حضرت الاستاذ

مولانا عبداللہ صاحب دامت برکاتہم/ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! بندہ خیر وعافیت سے ہے اور آپ محترم کی خیریت وعافیت کا بارگاہ رب العزت میں خواہاں ہے۔

ہندوستان سے ہزاروں میل کی دوری کے باوجود حضرت والا محترم ومکرم کے علمی وادبی، تاریخی اور تربیتی مضامین سے ہم طلاب مستفید ہوتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ آپ کے علمی، ادبی وتربیتی اس فیض کو ہم پر تاحیات مستعار جاری وساری فرمائے اور آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ خوش وخرم رکھے۔آمین!

دیگر عرض یہ کہ حضرت والا نے زیر مطالعہ کتاب ’’ **العلاقة السياسية والثقافية بين الهند والخلافة العباسية**‘‘ کے گندھاروالے مضمون کا ذکر فرمایا،اس سے خلافت عباسیہ کے ساتھ بھروچ کے مراسم قدیمہ کا پتہ چلتا ہے۔ آپ مکرم ومحترم نے گجرات کے مؤرخین کا تذکرہ فرمایا کہ اس سلسلہ میں وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ خاص کر کے بھروچ کی قدیم تاریخ، (بھروچہ ہال والے کتب خانے میں) تلاش کرنے کا ذکر فرمایا تو بندہ بھروچ کے اس کتب خانے (رائے چنڈ ڈپ چنڈ لائبریری)میں تاریخ کی تمام کتابیں

دیکھ کر آیا، بھروچ کی تاریخ کے حوالہ سے قابل اعتنا اور تاریخی مواد والی صرف دو چار کتابیں دست یاب ہوئیں لیکن ان میں بھی ہمارے موضوع سے متعلق کوئی بات نہیں تھی، بھروچ کے بندر سے عرب ممالک جانے والے مال یا وہاں سے آنے والے سامان کا ہی صرف اجمالاً تذکرہ ہے، ثقافتی رشتہ کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں ہے؛ بل کہ بھروچ اور گندھار کے سلسلہ کی باتیں مسلم مؤرخین (علامہ بلاذری اور ابن بطوطہ) کے حوالے سے ہی ذکر کی ہیں، ایک کتاب ''بھانگیو بھانگیو بھروچ'' میں گندھار کی تاریخی معلومات ہیں؛ لیکن وہ بھی جین مذہب کے مندروں سے متعلق ہے، ہال کی منتظمہ صاحبہ سے بھی اس سلسلے میں گفتگو ہوئی، انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا، البتہ دوسرے کتب خانوں اور اہل تاریخ سے اس سلسلہ میں دریافت کر کے معلومات فراہم کرنے اور ہر قسم کا علمی تعاون کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

بندہ نے بڑودہ ایم ایس کالج اور سورت کے جنوبی گجرات یونی ورسٹی کے کتب خانے سے بھی رابطہ قائم کیا ہے، لیکن ابھی تک وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے، جواب ملنے پر ان شاء اللہ آپ محترم کو اطلاع دی جائے گی، دارالعلوم ماٹلی والا کے مکتبہ میں ایک کتاب ''العصر العباسی'' (دکتور شوقی ضیف) ہے، اس میں اجمالاً ''مغنیات ہندیہ'' کا تذکرہ ہے، اسی طرح ''کتاب الاغانی'' میں بھی اجمالا تذکرہ ہے، ''البرامکہ'' نامی کتاب میں خاندان برامکہ کے زمانۂ عروج میں طب ومغنیات ہندیہ کا اجمالی تذکرہ ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحبؒ نے ''العقد الثمین'' میں لکھا ہے:

كانت جواري السند وإمائها مشهورة في القيام على مصالح الأولاد وأداء الواجبات في تربيتها، وحسن خدماتها، ولذا كان النجباء والشرفاء من المسلمين يرغبون إلى اتخاذ السنديات جواري وسراري. (ص:۳۰)

اسی طرح (ص: ۱۲۰) پر لکھا ہے: **وغزا عباد بن زياد ثغر الهند من سجستان فأتى سناروذ ثم أخذ على حوى كهز إلى الروذبار من أرض سجستان إلى الهند مند، فنزل كش (کچھ) و قطع المفازة حتى أتى القندهار، فقاتل أهلها فهزمهم وفلهم وفتحها بعد أن أصيب رجال من المسلمين، ورأى قلانس أهلها طوالا فعمل عليها فسميت العبادية، وقال ابن المفرغ:**

كم بالجروم وأرض الهند من قدم ومن سراتک قتلى لاهم قبروا
بقندهار و من يكتب منيته بقندهار يرجم دونه الخبر

(فتوح البلدان: ص ۴۲۲)

(قال القاضي): كش ويقال لها قصة أيضا ناحية بين السند و الكجرات، وهي كچھ۔ قال الحموي: كش مدينة بأرض السند، و أيضا كش أو كس مدينة تقارب سمرقند وقرية من جرجان، وأما القندهار فكما قال الحموي: مدينة من بلاد السند والهند مشهورة في الفتوح۔ وقال في ظفر الواله: قندهار بندر صغير على

خور كنبايت، وهي اليوم تدعى بگندهارا من توابع بهروچ، وأما كابل وقندهار فليس مرادهھنا. (ص: ۱۲۱)

اسی طرح قاضی رشید بن زبیر کے حوالے سے ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' (حصہ اول: ص/ ۱۱۵) پر بھی گندھار کا تذکرہ ہے، خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں ۱۵۱ھ کو ہشام بن عمرو تغلبی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ کو عبور کرکے قندھار (گندھار ضلع بھروچ، گجرات) پر حملہ کیا تو یہاں اس نے لوہے کا ایک موٹا سا ستون پایا جو ایک سو ساٹھ (۱۶۰) ہاتھ لمبا تھا، ہشام نے مقامی لوگوں سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ اہلِ فارس کی اس زمانے کی تلواریں ہیں جب انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملہ کرکے ہمارا یہ ملک فتح کیا۔قندھار کے فتح کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اکھٹا کرکے توڑ ڈالیں، انہیں ٹوٹی ہوئی تلواروں سے یہ ستون بنایا گیا، اہل یمن کا خیال ہے کہ تبع نے اس موقع پر یہ شعر کہا تھا ؎

ولو نعرت بقندهار نعرة

خرت صوامعها وكل عمود

(ص: ۱۱٦)

فتوح البلدان (ص: ۴۳۱) پر لکھا ہے:

وأتى القندهار في السفن ففتحها وهدم البُدّ وبنى موضعه مسجدا، فأخصبت البلاد في ولايته وتبركوا به، ودوخ الثغر وحكم أموره.

(ص: ۴۳۱) گندھار ہمیشہ سندھ کے تابع رہا۔(تاریخ سندھ: ص: ۱۵۵-۱۵۸)

حضرت مفکر ملت نے اس خط کے جواب میں پھر حوصلہ افزا جواب لکھتے ہوئے فرمایا:

''عزیزم مولوی اقبال احمد صاحب ٹنکاروی فلاحی زادکم اللہ فضلا وعلماً

ودیگر ارباب ذوق　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! کافی انتظار کے بعد آپ کا مفصل محبت نامہ موصول ہوا، آپ نے تاریخی معلومات کے لیے جو محنت فرمائی اس سے دل بہت خوش ہوا، ہم طالب علموں کا کام جستجو میں لگا رہنا ہے، بغیر محنت اور بغیر طلب کے علم میں اضافہ مشکل ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب کو علمی کاموں کے لیے مزید ہمت اور توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

اس عریضہ کے ساتھ رزین بن معاویہ العبدریؒ کے بارے میں کچھ معلومات ارسال کرتا ہوں، اس لیے کہ صاحب مشکاۃ شریف نے بعض روایتوں کو ان سے نقل فرمایا ہے اور رواہ رزین کہہ کر خاموش ہوگئے ہیں، بندہ نے جس سال مشکاۃ شریف پڑھائی تھی اس وقت ان کے بارے میں جستجو کی تھی، مگر تفصیلات نہ مل سکی تھیں، سوائے نام کے، اس کو حاشیہ پر نقل کر دیا تھا، **هو رزين بن معاوية العبدري**؛ مگر ابھی علامہ شوکانیؒ کی ''**الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة**'' کا مطالعہ کر رہا تھا، جس پر عبدالرحمن بن یحییٰ المعلمی الیمانی کی تعلیقات ہیں اور الازہر کے کلیۃ الشریعۃ کے استاذ عبدالوہاب عبداللطیفؒ نے اس کی تصحیح کی نگرانی فرمائی ہے تو رزین کے بارے میں کچھ نئی باتیں سامنے آئیں؛ وہ مشکاۃ شریف کے اساتذہ کے کام کی ہیں۔ ترکیسر، ہانسوٹ، کنتھاریہ اور جمبوسر کے اساتذہ کو مطلع فرمائیں

اور اگر ان کے پاس مزید معلومات ہوں تو بندہ کو مطلع فرما کر احسان فرمائیں، میرے جیسے طالب علم کے لیے آپ کا تعاون مفید ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ!

حضرت مفکر ملت نے اس کے بعد ایک طویل مضمون علامہ رزین کے متعلق تحریر فرمایا ہے، جس کو طوالت کے خوف سے چھوڑ رہا ہوں۔

آگے فرماتے ہیں:

مشکاۃ شریف کے اساتذہ کو چاہیے کہ صاحبِ مشکاۃ رحمہ اللہ نے جن سے روایتیں نقل فرمائی ہیں ان کے حالات کی تحقیق فرمائیں۔ ہمارے نوجوان مدرسین نے اگر اس پر کام کیا ہو تو ضرور بندہ کو مطلع فرمائیں، مولانا یوسف ٹنکاروی، مولانا ابوبکر موسالی، مولانا احمد ٹنکاروی، مولانا احمد دیولوی فلاحی وغیرہ علما کو اس کی فوٹو کاپی ارسال فرمائیں، ڈابھیل مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی کو بھی نقل بھیج دیں، تاکہ وہاں اساتذہ سے مزید معلومات مل سکے، فوٹو کاپی کر لی جائے، زحمت تو ہوگی مگر علمی کام میں تعاون کا اجر بھی ملے گا۔ ان شاء اللہ!

منقولہ عبارت سے بندہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ: رزین بن معاویہ العبدری کی کنیت ابوالحسن تھی اور وہ مالکی المذہب تھے، مکہ معظّمہ میں سکونت رکھتے تھے، ان کا زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کا ہے، انہوں نے صحاح ستہ کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی سعی فرمائی اور اس میں اور روایتیں بھی داخل فرمائی ہیں، وہ ناقل حدیث تھے، ناقد حدیث نہیں تھے، ان کی سند بھی نازل تھی، فیروز آبادیؒ نے ان کے بارے میں جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے

بعد ان سے جو روایتیں نقل ہوئی ہیں اس کو علمائے محدثین کے اصول کے مطابق جانچ پرکھ کر ہی قبول کرنا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ میرے جو احباب مشکاۃ شریف کا درس دے رہے ہیں اس پر مزید تحقیق فرما کر ناچیز دور افتادہ غریب الدیار کو مطلع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ دعاؤں کا محتاج غریب الدیار عبداللہ غفرلہ کاپودروی''۔

ہمارے اسلاف کی زندگیوں اور حالات و سوانح کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف میں علمی طلب و تحقیق اور ذوق و شوق غالب تھا، ہر وقت علم کی طلب اور دھن لگی رہتی تھی، اسی طلب اور دھن کا نتیجہ تھا کہ علم کے اعلی معیار پر پہنچے تھے اور اسلاف کی عملی زندگی کا مطالعہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ علم کی طلب و جستجو کرتے کرتے علم کا طالب جوں جوں ترقی کرتا رہتا ہے؛ یونہی اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے، کسی مقام پر سیرابی نہیں ہوتی؛ بل کہ وہ ہل من مزید کا مصداق ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا:

منهومان لا يشبعان: منهوم في العلم لا يشبع منه، و منهوم في الدنيا لا يشبع منها. (مشكاة المصابيح: كتاب العلم، الفصل الثالث، رقم الحديث: ٢٦٠، ص: ٨٦، ج: ١، ط: المكتب الإسلامي بيروت)

حضرت الاستاذ کے مذکورہ حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ آپ محترم بھی اس حدیث کے مصداق اور جیتی جاگتی عملی تشریح ہیں، آپ کی علم کی حرص اور بھوک کبھی سیر نہیں ہوتی، میرے خیال میں اہل علم کی نظر میں وقت کی قدر کیا ہوتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے حضرت کی مجلس میں بیٹھنا چاہیے۔

بندہ کی تصنیفات پر آپ کی حوصلہ افزائی:

''دارالعلوم ماٹلی والا'' سے اردو، عربی اور گجراتی میں شائع ہونے والی جتنی بھی کتابوں پر تقریظ تحریر کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی گئی، آپ نے پیرانہ سالی اور بیماری و مرض کا خیال کیے بغیر ہر مرتبہ تقریظ کے علاوہ حوصلہ افزا کلمات بھی تحریر فرمائے؛ بل کہ یہاں کی شائع شدہ کتابیں ملک و بیرون ملک اہلِ علم کی خدمت میں بھی پہنچانے کا آپ التزام فرماتے ہیں۔آپ کی تقریظ خلاصہ ہوتی ہے، مذکورہ تصنیف میں لوگوں کے لیے کیا فوائد ہیں ان کی بھی نشان دہی فرماتے ہیں، اگر کتاب میں عصر حاضر کے مسائل کی بابت کوئی تذکرہ ہو تو حضرت معاشرہ کے ان مسائل کی طرف توجہ ضرور مبذول کرواتے ہیں تا کہ لوگوں کو اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس ہو۔

جمع کتب کا اہتمام:

مسلمانوں کے علمی عروج کے دور میں مسلمان ملکوں میں جگہ جگہ کتب خانے قائم ہوئے، جن میں کتابوں کی بڑی تعداد ہوتی تھی، یہ کتب خانے حکومتی سطح کے بھی ہوتے تھے اور ذاتی سطح کے بھی، اس ملک میں بھی ہمارے اسلاف کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق کتابیں جمع کرتے تھے، گجرات جیسے صوبہ میں جہاں مطالعہ وتحقیق کا ذوق نہ ہونے کے درجہ میں ہے؛ حضرت دامت برکاتہم نے معیاری کتابیں جمع کی ہیں، بل کہ کتب خانہ قائم کرتے ہوئے اس کے دروازے ہمیشہ علما و محققین کے لیے کھلے رکھے ہیں۔

آپ کے کتب خانے میں ہر فن کی معیاری کتابیں جمع کی گئی ہیں، جن سے آپ کا اعلی ذوق اور علمی حرص وطلب جھلکتی ہے، بندہ کی رائے یہ ہے کہ شاید گجرات میں کسی کے پاس کما وکیفا اتنا بڑا ذاتی وشخصی کتب خانہ نہیں ہوگا۔اگر ہم بھی ان اسلاف کا سا شوق و ذوق پیدا کرنا

چاہیں تو ضروری ہے کہ ہمیں بھی بیدار مغزی کے ساتھ پیچھے مڑ کر اپنے اسلاف اور حضرت دامت برکاتہم کی زندگی کا آئینہ دیکھنا ہوگا۔

اوصافِ حمیدہ:

یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ استاذ محترم حضرت مولانا قاسم صاحب آنتی دامت برکاتہم تشریف لائے، حضرت سے اس کا تذکرہ کیا اور دریافت کیا کہ آپ کا حضرت مولانا سے بہت پرانا تعلق ہے تو آپ حضرت مفکر ملت کے سلسلے میں اپنا تجربہ بیان فرمائیں۔

اس پر حضرت مولانا قاسم صاحب نے فرمایا کہ میرا مفکر ملت کے ساتھ ۱۹۵۵ء سے تعلق ہے، میں نے ان میں جو خوبیاں دیکھیں وہ دوسروں میں بہت کم دیکھی ہیں:

(۱) ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تعصب (علاقائی، اداری، قومی، مسلکی یا مشربی) بالکل نہیں ہے، ان کا دل مخلص ہے، (**"ليس في قلبك غش لأحد"** کا مصداق ہے۔)

(۲) کسی بھی چھوٹے کو بڑا بنانا، چاہے وہ آپ کے برابر ہوجائے یا آپ سے بڑھ جائے، اس کی ان کو فکر ہوتی ہے، یہ بہت جگر گردہ کی بات ہے، آج کل تو استاذ ہی نہیں چاہتا ہے کہ شاگرد ان سے آگے بڑھ جائے۔

(۳) غیبت آپ کو بالکل پسند نہیں ہے، کسی سے رائے کے اختلاف کی بنیاد پر عداوت بالکل نہیں رکھتے ہیں، کسی کی کوئی بات پسند نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ صرف اتنا فرمادیتے ہیں کہ یہ بھی ایک رائے ہے۔

(۴) آپ کے معاشی حالات ابتدا میں اچھے نہیں تھے، پھر بھی مہمان نوازی میں کبھی کمی نہیں کرتے تھے، عشا کے بعد طلبہ کو مسجد میں یا دارالاقامہ میں بھیجتے تھے کہ کوئی

مہمان ہوتو گھر پر لے آؤ۔

(۵) کسی سے ملتے ہیں تو اس کی اچھائیاں ہی مدنظر رکھتے ہیں، اس کی برائیاں جانتے ہوئے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں۔

وقت کی پابندی:

وقت کی پابندی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، مدرسہ کے زمانہ میں بھی ہمیشہ آپ وقت سے پہلے پہنچ جاتے اور چوراہے پر بہت سی مرتبہ کھڑے ہو جاتے، اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی وقت کے پابند ہوتے، کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ تاخیر کرے، اسی طرح اگر کسی سے اپائنٹ منٹ لیا ہوتو ضرور وقتِ مقرر سے پانچ منٹ پہلے پہنچ جائیں گے، ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں فرمائیں گے اور اگر کسی کو آپ نے وقتِ مقرر ملاقات کے لیے دیا ہوتو اپنے ساتھ بھی یہی پسند فرماتے ہیں کہ سامنے والا شخص وقت مقرر پر آجائے، آپ تیار ہوکر اس کا انتظار فرماتے ہیں، تاخیر پر آپ کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کا مناسب انداز میں اظہار بھی فرما دیتے ہیں، نماز کے اندر بھی یہی حال تھا، کبھی ہم نے نہیں دیکھا کہ رکعت چھوٹ گئی ہو۔

حضرت کی قیمتی نصائح:

حضرت والا کی نصائح تو بہت ہیں جس کے لیے ایک دفتر چاہئے، لیکن علما اور اساتذہ کی نسبت سے تین چار نصیحتیں ذکر کر دیتا ہوں:

(۱) ایک تو یہ کہ حضرت والا ہمیشہ یہ فرماتے ہیں کہ کبھی بھی کسی دوسرے استاذ کی بُرائی طلبہ کے سامنے نہیں کرنی چاہیے، دوسرے استاذ کی وقعت طلبہ کی نظر میں گرتی ہے یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے، لیکن سب سے پہلے اس بُرائی کرنے والے استاذ کی وقعت تو فوراً ہی طلبہ کی

نظر میں گر جاتی ہے۔

(۲) دوسری نصیحت ہمیشہ یہ فرماتے کہ اگر کوئی آپ سے مسئلہ پوچھے تو فوراً جواب نہ دو! بل کہ یہ کہو کہ کتاب دیکھ کر جواب دوں گا، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ غلطی کی شرمندگی سے حفاظت ہو جائے گی، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں بھی وقار اور اعتبار بڑھے گا۔

(۳) ایک عالم کے پاس ہر فن کی کم از کم ایک کتاب تو ضرور ہونی چاہیے، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، تصوف، مواعظ، وغیرہ کی، تا کہ بوقتِ ضرورت ان کی طرف رجوع کر سکے۔

اساتذہ کے درمیان توازن:

اساتذہ میں فرقِ مراتب کے ساتھ توازن برقرار رکھنا، آپسی چپقلش سے باز رکھنا اور کام کی دھن بنائے رکھنا، باصلاحیت و باکمال علما تیار کرنے کا جذبہ بیدار رکھنا اور اپنے اپنے میدان میں ترقی کی منازل طے کرنے کا شوق پیدا کرنا، اہل اللہ اور اکابر اہلِ علم سے وابستگی کا رجحان اور ادارہ کو ہر میدانِ علم کی ضرورت ہے، سب کو اپنے کام کی مکمل آزادی ہے، بل کہ ہر ایک کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہ احساس پیدا کرنا، یہ حضرت کے وہ قائدانہ اختصاصات تھے جن کی وجہ سے وہ ملک وملت کو بہت کم عرصہ میں ایک عظیم بافیض ادارہ اور سیکڑوں باکمال فضلا دینے میں کامیاب رہے۔

معاصرین کی منافرت اور تیزی سے ابھرتے ادارہ کے ساتھ فطری حسد کو اپنی چادرِ اخلاق سے ڈھانک لینا وہ وصف ممتاز تھا جس نے انہیں اپنے معاصرین کی سوچ سے بڑا بنا دیا تھا۔

وہ جب ترکیسر تشریف لائے مقامی علما کی ایک جماعت موجود تھی، آپ باہر سے آئے تھے اور ادارہ کو ملک ہی نہیں عالمی شہرت یافتہ جامعہ بنانے کے لیے پُرعزم تھے، اس لیے

آپ نے مکتب ''فلاحِ دارین'' اور مدرسہ فلاح دارین کے درمیان مقامی و بیرونی اساتذہ کی ایسی حکیمانہ تقسیم فرمائی کہ مقامی طلبہ و طالبات کی بہترین مکتبی تعلیم کے لیے مقامی نو جوان اور سن رسیدہ اساتذہ رہیں جوان کے والدین سے بھی شناسائی اور تعلق رکھتے ہوں اور دارالعلوم میں ملک بھر سے چن چن کر ماہرینِ فن جمع کیے جائیں جن کے فیض سے جید الاستعداد مختلف میادینِ علم کے ماہر علما تیار ہو سکیں، روزِ اول سے اس حکمت پر سب کو راضی و متفق کرنا دشوار تھا، اس لیے شہری تنگ نظری کی چِتا سے بھی گزرنا پڑا؛ لیکن انہوں نے اپنے مزاج کریمانہ میں فرق نہ آنے دیا اور نہ ہی اپنے حوصلہ اور عزم کو مضمحل ہونے دیا، جو فیصلہ کیا پوری اولوالعزمی کے ساتھ کیا اور فلاح دارین کے تابناک عروج نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے فیصلے میں کتنے مخلص اور حق بجانب تھے۔

مختلف علمی شخصیات کے تأثرات:

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندویؒ کی تشریف آوری مدرسہ میں ۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۰/ مارچ ۱۹۸۳ء بروز پنج شنبہ ہوئی۔ مدرسہ کا معائنہ فرما کر آپ نے جو تأثرات پیش فرمائے اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

> ''بسم اللہ الرحمن الرحیم، نحمدہ و نصلي علی رسولہ الکریم
>
> آج بتاریخ ۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ بروز پنج شنبہ مدرسہ 'فلاح دارین' ترکیسر میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس مدرسہ میں بہت سی ایسی باتیں دیکھنے میں آئیں، جن کا آج کل دینی مدارس میں فقدان ہے، دینی مدارس کے ذمے دار حضرات اور مدرسین کو چاہیے کہ آ کر اور کچھ دن رہ کر کام کرنے کا سلیقہ سیکھیں۔ الخ''

اسی طرح حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ کے بھی مدرسہ سے دیرینہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے، چناں چہ حضرت مفتی صاحب کی تشریف آوری بھی مدرسہ میں بار بار ہوتی رہی، حضرت والا قبلہ مفتی صاحب سے اپنے تعلیمی نظام کے معائنہ کی درخواست کرتے، حضرت مفتی صاحب شوق ورغبت سے معائنہ فرماتے، آپ کی مجالس طلبہ اور اساتذہ کے درمیان قائم ہوتیں اور سب کو مفتی صاحب کے علوم ومعارف سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا، آپ کے تأثرات درج ذیل ہیں:

”آج مولانا عبد اللہ صاحب نے مدرسہ کے عام شعبوں کا معائنہ کرایا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے دینی نصاب میں وقت کے تقاضوں کا بھی پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ دینی کتابوں کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے اور ابتدائی تعلیم کے بچے دینی کورس کے ساتھ حساب، جغرافیہ اور ضروری تاریخ، عام معلومات وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کر لیتے ہیں۔“

دوبارہ حضرت مفتی صاحب کی ۹؍ربیع الاول ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۰؍اپریل ۱۹۷۶ء کو تشریف آوری ہوئی، جس کے معائنہ میں آپ رقم طراز ہیں:

”طلبہ اور اساتذۂ کرام سے مل کر مدرسہ کی ترقی پذیر کارگزاریوں کا اندازہ ہوا، ماشاء اللہ ہر کام صاف ستھرا، سلیقہ اور شعور کے ساتھ طلبہ کی استعداد قابل اعتماد اور اساتذۂ کرام کی محنت قابل داد، اخلاص وعمل، حسن انتظام اور جذبۂ خدمت ہر پہلو قابل تعریف اور مستحق تحسین ہے۔“

شعبۂ ادب عربی کے سلسلہ میں حضرت والا کے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ سے گہرے روابط رہے۔ حضرت مرحوم ہی کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت الاستاذ مولانا نور محمد صاحب

مدظلہ العالی کی خدمات مدرسہ کو حاصل رہیں، جن کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ وشجرۂ پُر بہار حضرت مولانا محمد اقبال صاحب دیولوی کی شکل میں مدرسہ کو فراہم ہوئے جو اس وقت سرگرم عمل ہیں۔ اس نسبت سے حضرت مولانا وحید الزماں کو حضرت والا مدعو فرماتے اور اس شعبہ کی ترقیات کے لیے مشورہ فرماتے۔ اس سلسلہ کا ایک معائنہ ملاحظہ فرمائیے:

''دار العلوم فلاح دارین'' واقع ترکیسر (گجرات) ان چیدہ معاہد اسلامیہ میں ہے جنہوں نے بہت ہی مختصر عرصہ میں اپنے معیار تعلیم اور نظام تربیت میں خصوصی مقام حاصل کیا ہے۔ احقر کو پہلی بار اس باعظمت علمی ادارہ میں ۲۰ /جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۱/ جولائی ۱۹۷۴ء حاضری کا موقع ملا۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ سے مختلف مجلسوں میں مختصر اور طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ درس گاہوں میں جانے اور طلبہ سے مختلف موضوعات پر سوالات کا بھی اتفاق ہوا۔ بفضل اللہ میں نے یہاں وہ سب کچھ پایا جو میرے دل کی آواز تھی۔ درس گاہوں کا نظم، اساتذہ کی تعلیمی دلچسپی اور طلبہ پر غیر معمولی محنت، چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام اور ان کی خصوصی تربیت، صفائی، ستھرائی، پابندی اوقات، مدرسین واساتذہ کا باہم ربط وتعلق یہ سب خصوصیات ہیں جو عام طور پر کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

(حضرت مولانا) وحید الزماں کیرانویؒ''

مدارس کے نصاب تعلیم پر حضرت والا کی برابر نظر رہی۔ مختلف مدارس اسلامیۂ ہند و بیرونِ ہند کے نصاب طلب فرماتے اور حالات حاضرہ سے اپنے نصابِ تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش فرماتے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کے تأثرات حسب ذیل رہے:

''اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بڑا دخل حضرات اساتذہ کا ہے جو اپنے اپنے

فن میں کامل دست گاہ رکھنے کے باوصف، نہایت مخلص، محنتی اور متدین و با اخلاق ہیں۔ ان میں مہتمم جناب مولانا عبداللہ صاحب بھی بلند پایہ اور وسیع النظر عالم ہونے کے ساتھ بڑے مخلص، روشن خیال اور محنتی منتظم ہیں۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ''دارالعلوم فلاح دارین'' ظاہراً و باطناً ایک مثالی دینی درس گاہ ہے۔''

(حضرت مولانا) سعید احمد (صاحب) اکبرآبادی، ۱۰-۱۱/ ۱۹۷۵ء)

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی صاحب کی تشریف آوری ہوئی، لیجیے اس وقت کے مختصر تاثرات:

''احقر مدرسہ ''فلاح دارین'' میں حاضر ہوا، ماشاء اللہ مدرسہ کے حالات سے مسرت ہوئی۔ طلبہ میں عموماً محنت کا شوق ہے، معاشرہ میں شائستگی ہے۔ بعض طلبہ سے کچھ علمی سوالات بھی کئے؛ جوابات بہت بہتر دیئے۔

(حضرت مفتی) محمود الحسن (صاحب) ۲۸،۵، ۱۴۰۱ھ)''

فقہ اکیڈمی کے بانی مبانی و دلِ دردمند کے مالک جناب قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا ایک بہت ہی وقیع معائنہ پیش خدمت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کے انطباعات اٹھارتی کی حیثیت رکھتے ہیں:

''دارالعلوم فلاح دارین کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ مدرسہ کی عمارتیں، درس گاہیں، رہائش گاہیں اور کتب خانہ دیکھا، سالانہ امتحان کے پرچے دیکھے، طلبہ کا زبانی امتحان لیا، اساتذہ کی مجلس میں بیٹھا اور مستفید ہوا اور اب میں پوری بصیرت کے ساتھ شہادت دے سکتا ہوں کہ تعلیم و تربیت دینی کے

اعتبار سے یہ ادارہ نہایت معیاری مرکز ہے، جسے دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ انشاء اللہ ہندوستان میں علوم دینیہ زندہ رہیں گے۔ مدرسہ کی خوش نصیبی ہے کہ اسے جید الاستعداد اور فاضل اساتذہ کی اور ایک وسیع النظر عالم دین کی بحیثیت مہتمم خدمات حاصل ہیں، ورنہ اس قحط الرجال کے زمانہ میں اکثر قدیم مدارس بھی زوال و انحطاط کا شکار ہیں اس لیے کہ ان کو با صلاحیت رجال کار حاصل نہیں، خدا نظر بد سے بچائیں، یہ مدرسہ حقیقت ہے کہ میرے لیے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ثابت ہوا۔

(حضرت مولانا) مجاہد الاسلام قاسمی (رحمۃ اللہ علیہ)

۲،شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ مطابق ۵،اپریل ۱۹۸۴ء کو خوش قسمتی سے محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ کی تشریف آوری سے مدرسہ مشرف ہوا۔حضرت والا اس قسم کے موقع کے متلاشی رہتے؛ چناں چہ انہی کے ہاتھوں بخاری شریف کا ختم بھی کرایا اور آپ نے اپنے قیمتی تأثرات سے تحریری شکل میں نوازا جو حسب ذیل ہیں:

’’میں ۱۴؍رجب ۱۴۰۶ھ کو ترکیسر پہنچا اور مجھ کو ’’جامعہ فلاح دارین‘‘ دیکھنے کی سعادت ملی۔ میں نے ختم بخاری شریف میں شرکت کی، میں اس کو بھی اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ صحیح بخاری کا آخری باب پڑھ کر اس سال کے درس بخاری کو انتہا تک پہنچایا۔ مدرسہ کی عمارتوں اور ان کی نظامت سے مسرت حاصل ہوئی۔ انتظام میں بھی خوش اسلوبی نظر آئی۔ یہاں کے مدرسین وطلبہ میں طلبِ علم کا ولولہ پایا۔ منتظمین اور مدرسین وطلبہ اگر اسی طرح اپنے اپنے فرض کے ساتھ کام کرتے رہے تو انشاء اللہ مدرسہ کو ترقی اور مزید

مقبولیت حاصل ہوگی اور امت کے لیے ایک بہت مفید ادارہ ثابت ہوگا۔

(حضرت مولانا) حبیب الرحمن (صاحب) اعظمی (رحمۃ اللہ علیہ)''

صل من قطعک واعف عمن ظلمک وأحسن إلی من أساء إلیک کی جیتی جاگتی تصویر:

ترکیسر کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب نے والد صاحب کو بہت ستایا، بہت تکلیفیں پہنچائیں پھر جب والد صاحب ترکیسر چھوڑ کر کاپودرا آ گئے، اس کے ایک عرصہ بعد وہ مولانا صاحب دوسرے مولانا کے ساتھ کاپودرا آئے؛ مگر وہ کار میں ہی بیٹھے رہے، والد صاحب ان مولوی صاحب کو جو گھر میں آئے تھے چائے کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن وہ انکار کرتے رہے، آخر انہوں نے یہ کہا کہ فلاں مولانا صاحب میرے ساتھ آئے ہیں؛ مگر وہ آپ کے گھر میں نہیں آ رہے ہیں، اگر والد صاحب کی جگہ ہم ہوتے تو شاید یہی کہتے کہ آپ جلدی تشریف لے جایئے وہ گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے؛ مگر والد صاحب کے اخلاق پر قربان جایئے، آپ خود اٹھ کر گئے اور کار میں سے ان مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر پر لے آئے اور چائے ناشتہ کرا کر رخصت کیا، اسی طرح دوسرے ایک مولانا جو بہت مخالفت کرتے تھے، ان کا بیٹا جب والد صاحب کو کاپودرا ملنے آتا، والد صاحب اس کو ہدیہ کے طور پر کبھی پانچ سو یا ہزار روپے دیتے تھے، یہ مجھے میرے ایک دوست نے بتایا، اسی طرح ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا والد صاحب کے خلاف بہت بکواس کرتا رہتا تھا، جب وہ کینیڈا گیا تو اس وقت والد صاحب وہیں کینیڈا میں مقیم تھے، والد صاحب نے اس کی اپنے گھر دعوت کی اور اس سے اس طرح ملے جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں ہے، جب مجھے پتہ چلا تو میں سوچنے لگا کہ آپ کا حوصلہ کتنا بڑا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسے اخلاق سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

اساتذۂ مکاتب ان باتوں کی طرف خصوصی توجہ دیں:

اسی طرح آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا تھا کسی نے مجھے واٹس ایپ کیا کہ آج آپ کے والد صاحب کا بیان جامعہ علوم القرآن جمبوسر میں ہوا تھا، اس میں پانچ چیزوں پر خاص توجہ دلائی:

......* (۱) بچوں کو تجوید کے ساتھ عربی لہجہ میں قرآن پاک سکھایا جائے۔

...* (۲) موجودہ حالات میں عقائد کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

...* (۳) سرکاری اسکولوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اساتذہ ان کا بھی مطالعہ کریں اور اُن میں جو شرکیہ عقائد ہیں ان کے مقابل صحیح عقائد بچوں کو سمجھایا جائے۔

...* (۴) بہشتی ثمر اور دیگر کتب کے مسائل صرف پڑھنے پڑھانے پر اکتفانہ کریں بل کہ اس کی عملی مشق کرائیں۔

...* (۵) بچوں کو اسلامی اخلاق کی طرف توجہ دلائی جائے۔

مکاتب کے نصاب کی فکر:

''لیسٹر یوکے'' کے اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ:

''ہمارا جو یہاں نصاب تعلیم ہے اس پر غور کریں، عامۃً گیارہ بارہ سال کی عمر میں بچے کو بالکل فارغ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے، اکثر سمجھنے کی عمر بارہ سال سے لے کر سولہ سترہ سال کی ہوتی ہے، یہ جو مدت ہے اس میں ان کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے میں آپ علمائے کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک کمیٹی بنائیں اور غور وفکر کریں کہ نصاب میں یکسانیت کیسے ہو، یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر لیسٹر کے اندر چھ مسجدوں میں مکتب چل رہے

ہیں تو ہر ایک کا نصاب الگ الگ ہے، ایک مسجد کا بچہ دوسری مسجد میں جائے گا تو وہ کیا پڑھ سکے گا، اس کو ایڈ جسٹ کرنا مشکل ہوتا ہے، یہ کیسی بد نظمی کی بات ہے، ہم متفقہ طور پر اپنا ایک نصاب بنائیں اور نصاب کو پھیلا کر سولہ سترہ سال تک کردیں کہ ہمارے بچے سولہ سترہ سال تک کم از کم ایک ایک پیریڈ بھی عالم کے پاس آکر بیٹھیں، یہ جو بارہ سال سے لے کر سولہ سال تک کا وقت گزرتا ہے اس میں وہ دین سے بالکل ہٹ جاتا ہے، لہٰذا حکمت عملی اس میں ہے کہ نصاب ایک ہو اور اس کو دراز کیا جائے۔ (صدائے دل)

چمن:

حضرت نے اپنے دور اہتمام میں ''فلاح دارین'' میں چمن (Garden) بنوایا، اس پر کچھ حضرات نے یہ طعنہ دیا کہ یہ تو مدرسہ کو اسکول بنارہے ہیں، حضرت نے اس کا جواب یہ دیا کہ صفائی ستھرائی تو اسلام میں مطلوب ہے (مفہوم) (حضرت دامت برکاتہم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ایک سفر میں عصر کے بعد ''فلاح دارین'' کے چمن میں مجلس تھی، تعلیم اور تعلیمی ماحول پر گفتگو فرماتے رہے، فرمایا کہ ابن خلدونؒ علمی درس گاہوں میں ''چمن'' کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اس کو مخل خیال فرماتے تھے، بعض لوگوں نے اس کو پسند فرمایا ہے، اپنے اپنے ذوق ومذاق کی بات ہے۔''

(رشد وہدایت کے منارص ۱۱۱۔ ۱۱۲)

بیت الخلا کی صفائی کا اہتمام:

چوں کہ میں خود مدرسہ میں پڑھتا تھا، یہ بات جو میں کہتا ہوں یہ کوئی طنز نہیں ہے بل کہ

ایک حقیقت کو بیان کرنا ہے، تاکہ اس پر جیسی توجہ ہونی چاہیے مدارس والے ویسی توجہ دے، جیسا کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے دوراہتمام میں اس پر توجہ دی۔

وہ یہ ہے کہ ''جامعہ ہو یا دارالعلوم یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ طلبا جو بیت الخلا استعمال کرتے ہیں، اس کی صفائی کا جیسا اہتمام ہونا چاہیے ویسا نہیں ہوتا، جب طالب علم قضائے حاجت کے لیے جاتا ہے تو یا تو گندگی اوپر نظر آرہی ہوتی ہے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد وہ گندگی پانی ڈالنے پر بھی نیچے نہیں جاتی، چوں کہ اس کے جانے کا جو راستہ ہے وہ بھر چکا ہوتا ہے اور کبھی ساتھ میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دروازہ ٹوٹا ہوا ہے یا یہ کہ لاک بگڑا ہوا ہے یا یہ کہ ٹب میں زرد نشان نظر آرہے ہیں، یا پانی کے لوٹے میں سوراخ ہوگیا ہوتا ہے اور پانی اس میں سے ضائع ہو رہا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، حضرت کے دوراہتمام میں ان باتوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور بیت الخلا بالکل صاف شفاف ہوتے تھے۔

اہتمام سے متعلق حضرات اکابر کی حضرت دامت برکاتہم کو نصیحتیں:

(۱) حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کو ایک مرتبہ ''فلاح دارین'' کے تعلیمی کوائف معلوم کرنے اور ''دارالعلوم'' کی تعلیمی ترقی کے لیے آپ سے مشورہ کرنے کے لیے دعوت دی گئی تو حضرت تین روز کے لیے تشریف لائے اور اردو سے لے کر دورہ تک ہر جماعت کے طلبا کو جانچا اور مفید مشورے عنایت فرمائے، اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ:

> ''طالب علم کی غلطیوں اور شرارتوں پر فوراً اخراج نہیں کرنا چاہیے، اخراج تو سب سے آخری چیز ہے، طلبا کچھ نہ کچھ شرارتیں کرتے ہیں، ان کی اصلاح و تربیت کرنی چاہیے نہ کہ بات بات میں اخراج اور پھر فرمایا کہ آپ نے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا وہ مضمون پڑھا ہوگا جو انہوں نے اپنی دیوبند کی

طالب علمی کے بارے میں لکھا ہے، کیسی کیسی شرارتیں! اگر ''دار العلوم'' کے مہتمم صاحب ان کا اخراج کر دیتے تو آج امت ان کے قیمتی افکار و خدمات سے محروم ہو جاتی اور فرمایا کہ چوں کہ آپ کے مدرسے کا عوامی چندہ نہیں ہوتا اس لیے چندہ دہندگان کا دباؤ بھی نہیں پڑ سکتا، لہٰذا جو طالب علم عربی کے ابتدائی درجات میں کمزور ہو اس کو قطعاً اگلا درجہ نہ دیں، اس عمل میں تھوڑی مخالفت برداشت کر لیں، مگر اس سے تعلیمی معیار بلند ہو گا۔''

(رشد و ہدایت کے منار، بتغییر)

(۲) حضرت مولانا عمران صاحب بھوپالیؒ نے حضرت والا سے اہتمام سے متعلق نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''میں نے تقریباً پچیس سال ''ندوہ'' کا اہتمام کیا ہے اور اب بھوپال ''تاج المساجد'' کے دار العلوم کا ذمے دار ہوں، اس لیے عرض کرتا ہوں کہ انتظامی معاملات میں تساہل بالکل نہ کرنا، اساتذہ یا اور کارکنوں سے مدرسے کے تعلق سے جو بات بھی کرنی ہو تحریری کرتے رہو اور ان کا چھوٹا سا پرزہ بھی فائل میں رکھو، جب تک اساتذہ کے ساتھ تعلقات اچھے رہتے ہیں تو معاملہ آسان ہوتا ہے، مگر جب کسی وجہ سے ناراضگی ہو جاتی ہے تو ایسی ایسی شکایتیں اور ظلم و زیادتی کی کہانیاں شروع ہوں گی جن کا تمھیں گمان بھی نہ ہوگا، اس لیے ہر بات تحریری ہوگی تو ضرورت کے وقت کام آئے گی، حضرت دامت برکاتہم العالیہ لکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ کی ان ہدایات و ارشادات سے ناچیز نے فائدہ اٹھایا اور واقعی بعد میں یہ چیزیں بہت کارآمد

ثابت ہوئیں۔'' (رشد وہدایت کے منار:ص۱۸۱)

(۳) ''حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ نے مدینہ منورہ میں ایک مجلس میں فرمایا کہ ہمارے ہندوستان کے مدرسوں میں ''مشکاۃ شریف'' تک حدیث پاک کی کوئی کتاب طالب علم نہیں پڑھتا اور اس کا یہ نتیجہ دیکھا کہ بعض طالب علم عربی چہارم تک مدرسہ میں پڑھ کر کسی وجہ سے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث شریف سے محروم ہو جاتے ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ ابتدائی درجہ سے احادیث پڑھاتے جاؤ، پہلے مختصر احادیث پھر درجہ بدرجہ کتابیں پڑھاؤ، حضرت کے اس ارشاد کے بعد ہی ''دارالعلوم فلاح دارین'' میں عربی سوم سے ''ریاض الصالحین'' شروع کروائی گئی۔''

(رشد وہدایت کے منار:ص ۱۲۴)

طلبا کی تربیت:

حضرت والا طلبا کی تربیت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، بالخصوص کھانے کے وقت مطبخ میں تشریف لاتے اور قبل الطعام آدابِ طعام کا مذاکرہ کرواتے، کھانے کے دوران پورے مطبخ میں چکر لگاتے۔ ہر خوانچہ پر نظر رکھتے کہ طالب علم کیسے کھا رہا ہے؟ سنت کے مطابق یا پھر سنت کے خلاف، اگر کوئی طالب علم خلافِ سنت کھا رہا ہوتا مثلاً کوئی دیہاتی قسم کا طالب علم بڑے بڑے لقمہ بنا کر یا پھر پیچ سے کھا رہا ہوتا تو اس کو سمجھاتے کہ چھوٹے چھوٹے لقمہ لے کر اپنی طرف سے کھانا چاہیے اور سنت کے مطابق کھانا چاہیے، اس طرح آدھے گھنٹے تک مطبخ میں تشریف رکھ کر طلبا کی تربیت کی فکر فرماتے۔ نیز بہت سی مرتبہ رات کو گیارہ بجے دارالاقامہ میں تشریف لاتے اور نگرانی فرماتے کہ طلبا کیا کر رہے ہیں؟

طلبہ کی تربیت میں حضرت والا کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے، ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب معاملہ فرماتے، ہر ایک کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکتے تھے اور یہی صحیح طریقہ بھی ہے۔

جن طلبہ کو دیکھتے کہ لکھنے پڑھنے کے شوقین ہیں ان سے خوب محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ آگے نکل جائیں، ان کو مفید مشورے دیتے اور کس موضوع پر کونسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے وہ بتلاتے اور بہت سی مرتبہ خود بھی کتاب دیتے، رسالہ دیتے، اخبار دیتے اور اس طرح طالب علم کو لکھنے پڑھنے پر لگا دیتے اور مزید شوق پیدا فرما دیتے۔

●●●●●

مفکر ملت کی گفتار ونگارشات اور افکار میں مفکر اسلام کی ادبی، دعوتی، اصلاحی اور فکری طرز واسلوب کی جھلکیاں

مرتب

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب

(شیخ الحدیث ومہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

الحمدللہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

حضرت مفکر ملتؒ کا حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ اور آپ کی کتابوں سے لگاؤ:

حضرتؒ ماضی قریب کے اکابرین میں سے جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور جس شخصیت نے آپ کے قلب و دماغ پر گہری چھاپ چھوڑی ہے، وہ شخصیت ہے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ، اور ان کی جھلک حضرتؒ کی تقریر وتحریر اور آپ کی ہر ایک ادا میں نظر آتی ہے، حضرتؒ خود لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میری فکر ونظر کو مولانا کی کتابوں نے جلا بخشی ہے...... مجھے مولانا اور آپ کی کتابوں سے اتنا تعلق ہوا کہ عربی اور اردو کی اکثر کتابیں خرید کر یا کتب خانے سے حاصل کر کے پڑھ ڈالیں، بعض کتابوں کو اس طرح پڑھا کہ عربی اور اس کا ترجمہ دونوں سامنے رکھا اور ایک ایک قطعہ پڑھتا جاتا اور ترجمہ پر غور کرتا جاتا تھا، اس طرح عربی زبان اور اس کی اردو تعبیر کا ڈھنگ بھی معلوم ہوا۔''

(رشد وہدایت کے منار: ص ۱۵۷، گلدستہ: ۳۸۴)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ حضرت مفکر ملتؒ کا غائبانہ تعلق:

یہ ناچیز غالباً ۱۹۵۱ء سے - جب کہ اس کا پنجم کا تعلیمی سال تھا - حضرت مولانا ندویؒ کے بعض مقالات ومضامین سے ''الفرقان'' کے ذریعہ واقف ہوا، نیز مولانا رحمہ اللہ کے کچھ رسائل بھی اردو زبان میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ ہر شخص کو فوراً اپنی طرف مائل کر لیتا ہے، اس لئے ایک کے بعد دوسرا مضمون تلاش کیا جانے لگا، اور اس

طرح حضرتؒ کے ساتھ اوائل عمر میں تعلق پیدا ہو گیا، اور دل میں حضرت مولانا سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہونے لگی، مگر طالب علمی کی زندگی میں اس کی نوبت نہ آسکی۔

(افکار پریشاں: ج/۱، ص:۱۶۱)

حضرت مفکر اسلامؒ سے وابستگی:

چوں کہ میرا بھی تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ سے بہت زیادہ تھا، حضرت مولانا سے میرا بڑا گہرا تعلق رہا اور شاید ہی کوئی کتاب مولانا علی میاںؒ کی ایسی ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو، عربی بھی اور اردو بھی، میں نے اپنے کتب خانہ میں پوری ایک الماری ''ابوالحسنیات'' پر رکھی ہے، مولانا کی چھوٹی بڑی جتنی کتابیں مجھے مل سکیں ان کو حاصل کیا اور مستقل فہرست میں ''ابوالحسنیات'' کے نام سے رکھیں اور جیسے میں ''دارالعلوم دیوبند'' ہر سال جایا کرتا تھا اس طرح میرا دورہ ''ندوۃ العلما'' کا بھی ہوتا تھا اور حضرت بھی دو تین مرتبہ تشریف لائے، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب تشریف لائے، مولانا سلمان صاحب تشریف لائے، مولانا عبداللہ عباس صاحب تشریف لائے تو میں نے ایسی کوشش کی کہ دیوبند، مظاہر علوم اور ندوہ کو ملا کر رہوں گا۔

۱۹۵۹ء میں پہلی ملاقات اور زیارت:

۱۹۵۹ء میں مولانا اسماعیل گارڈیؒ کے صاحبزادگان کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں قیام ہوا، تو اتفاق سے ایک دوست نے اطلاع دی کہ حضرت شاہ عبدالقادر رائپوریؒ آج کل بھٹ ہاؤس سہارنپور میں تشریف لائے ہیں اور حضرت اقدس کے بہت سے خدام کے علاوہ لکھنؤ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ بھی حضرت کے ساتھ مقیم ہیں۔

ان دونوں عظیم ہستیوں کے سہارنپور میں تشریف لانے کی خبر سے بہت مسرت ہوئی اور

دل کی دیرینہ تمنا برآنے کی سبیل پیدا ہوگئی، شام کی گاڑی سے سہارنپور روانہ ہوکر حضرت رائپوریؒ کی قیامگاہ پہنچے اور اکابرین کی زیارت سے شرف حاصل ہوا۔

یہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سب سے پہلی ملاقات تھی، پہلی ہی ملاقات میں حضرت کی سادگی، اور محبت بھری باتوں نے بہت متأثر کیا، حضرت رائپوریؒ کے خدام میں پاکستان کے علماء بھی تھے، اور مولانا رحمہ اللہ ان کے ساتھ ضروری گفتگو میں مصروف تھے، اس لئے مولانا علی میاں صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ زیادہ بات چیت کا موقع نہ مل سکا مگر حضرت کے دیدار سے مشرف ہونے سے دل بہت خوش ہوا۔

حضرت رحمہ اللہ سے دوسری ملاقات اور مولانا کے مفید مشورے:

پھر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ان ہی دنوں میں چند دوستوں کے ساتھ مشورہ ہوا کہ ہم لوگوں کو عربی زبان میں کوئی پرچہ شائع کرنا چاہئے، اس زمانہ میں جامعہ ازہر کے مبعوث شیخ محمود عبدالوہاب محمود طنطاوی عربی زبان کے استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں مقیم تھے، ان سے اس بارے میں مشورہ ہوا تو انہوں نے ہمت افزائی فرمائی، چنانچہ ’الیقظۃ‘‘ نامی پرچہ شائع کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا گیا، مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحبؒ کے ہمراہ حضرت رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ’’الیقظۃ‘‘ کی اشاعت کی اطلاع اور شائع کردہ پرچے خدمت اقدس میں پیش کئے، حضرت رحمہ اللہ نے بہت ہی ہمت افزائی فرمائی اور عالم عرب کے علمی پرچوں اور عرب ادباء کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کا ادبی، دعوتی، اصلاحی اور فکری طرز واسلوب:

حضرت مولانا کی سب سے پہلی کوشش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ (Intellectual

Class) کو متأثر کیا جائے، مولانا نے اس طبقہ کی نفسیات کو سمجھا ہے، اور اس کو ایسے اسلوب میں خطاب کیا ہے جس سے وہ مانوس ہو۔

اور خاص طور پر نظام تعلیم کو صحیح رخ دینے کی کوشش کی ہے، رائج نظام تعلیم کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے، اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے۔

حضرت مولانا نے اہم کام یہ کیا ہے کہ ادب کو اصلاح وتجدید کا ذریعہ بنایا، اس زمانے میں ادب پر دین سے بیزار اور ملحدانہ افکار رکھنے والے ادباء ومفکرین کی چھاپ تھی۔

حضرت مولانا نے صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر ادب کی لگام اسی طرح ملحدوں کے ہاتھ میں رہی تو نوجوانوں کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

مولانا نے ایک طرف اس کی دعوت دی کہ ادب کی سرحدوں کو وسیع کیا جائے، دوسری طرف خود مولانا نے عربی زبان وادب کے بہترین نمونے پیش کئے۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو اسی نظر سے کھنگالا ہے، اس کے نشیب وفراز کو پرکھا ہے، اور ملت کو اس میں سے قیمتی موتی نکال کر دئے ہیں۔

مولانا کی تاریخیت کے نمایاں خدوخال ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ مستند حوالوں کے ذریعہ اور تاریخی شخصیات کے ذریعہ حالات کا تجزیہ کرتے ہیں، ماضی سے رشتہ کو باقی رکھتے ہیں، بزرگان دین پر بے جا تنقید کرنا ناپسند ونامحمود سمجھتے ہیں، اور مستقبل کے لئے زادراہ فراہم کرتے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بنیادی طور پر ایک داعی تھے، وہ سیاست کے آدمی نہیں تھے، چنانچہ تحریر وتقریر میں ان کا داعیانہ وصف بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اہل دل کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز، شعر وادب کے قلم کا ساز، اہل فکر وعلم

کا ذوق جستجو اور مجاہدین کی روح عمل؛ یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہو گیا کہ ان کی اپنی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہو گئی ہے، اس میں جامعیت بھی ہے اور اعتدال بھی ہے، جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے۔

مولانا علی میاںؒ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں دانش و بنیش بھی ہے اور ایمان وایقان کی سرور آگیں کیفیت بھی، ان کے حرف حرف سے اخلاص وللٰہیت ٹپکی پڑتی ہے، ان کی پر شکوہ اور خطیبانہ طرز کی تحریروں وتقریروں میں فصاحت و بلاغت کی چاشنی بھی ہے، حرارت قلب اور جوش عشق کا سامان بھی، کثرت معلومات اور تحقیق کے اعلی درجہ پر ہوتے ہوئے بھی ان کے بول بول میں ایک عجیب طرح کی روحانی کشش ولذت پائی جاتی ہے۔

مفکر ندوی صرف ماضی کے احساس برتری میں گم نہیں ہیں، بلکہ عالم اسلام کے زندہ مسائل، خطرات وتحدیات اور لائحہ عمل کی طرف وہ بار بار امت مسلمہ کو للکارتے ہیں۔

نقد ونظر اور تنقید واحتساب ایک مفکر کی امتیازی شان ہوتی ہے، فکر اسلامی کی سرگرم اشاعت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی زندگی کی آخری ساعتوں تک ہلکان ہوتے رہے اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں عقابی نگاہ اور مومنانہ بصیرت سے کام لیتے رہے۔

اسلام کا پیغام، اس کی تہذیب، اس کی نشأت ثانیہ، اس کی بیداری، نیز امت مسلمہ کے مسائل، اعداء اسلام کے حملے اور ان کا دفاع اور ان سب سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلے داخلی محاذ کو مضبوط کرنے کی فکر اور یہ کہ افراد امت کی تربیت کی جائے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت مولانا ندویؒ کی ذات سراپا اسلام اور سیرت نبوی کا مکمل نمونہ تھی اور آپ نے اپنے علم اور عمل دونوں سے ایسے ہی کامل اسلام کی نمائندگی کرنے والی

جماعت تیار کرنے کی محنت فرمائی، عرب و عجم کے علماء وفضلاء اور مفکرین نے جس کا کھل کر اعتراف کیا۔

الحمدللہ حضرت مفکر ملتؒ کے خطاب میں بھی انہیں نکات پر توجہ مرکوز ہوتی تھی۔ چنانچہ موقع کے مناسب گفتگو کرنے میں آپ کو قدرت نے ملکہ عطا فرمایا ہے۔ انتہائی صاف ستھری زبان، دل کش اندازِ بیان اور دلوں میں اتر جانے والا طریق استدلال، موقع کے مناسب لطایف وظرائف ومواعظ سے لبریز آپ کا خطاب ہوا کرتا ہے۔ بقول شخصے:

سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اس کو کہتے ہیں

اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

کا مصداق، سوتوں کو جگانے کا اور خوابِ غفلت میں پڑے ہوؤں کو بیدار کرنے کا ہی نہیں؛ بل کہ جھنجھوڑنے کا فن آپ کو حاصل ہے، جو ہم سب کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔ بات شروع کرتے ہی چند ہی منٹوں میں مجمع پر چھا جاتے ہیں، کبھی آپ کے خطاب کے دوران اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی، لوگ تا دمِ آخر برابر متوجہ ہو کر سنتے رہتے ہیں، حالات حاضرہ پر آپ کی برابر نظر رہتی ہے، اس کے ساتھ امت کے درد وفکر میں گھلنے والا دلِ بے قرار آپ نے پایا ہے، لہٰذا آپ کے مواعظ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق ہوا کرتے ہیں، دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، بسا اوقات خود بھی روتے ہیں اور حاضرین کو بھی رلاتے ہیں، گھر پر ہونے والی مجلس ہو یا خطاب عام، سب کا یہی حال رہتا تھا۔

جو بیان جہاں کہیں ہوا ہے وہاں کے مناسب حال باتیں کہی گئی ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت بیان اور تقریر سے پہلے وہاں کے حالات کو اخبار اور لوگوں کے رہن سہن سے خوب محسوس فرما لیتے ہیں اور پھر اسی کے مناسب حال باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، مثال کے

طور پر آپ ''لیسٹر یوکے'' کے اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ: ''ہمارا جو یہاں نصاب تعلیم ہے اس پر غور کریں، عامۃً گیارہ بارہ سال کی عمر میں بچے کو بالکل فارغ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے، اکثر سمجھنے کی عمر بارہ سال سے لے کر سولہ سترہ سال کی ہوتی ہے، یہ جو مدت ہے اس میں ان کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے میں آپ علمائے کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک کمیٹی بنائیں اور غور وفکر کریں کہ نصاب میں یکسانیت کیسے ہو، یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر لیسٹر کے اندر چھ مسجدوں میں مکتب چل رہے ہیں تو ہر ایک کا نصاب الگ الگ ہے، ایک مسجد کا بچہ دوسری مسجد میں جائے گا تو وہ کیا پڑھ سکے گا، اس کو ایڈ جسٹ کرنا مشکل ہوتا ہے، یہ کیسی بد نظمی کی بات ہے، ہم متفقہ طور پر اپنا ایک نصاب بنائیں اور نصاب کو پھیلا کر سولہ سترہ سال تک کر دیں کہ ہمارے بچے سولہ سترہ سال تک کم از کم ایک ایک پیریڈ بھی عالم کے پاس آ کر بیٹھیں، یہ جو بارہ سال سے لے کر سولہ سال تک کا وقت گزرتا ہے اس میں وہ دین سے بالکل ہٹ جاتا ہے، لہٰذا حکمت عملی اس میں ہے کہ نصاب ایک ہو اور اس کو دراز کیا جائے۔'' (صدائے دل)

پیر طریقت شیخی ومحبی حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم صدائے دل کے بیانات پر تحریر فرماتے ہیں:

اس حقیر نے مشفقی المکرم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کی کتاب مستطاب ''صدائے دل'' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جو دراصل حضرت مولانا کے افسردہ دل کی آہوں نے ''صدائے دل'' کی صورت اختیار کر لی ہے، چوں کہ حضرت مولانا قلب متعظ سے بہرہ ور ہیں، اس لئے قوم کے اچھے برے حال کو سرسری نظر سے نہیں؛ بلکہ بنظرِ غائر دیکھتے ہیں، اس لئے حسب حال اس سے اثر لیتے ہیں، اچھے حال سے خوش ہوتے ہیں، اور برے حال

سے رنجیدہ ہوتے ہیں، اور اس سے نکلنے کی راہ کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں، چنانچہ زمانۂ حال کے ہر طبقہ کے ہر قسم کے حالات کا اس محضر نامہ میں ذکر فرمایا ہے؛ **چنانچہ بعض ڈاکٹروں کی قساوت قلبی اور دغا بازی کا واقعہ نقل فرمایا ہے**، معاشرہ میں جو لوگ بھی بڑے سمجھے جاتے ہیں (مثلاً ملک کے) ان کا حال اخلاقی لحاظ سے اور زیادہ تباہ و برباد ہوتا ہے، پس "**الناس علی دین ملوکهم**" کی رو سے اگر عوام کا حال بگڑ جائے تو کیا تعجب ہے، مگر ہم اپنے زمرہ کے علماء وطلبہ کو دیکھتے ہیں کہ ہمارا حال بھی ان دنیا داروں کے حال سے کچھ اچھا نہیں، افسوس کہ ہمارا حال بھی ان کے حال سے مغائر نہیں ہے، یہ شعبۂ تعلیم و تدریس جو یقیناً اخلاص کے ساتھ دین اور علم دین کی اشاعت کے لئے تھا، وہ خود حرص وطمع اور ہوا وہوس کا شکار ہو رہا ہے، خاص طور سے وہ اہل علم جن کا تعلق ایڈیڈ مدارس سے ہے وہ تو سرکاری اسکولوں کے منیجروں سے روپیہ کے معاملہ میں کچھ زیادہ ہی پیش پیش نظر آرہے ہیں، خدمت دین کا تو شاید تصور بھی باقی نہیں رہ گیا ہے، جس کو اغیار بھی سمجھ بلکہ دیکھ رہے ہیں، اور زبان طعن کھول رہے ہیں، **العیاذ باللہ تعالیٰ**

خود مولانا نے اپنے سوز دل کا یوں اظہار فرمایا ہے:

"چوں کہ میرا تعلق مدرسوں سے رہا ہے، اور پینتیس سال تک رہا ہے، پہلے ڈابھیل میں، اس کے بعد ترکیسر مدرسہ فلاح دارین میں رہا، اس لئے مجھے اپنے دوستوں اور اساتذہ سے زیادہ واقفیت ہے، ہم لوگوں کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ معمولی کتاب کسی سے ہٹائی جاتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی بے عزتی ہمارے ساتھ ہوئی ہے"۔ (ص: ۲۴)

ایک مقام پر اپنے تجربہ کی بنا پر یوں فرماتے ہیں:

اس دور میں کام کرنے کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اسٹیج پر بیٹھیں اور زور زور سے تقریریں کریں

اوردوسرا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کام کریں، اس دور میں ہنگامہ آرائی سے ناکامی ہوتی ہے، ہمارا اپنا تجربہ بھی ہے اور بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ ہنگامہ آرائی کا طریقہ بالکل غلط ہے۔

ہر جگہ کا یہ حال ہے کہ ذراسی بات ہوتی ہے تو اعدائے اسلام کہتے ہیں کہ یہ دہشت پسند قوم ہے، اور دہشت پسندی کے ذیل میں لاکر وہ ہم لوگوں کو بالکل پیچھے ہی کردیتے ہیں، تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم نے کہاں کہاں غلطی کی ہے؟ تاریخ میں کن کن واقعات میں ہم ناکام ہوئے، ان کے اسباب کیا ہیں؟ ان چیزوں کے جاننے کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم اپنے اکابر کے حالات سے بھی واقف نہیں ہیں، جب ہم اپنے اکابر کے حالات سے واقف ہی نہیں رہیں گے تو ہمیں طریقۂ کار کیسے معلوم ہوگا، جب کہ طریقۂ کار کا جاننا بہت ضروری ہے۔'' (ص:۱۸)

فائدہ: سبحان اللہ! کیسی عمدہ بات ہے، جو قابل عمل ہے، اب بھی اگر ہم صحیح طریقہ اختیار نہ کریں گے تو کب کریں گے؟ جب کہ باطل قوتیں اسلام کے خلاف متحد ہوگئی ہیں۔

مولانا نے اس عنوان ''عالم کا بگڑنا سارے عالَم کا بگڑنا ہے'' کے تحت ارقام فرمایا ہے کہ:

''آج کل ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے یہاں کے علماء کے ساتھ لوگوں کو منسلک نہیں ہونے دیتے، آپ معاف فرمائیں؛ چوں کہ میرے دل میں یہ سب باتیں ہیں، اس لئے کھل کر کہنا چاہتا ہوں، اللہ کے واسطہ ہم ایسا نہ کریں۔

میرے دوستو! ہم لوگوں میں سے ہر شخص کے اندر کمزوری ہے، انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم ہی معصوم ہوتے ہیں، کوئی عالم ایسا نہیں جس سے غلطیاں نہیں ہوتیں، ہم لوگ سب غلطی کرنے والے ہیں؛ لیکن اگر کسی میں خیر زیادہ ہے تو وہ صالح آدمی ہے، امت کو اس کے ساتھ وابستہ کرنا چاہئے۔ (ص:۲۳)

فائدہ: ماشاء اللہ تعالیٰ بہت ہی عمدہ بات ہے، ایک بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ اگر تم بلا عیب کے دوست طلب کروگے تو بلا دوست کے رہ جاؤگے۔

حضرت مولانا ''داعی الی اللہ کی صفات'' یوں تحریر فرماتے ہیں:

''داعی کی صفت یہ ہونا چاہئے کہ اس کو دنیا کی کوئی طمع نہ ہو، دنیا کی طمع چھوڑ کر اگر کسی ملک میں ہمارے علماء یہاں سے فارغ ہوکر جائیں تو یقیناً وہ کامیاب ہوں گے، لیکن یہ نہ ہو کہ ہم بھی جائیں اور دوسروں کی طرح زیادہ سے زیادہ پیسہ بٹوریں، صرف کمانے کی محنت کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علماء پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا، ایسے ایسے حادثات اور واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ہمیں شرمندگی ہوتی ہے، یہ دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں ایسی گھس گئی ہے کہ ہم اس کی وجہ سے ہر وہ کام کرگذرتے ہیں جو ہمارے شایان شان نہیں ہے، غلط بیانی سے کام لیتے ہیں، خواہ مخواہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب آپ کو فلاں چیز کا اثر ہے، حالاں کہ وہ بیچارہ معمولی مرض میں مبتلا ہے، لیکن چوں کہ ہم کو بیس پچیس پاؤنڈ لینے ہیں، اس لئے اس کے ذہن میں یہ بیٹھا دیتے ہیں کہ آپ کو تو یہ اثر ہے، افریقہ میں بسنے والے بعض علمائے کرام کے متعلق سنا ہے کہ خود ہی جادو وغیرہ کر کے پھر اس مریض کا علاج کرتے ہیں:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب * اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

نایاب کتب کی اشاعت کی ضرورت کے لئے یوں تحریر فرماتے ہیں: ''گذشتہ سال امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں جانا ہوا، وہاں ساڑھے نو ہزار مخطوطات اور لاجواب مخطوطات ہیں، انہوں نے ہمارے بزرگوں کی قیمتی قیمتی کتابیں اپنے یہاں لاکر رکھ دی ہیں، اب جا کر ہماری سمجھ میں وہ شعر آیا جو علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی

جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یہ شعر پہلے ہمیں سمجھ میں نہیں آیا تھا؛ لیکن جب ہم نے ان مخطوطات کی فہرست دیکھی تو سمجھ میں آیا کہ علامہ نے ایسا کیوں کہا۔

اب علم کے ان موتیوں کو دیکھنا علماء کا کام ہے، عوام بیچاروں کو کیا پتہ چلے؟ وہ تو کام سے بھی واقف نہیں، تو ایک طبقہ علماء اور ہمارے شاگردوں کا ایسا ہونا چاہئے جو اس پر کام کرے اور اس میں جو قیمتی رسالے ہیں ان کی تحقیق کریں، اب دنیا میں بہت کام ہورہا ہے، اور اچھی طرح ہورہا ہے، ہم لوگ اس میں پیچھے ہیں، اور خاص کر ہم گجراتی علماء علمی کاموں میں بہت پیچھے ہیں، ان کاموں کا شوق ہی نہیں ہے، اس لئے غیر ضروری کاموں میں پھنسے ہیں، اگر شوق ہوتا تو ہمیں دوسرے کاموں کی فرصت ہی نہ ملتی۔''

باہم اتفاق پیدا کرنے کی صورت، حضرت مولانا نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:

''میرے بھائیو! امت پریشانی کی حالت میں ہے، امت میں اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرو اور اتفاق اس وقت آئے گا، جب ہم اپنے آپ کو چھوٹا بنانے کی کوشش کریں گے، جب ہر شخص یہی کہے گا کہ میں چھوٹا ہوں، آپ بڑے ہیں تو اتفاق ہوجائے گا، اور دوسری بات یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیمات کو اپنے گھروں میں رواج دیں۔''

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب؁ حضرت دامت برکاتہم کے خطبات کے متعلق لکھتے ہیں:

دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے مواعظ اور علمی و اصلاحی مجالس سے طلبہ و علمائے کرام اور علمی و دینی حلقوں کو اپنے درد بھرے دل اور میٹھی زبان سے فیض یاب کررہے ہیں۔

'صدائے دل' آپ کے درد بھرے دل کی آواز ہے، آپ نے انڈیا، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور افریقہ وایشیا میں مسلم معاشرے کے جن رستے ہوئے زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، نوجوانوں میں، علمی حلقوں میں، عوام میں، گھروں میں اور بازاروں میں مسلمانوں کو جس بے راہ روی کا شکار دیکھا ان کا حکیمانہ علاج اپنی تقریروں میں اور مجلسوں میں تجویز کیا'' اسی کا نام 'صدائے دل' ہے۔''

حضرت مولانا مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم العالیہ لکھتے ہیں کہ:

''مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید

مشک کی پہچان یہ ہے کہ خود مہکے، عطار کی مدح سرائی کی اس کو حاجت نہیں، 'حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را' دل پسند محبوب کو ٹیپ ٹاپ کی ضرورت نہیں اور 'ہر چہ از دل خیزد، بر دل ریزد' کا مصداق ہے ؎

جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

پھر حضرت آگے لکھتے ہیں کہ:

''میں نے 'صدائے دل' کے بعض مضامین پڑھے تو دل باغ باغ ہوگیا، کبھی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور جہاں مولانا دامت برکاتہم نے قوم کی بے حسی کی منظر کشی کی تو وہاں مقرر 'منذر جیش' معلوم ہوتا ہے، اس کے الفاظ جذبات کی پیکر تصویر بن جاتے ہیں اور جگہ جگہ علمی نکات، بزرگوں کے ارشادات اور یورپ کی نقاہت بیان کی ہے جس سے لذت سخن دوبالا ہوگئی ہے۔''

''بہر حال، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن بیان کی خوبیوں سے خوب نوازا ہے، آپ کے

سحر آفریں، دل آویز اور حلم و وقار سے لبریز خطابات کو عوام و خواص بہت شوق سے سنتے ہیں، تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی آپ اپنی افہام و تفہیم اور حکیمانہ اسلوب بیان کی وجہ سے خاص ممتاز و مقبول ہیں، حضرت مولانا دامت برکاتہم کے بیان و مواعظ میں بظاہر نہ جوش وخروش ہوتا ہے اور نہ پُر تکلف لسانی، نہ لہجہ و ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں مگر اس کے باوجود خطابات اس قدر مؤثر اور مسحور کن ہوتے ہیں کہ ان سے عوام و خواص یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔''

استاذ محترم حضرت مولانا سید ذو الفقار احمد صاحب فرماتے ہیں:

امت کے علماء، صلحاء، مشائخ اور درد دل رکھنے والے احباب نے ہمیشہ اصلاح و تربیت اور آخرت کی جوابدہی کی طرف نوجوانوں کو متوجہ کیا، ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان کو اسلامی اخلاق و اعمال کی طرف متوجہ کیا ہے، جس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے، لوگوں میں خدا ترسی اور اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہوئی، نئے نئے شیطانی فتنوں سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر لاحق ہوئی۔

انہیں مفکرین اور مصلحین میں سے حضرت مولانا عبداللہ صاحب سورتی مدظلہ العالی رئیس جامعہ فلاح دارین ترکیسر ہیں، جو نصف صدی سے اپنی تحریر و تقریر سے امت کے نونہالوں کی تربیت و اصلاح میں مصروف ہیں، آپ نے پچیس سال جامعہ کے طلبۂ عزیز کی تربیت و تعلیم میں خرچ کئے اور اب دنیا کے مختلف ملکوں میں بسنے والے انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے دل و جان سے مصروف ہیں، آپ کے مواعظ اور محاضرات، علمی مجالس اور جامعات کے طلبہ میں کافی وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

عوام و خواص وطلبۂ مدارس کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے، فکر و درد سے بھری ہوئی باتیں اور زریں نصیحتوں سے لبریز ہیں، جن کو ہر پڑھنے والا محسوس کرے گا اور حرز جان بنانے پر

مجبور ہوگا، یہ مضامین ہر مؤمن کی دل کی آواز اور ہر انسان کا سرمایۂ افتخار ہیں۔

(صدائے دل: ۲/ ۷-۶)

علماءِ کرام کو خطاب کرتے ہوئے مفکرِ ملتؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

ہمیں سوچنا چاہئے کہ اگر ہم اس طرح شکایت کر کے علمِ دین کے میدان کو چھوڑ دیں گے تو کیا امت پروان چڑھ سکے گی؟ کیا اُن کے بچوں کے عقائد صحیح رہیں گے؟ یقیناً ہم کو دوسرے کام کرنے میں شاید آسائش مل جائے، کچھ روپیوں کی فراوانی ہوجائے، ہوسکتا ہے کہ ہمیں اچھی زندگی مل جائے؛ لیکن امت برباد ہوجائے گی، اور ہمارے اکابرین نے تو تکلیف برداشت کر کے، پیٹ پر پتھر باندھ کر اس دین کا کام کیا ہے، وہی کام ہم کو برطانیہ میں بھی کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم اس کام کو کریں۔

آپ حضرات سے ایک ہی اپیل ہے کہ ہمارے ان اکابرین کی ذات کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیجئے، ان کی سوانح خوب پڑھیں اور خوب گہرا مطالعہ کریں، علم میں گہرائی بہت ضروری ہے، آج علم میں بہت سطحیت آگئی ہے علم میں گہرائی ہونی چاہئے، قرآن وحدیث کا صحیح علم ہمارے پاس ہو اور پھر ہمارے اکابرین کی سیرت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں، تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی، اور اختلاف اور تخریب اور پارٹی بازی سے اپنے آپ کو الگ رکھیں، یہ اس زمانے میں بہت ضروری ہے، اور اسلام کی خدمت یہاں کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کریں، اللہ تعالیٰ اگر ہمیں ان باتوں کی توفیق عطا فرمائے تو ہم شاید کچھ کام کرسکیں گے، ہدایت دینا اور صحیح راستہ پر لانا یہ اللہ کا کام ہے، لیکن ہمارا کام یہ ہے کہ جتنا ہوسکے ہم اس کی طرف محنت کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں۔

علمائے کرام کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں بہت دردمندانہ وعاجزانہ فرماتے ہیں:

لیکن آدمی تھوڑی سی اپنی انا کو چھوڑ دے، اس کے لیے ضرورت ہے تزکیہ کی، علم کے ساتھ تزکیہ کی ضرورت ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی کی انا علمی مسئلوں میں نہ رہے اور یہ سوچے کہ امت کا فائدہ کس چیز میں ہے اور جب ساری امت کے علما اس پر جمع ہو گئے اور سب نے مل کر یہ فیصلہ کرلیا تو اب مجھے اپنی رائے چھوڑ دینی چاہیے۔

اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب (دامت برکاتہم) نے تو بڑی اصولی بات بیان فرمائی ہے کہ مسائل دو قسم کے ہیں، منصوص اور مجتہد فیہ، منصوص مسائل میں تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی، اس میں تو آپ تصلب اختیار کریں، آپ اپنے موقف پر مضبوط جمے رہیں، لیکن جو مجتہد فیہ مسائل ہیں ان میں زبردستی نہیں ہوتی، ان میں آپ اصرار نہ کریں، اس میں یہ دیکھیں کہ امت کے عمومی مسائل کا حل کس چیز میں ہے، میرے بھائیو! یہ بات یہاں کے مقامی علما کو سمجھ میں آجائے تو ان شاء اللہ بہت سے فتنوں سے دور ہو جائیں گے۔

میں نے محسوس کیا کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں، کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن ہم ایک دوسرے سے دور کھڑے ہیں اور علما اور امت کا ایک دوسرے سے دور ہونا اور ایک دوسرے کے خلاف باتیں کرنا امت کے لیے بالکل سم قاتل ہے، یہ زہر امت کو تباہ و برباد کر رہا ہے، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان علمائے دین ہی کو مقتدیٰ بنایا ہے، یہی وہ حضرات ہیں جن کے ذریعہ امت کو روشنی مل سکتی ہے۔''

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب لاجپوری دامت برکاتہم نے حضرت کی صدائے دل کے تین حصوں کا محققانہ و غائرانہ مطالعہ فرمایا ہے اور حضرت کے خطبات کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے چند انتہائی مفید نتائج اخذ کئے ہیں، میں اس کو نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) حضرت مولانا کے بیان کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ بیان میں سامعین کو طعن و تشنیع

نہیں کرتے ؛بل کہ نرمی اور محبت سے سمجھاتے ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ جو بیان طعن وتشنیع سے بھرا ہوتا ہے وہ دل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

(۲) جگہ جگہ مسلمانوں کی بے حسی اور غفلت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۳) صرف مرض کی نشان دہی ہی نہیں کی گئی ہے؛بل کہ اس کا علاج بھی بتایا گیا ہے۔

(۴) زبان بالکل سادہ ہے،جس میں سامعین کا خیال رکھا گیا ہے کہ جو بات کہی جائے وہ سامعین کوسمجھ میں آجائے اوراس کی وجہ شاید وہ ایک واقعہ ہے جوحضرت نے اپنے ایک بیان میں خودفرمایا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:''میں جب ڈابھیل مدرسہ میں پڑھتا تھا تو مجھے مولانا آزاد کی کتابیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور مولانا آزاد کی کتابیں میں بار بار پڑھتا تھا؛ چناں چہ اس زمانہ میں مولانا آزاد کے جملے میرے دماغ میں نقش ہو گئے تھے اور میں جب کبھی دیہاتوں میں مولانا عبدالجبار صاحب کے ساتھ جاتا تھا تو تقریر میں وہی الفاظ نکلتے تھے، میرے ایک رشتہ دار ریٹائرڈ مجسٹریٹ تھے،انہوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی!تم جب گاؤں میں تقریر کروتو ابوالکلام کی زبان مت بولا کرو، اس لیے کہ دیہات کے لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان نہیں سمجھتے،لہٰذا جب گاؤں میں آکرتم تقریر کروتو سیدھی سادی اردو بولا کرو، اس لیے کہ یہ لوگ ابوالکلام کی زبان نہیں سمجھ سکتے تو مجھے تنبہ ہوا، میں نے کہا کہ واقعی یہ میری غلطی ہے کہ میں ایسی زبان استعمال کرتا ہوں۔'' (صدائے دل: ج۱/ص۲۱۹،۲۱۸)

(۵) صرف کتابی باتیں بیان نہیں کی گئی ہیں؛ بل کہ کتاب زندگی کے تجربات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

(۶) علما وطلبا کے مجمع میں جو وعظ ہوا ہے اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ اور

نشان دہی کی گئی ہے کہ کونسی کتابیں پڑھنی چاہیے، کس مصنف کو پڑھنا چاہیے، اسی طرح مصنف کی خوبی اور بعض اچھی کتابوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔

(۷) جگہ جگہ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے بزرگوں کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

(۸) یہ سبق دیا ہے کہ ایک مسلمان کو- چاہے حالات کیسے بھی ہوں- اللہ تعالیٰ کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، مناسب حال اسباب کو اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے پرامید رہنا چاہیے۔

(۹) بزرگوں کے دامن سے ہمیشہ وابستگی رکھنی چاہیے۔

(۱۰) زمانے کے حالات اور اس پر مطلع ہونے کے جو اسباب ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے، اس بات کو بھی مختلف انداز سے موقع بموقع بیان کیا گیا ہے۔

آج کے دور میں کام کیسے کیا جائے، اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس دور میں کام کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اسٹیج پر بیٹھیں اور وہاں زور زور سے تقریر کریں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم خاموشی سے کام کریں، اس دور میں ہنگامہ آرائی سے ناکامی ہوتی ہے، ہمارا اپنا تجربہ اور بزرگوں سے سن سن کر یہ معلوم ہوا کہ ہنگامہ آرائی کا طریقہ بالکل غلط ہے اور ہر جگہ کا یہی حال ہے۔

(۱۱) احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے، احساس برتری ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

(۱۲) بیان کا انداز بالکل ناصحانہ ہے، طعن و تشنیع ہے اور نہ غصہ؛ بل کہ واقعی ''صدائے دل'' ہے اور اپنا پن ہے جو دلوں کو جھنجوڑتا ہے اور باتیں خود بخود سامعین کے دلوں میں اثر اور گھر کرتی چلی جاتی ہیں۔

اور بیانات کا یہ مجموعہ صرف ''صدائے دل'' ہی نہیں؛ بل کہ ''دوائے دل'' بھی ہے اور

بقول حضرت مولانا کے وعظ ایک دوا ہے، حضرت ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''میں تو حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کا ایک جملہ دہراتا ہوں، حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وعظ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں اچھے اشعار پڑھے جائیں، مولانا فرماتے تھے کہ وعظ تو وہ ہوتا ہے جو کڑوا ہو یہ تو دوا ہے، تو یقیناً حضرت مولانا کے بیانات کا یہ مجموعہ واقعی ''امت کے مرض کی دوا'' ہے۔''

اور ایک جگہ فرمایا کہ:

''وعظ وہ نہیں ہوتا ہے جو قوم کے مزاج کو دیکھے کہ یہاں فلانے قصے بیان کریں گے، اشعار پڑھیں گے تو لوگ بہت خوش ہوں گے کہ ماشاء اللہ مولانا نے بڑی زبردست تقریر کی، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قوموں کے جو امراض ہیں ان پر انگلی رکھو کہ ہم غلط راستہ پر جارہے ہیں، اسلام کی طرف ہمیں واپس آنا ہے، صحابۂ کرامؓ کی سیرت کی طرف واپس آنا ہے۔''

طلبہ کی زبان ٹھیک ہونی چاہئے:

ہمارے طلبہ کی زبان بھی ٹھیک ہونی چاہئے، کسی بات کو عمدہ طریقہ سے بیان کرنے کا بھی مدرسہ میں ہمیں سلیقہ آنا چاہئے، کہ ہم کسی چیز کو پیش کریں تو ہماری زبان کیسی ہونی چاہئے، تو طلبہ کا یہ بھی کام ہے کہ اپنی زبان کو درست کریں، اردو کے اچھے اچھے جملے اور عمدہ عمدہ تعبیرات استعمال کرنے کی کوشش کریں، جیسے آپ کسی آدمی کو کہیں: صاحب یہ بدتہذیبی نہ کریں، اور آپ اس کی بجائے یہ کہیں کہ جناب والا تہذیب کے دائرہ کو آپ تنگ نہ کریں، مطلب وہی ہے کہ آپ بدتہذیبی نہ کریں؛ لیکن الفاظ کے فرق سے جملہ کی ساخت بدل جاتی ہے اور وہی بات جلد اثر کرجاتی ہے، حق بات کہو؛ لیکن سلیقہ سے، جو بات کڑوی سے کڑوی ہو اس کو آپ کیپسول (Capsule) میں دے سکتے ہیں، کڑوی دوا کیپسول

میں اس لئے دی جاتی ہے؛ تا کہ اس کو نگلنے میں سہولت ہو، اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ حق بات تو کہنی چاہئے، میں کہتا ہوں کہ ضرور کہو؛ لیکن میٹھے انداز میں کہو، قرآن مجید ہم کو کہتا ہے کہ (وجادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ) یعنی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے حسن اسلوب کے ساتھ مجادلہ کرو، تو یہ "بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" ہمیں سیکھنا پڑے گا کہ کسی بات کو سمجھانے کے لئے آپ کیا طریقہ اختیار کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حنین سے واپسی میں جو مالِ غنیمت تھا وہ قریش کے بڑے بڑے نوجوانوں کو تقسیم کیا تھا تا کہ تالیف قلب ہو جائے، تو انصار کے نوجوانوں کو ذرا شکایت ہوئی کہ "سیوفنا تطقر من الدم" ہماری تلواریں ابھی تو خون ٹپکا رہی ہے اور آپ اپنے رشتہ داروں کو مال دے رہے ہیں، انصار کے کچھ نوجوانوں کو یہ اشکال ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ بات پہنچ گئی ،تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب لوگوں کو جمع ہونے کا حکم فرمایا کہ سب کو جمع کرو، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں تقریر فرمائی تھی، اور سب سے پہلا جملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا "ماهذه وجدة التی وجدتموها فی انفسکم" یہ کیا خلش ہے جو تم اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہو؟ بڑی بہترین اور بہت بلیغ تقریر ہے، تو اس سبق میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ تقریر کا وہ قطعہ لائے اور اس کے اوپر عنوان لکھا "الخطابة المعجزة" چونکہ جب تقریر ختم ہوئی تو تمام انصاری لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے، یہاں تک کہ ان کے کپڑے تر ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جملہ یہ بھی فرمایا تھا کہ کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ اپنے گھروں میں لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو لے جاؤ، تم کو یہ بات پسند نہیں؟ انہوں نے کہا رضینا باللہ ورسولہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ پوری تقریر یاد کرنے کے قابل ہے۔

طارق بن زیاد نے جبل طارق پر جو خطبہ دیا تھا "ایها الناس ! این المفر ؟ البحر

من ورائکم والعدو امامکم ولیس لکم واللہ الا الصدق والصبر'' وہ بھی یاد کرنے کے قابل ہے، وہ اشعار جو حضرت زین العابدینؒ کی شان میں فرزدق نے کہے تھے، وہ بھی یاد کرنے کے قابل ہیں، اس طرح کے محفوظات ذہن میں ہونے چاہئے، اس سے آپ کو عربی زبان پر قابو حاصل ہوگا، اور آپ کو عربی زبان کا لطف محسوس ہوگا۔

ترجمۂ قرآن کریم پڑھنے والے طلبہ کو ہدایات:

میرے دوستو! ہم قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتے ہیں، اس میں ایک ہی لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ہر جگہ الگ الگ معنی میں مستعمل ہیں، بلکہ ایک ہی آیت کے ترجمہ میں ہمارے اردو مترجمین نے الگ الگ ترجمے کئے ہیں، جیسے آیت کریمہ ''لم تکن فتنتہ الا ان قالوا'' میں لفظ فتنتہ آیا ہے، اس کا ترجمہ میں نے دیکھا کہ ہر ایک نے الگ الگ کیا ہے، شیخ الہندؒ کچھ ترجمہ فرمارہے ہیں، مولانا غلام اللہ صاحب کچھ کررہے ہیں، حضرت تھانویؒ کا ترجمہ کچھ ہے، میں سوچ میں پڑ گیا کہ لفظ فتنۃ کے سب الگ الگ ترجمے کررہے ہیں، پھر میں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ لفظ فتن اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں کتنی جگہ آئے ہیں؟ ذرا تلاش کرو، اور میں نے کہا کہ دیکھو! قرآن مجید میں لفظ فتنہ کا ترجمہ کہاں کہاں کس کس انداز سے کیا گیا ہے؛ یہ بھی تلاش کرکے لکھ لو۔ اب ترجمۂ قرآن پڑھنے والے طلبہ یہ پانچ چھ ترجمے اپنے سامنے رکھ لیں تو اسے اندازہ ہوجائے گا کہ قرآن مجید میں کتنی وسعت اور اس کے الفاظ میں کیسی بلاغت ہے اور کس کس انداز سے اس پر لوگوں نے محنتیں کی ہیں۔

لفظ حمیم کا معنی ایک ترجمہ پڑھنے والے طالب علم سے پوچھا کہ حمیم کا کیا ترجمہ ہے؟ اس نے کہا کہ گرم پانی، اسی سے آتا ہے، استحمام، اُرِیدُ اَن اَستَحِم، میں گرم پانی سے غسل کرنا چاہتا ہوں، ایک تو ہے اُرِیدُ اَن اغتسل، میں غسل کرنا چاہتا ہوں، اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ

گرم پانی سے غسل کرنا ہے یا ٹھنڈے پانی سے، لیکن جب آپ یہ جملہ کہیں گے اُرِیْدُ اَن اَستحم، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ گرم پانی سے غسل کرنا چاہتے ہیں، تو حمیم کا معنی ایک تو گرم پانی کے ہیں، اور دوسرا معنی دوست کے ہیں، جو آپ کا خالص پکا دوست ہے اس کو بھی حمیم کہیں گے، قرآن مجید میں دونوں معنی مستعمل ہیں، گرم پانی کے لئے آیا ہے ''وسقوا ماء حمیما'' اور سچے پکے دوست کے لئے ''لایسئل حمیم حمیما'' وارد ہے، اب دونوں جگہ ایک معنی نہیں چل سکتے، الگ الگ معنی مراد لئے جائیں گے، تو ترجمۂ قرآن پڑھنے والے طالب علم کو فرق کو سمجھنا ہوگا کہ کہاں کیا معنیٰ ہوتے ہیں، اور کہاں کیا معنی، اور پھر اردو کے مترجمین نے جو ترجمے کئے ہیں ان سے تقابل کرنا چاہئے؛ تاکہ تمام کے ذوق سے واقف ہوسکیں، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ خالص دہلی کی زبان میں ہے اور اس کے بارے میں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی نے ''محاسن ترجمہ شاہ عبدالقادر'' نامی کتاب لکھی، جس میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں، اس میں کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ شاہ صاحب کے ترجمہ کی کیا خوبیاں ہیں، حضرت شاہ صاحب نے اس لفظ کو کیوں اختیار فرمایا؟ اردو ترجمہ بھی ہم تو سمجھ نہیں سکتے کہ یہاں یہ ترجمہ کیوں کیا گیا، اور شاہ صاحب کے بعض تو اتنے عمدہ قسم کے ترجمے ہیں کہ میری طبیعت جھوم جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے کیا خوب لفظ استعمال کیا، بظاہر تو وہ ہندی کا لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ ذوق کی بات ہوتی ہے، بہر حال آپ ترجمۂ قرآن پاک پڑھ رہے ہیں تو دو چار ترجموں کا آپ تقابل کیجئے، پاکستان میں پانچ سات ترجمے ایک ساتھ چھپے ہیں، حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھ لو؛ تاکہ تقابل میں آسانی ہو اور تمام کے تراجم سے بیک وقت مستفید ہوسکیں، پھر لغت میں اصل لفظ کی طرف رجوع کریں، کہ لغت میں اس لفظ کے کیا معنی ہیں،

لفظ فتن کا معنی عربی لغت میں ''اِلقاء الذہب فی النار'' یعنی سونے کو آگ میں ڈالنا؛ تاکہ آپ اسے پرکھ سکیں کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا، پھر اس کے معنی میں مختلف آیات میں کہاں کہاں کیا کیا مناسبت ہے، یہ آپ کو پتہ چلے گا، یہ علوم ہے اس کے لئے محنت کرنی چاہئے۔

مولانا علی میاں صاحبؒ ایک جملہ فرماتے تھے کہ تعلیم بچوں کا گھروندا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کھیلے اور اٹھ کر چلے گئے، یہ حضرت کا جملہ تھا، چھوٹے بچے مکان بنا کر کھیلتے ہیں، چھوٹی چھوٹی موٹریں ہوتی ہیں، مارکٹ بناتے ہیں، کوئی تاجر بنتا ہے، چھوٹی سی ترازو بھی ہوتی ہے، پھر ذرا ایک آدھ گھنٹے کے بعد تھک جاتے ہیں یا آپس میں ان بن ہوجاتی ہے ،تو اپنی دکان کو لات مار کر ادھر اُدھر بکھیر دیتے ہیں اور اٹھ کر چلے جاتے ہیں ،تو حضرت فرماتے تھے کہ یہ تعلیم بچوں کا گھروندا نہیں ہے، کہ آپ تھوڑی دیر آکر بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پڑھ کر اٹھ کر چلے گئے، یہ پِتّہ پانی کرنے کی چیز ہے اور صبر اور استقلال چاہتا ہے، اللہ تعالی ہم کو یہ وصف نصیب فرمائے۔ آمین۔۔۔

بزرگوں سے تعلق:

حضرت مفکر ملتؒ کے صاحب زادے مولانا ابراہیم صاحب زید مجدہ لکھتے ہیں کہ بزرگوں سے تعلق کے بارے میں آپ نے ''رشد وہدایت کے منار'' میں پڑھا ہی ہوگا؛ لیکن دو تین واقعات جو مجھے یاد ہیں وہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ سے والد صاحب کو بہت محبت تھی ،حضرت جب بھی بمبئی تشریف لاتے آپ کی ملاقات کے لیے والد صاحب گجرات سے بمبئی جاتے اور خوب استفادہ فرماتے تھے۔

گجرات کا ندوہ:

ایک مرتبہ حضرت ترکیسر عربی انجمن کے جلسہ میں تشریف لائے تو بچوں کی عربی تقاریر

سن کر فرمایا تھا کہ آج تک میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ندوہ ہی میں اچھی عربی بولی جاتی ہے، لیکن یہاں بچوں کی عربی تقریریں سن کر محسوس ہوا کہ گجرات میں بھی ندوہ ہے۔

اے گجراتیو! ان کی قدر کرو:

پھر والد صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب بڑے دور اندیش ہیں، اے گجراتیو! ان کی قدر کرو، والد صاحب کے ہر بیان میں آپ کو حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ملے گی۔

مجھے تو مولانا عبداللہ کاپودروی کے گھر جانا ہے:

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کا جو آخری سفر گجرات کا ہوا تھا، اس وقت شاید آپ دار العلوم جمبوسر آئے تھے، ان دنوں میں تو یہاں برطانیہ میں تھا لیکن وہاں موجود علمائے کرام سے سنا تھا کہ اس وقت ہر دار العلوم والا حضرت مفکر اسلام کو اپنے دار العلوم میں آنے کی دعوت دے رہا تھا، لیکن حضرت انکار فرماتے رہے، والد صاحب کا بھی دل چاہتا تھا کہ آپ کو اپنے گھر پر لے جائیں، لیکن حضرت کی طبیعت کو دیکھ کر والد صاحب کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، ہمارے لیے یہ بات سیکھنے کی ہے کہ آج کل ہم اپنے شیوخ، اساتذہ اور بزرگوں کو زبردستی گھر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ہم برکت حاصل کریں، لیکن ان کے آرام اور صحت کا ہمیں خیال نہیں رہتا، یہ محبت نہیں ہے، اس کی ہمیں اصلاح کی بہت ضرورت ہے، ہاں! تو حضرت سب کو انکار کرتے رہے پھر حضرت نے فرمایا کہ مجھے کہیں نہیں جانا ہے، مجھے تو مولانا عبداللہ کاپودروی کے گھر جانا ہے اور پھر ۷۰ رعلمائے کرام کی معیت میں کاپودرا تشریف لائے تھے۔

۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کا لندن کا سفر ہوا تھا، میرے

بھائی مولانا اسماعیل صاحب اس وقت بولٹن میں تھے اور میں اس وقت لندن میں کلیپٹن کے علاقہ میں رہتا تھا، مولانا اسماعیل صاحب لندن میرے گھر آئے، چناں چہ ہم دونوں بھائی مولانا علی میاں صاحبؒ کو ملنے فینس بری پارک گئے؛ مگر صاحب مکان نے پہلے ہمیں منع کر دیا کہ مولانا سے ملاقات نہیں ہو سکتی، ہم نے کہا کہ ہم بہت دور سے ملنے آئے ہیں اور ہم صرف حضرت سے مصافحہ کر کے نکل جائیں گے، اس پر انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، جب ہم اندر گئے اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کے بیٹے ہیں تو ہمیں بٹھایا، میں اسی عرصہ میں ہندوستان سے برطانیہ آیا ہوا تھا تو مجھے کافی نصیحتیں کیں، اس میں جو بات مجھے خاص لکھنی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت ہندوستان واپس ہوئے تو وہاں جا کر لکھنؤ سے گجرات والد صاحب پر خط لکھا کہ میں انگلینڈ گیا تھا تو آپ کے صاحب زادے لندن ملاقات کے لیے آئے تھے، ان سے مل کر مجھے خوشی ہوئی اور وہ خیریت سے ہیں، ہمارے بزرگوں کے اخلاق کتنے بلند تھے اور اپنے چھوٹوں سے کیسا محبت کا معاملہ فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسے اخلاق عطا فرمائیں۔آمین!

حضرت مولانا عباس صاحب سریگت اپنی ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے کا واقعہ نقل فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ نے رئیس فلاحِ دارین کو نہ صرف گجرات بل کہ بیرونِ گجرات بھی مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی۔احقر کا قیام جن دنوں دارالعلوم ندوۃ العلما میں بغرض تعلیم تھا، اس وقفہ کے درمیان ۱۹۸۴ء میں ندوۃ العلما میں نصابِ تعلیم پر غور وفکر کے لیے ایک عظیم سمینار ہو رہا تھا، اس میں شرکت کے لیے ہندوستان بھر سے حضرات علمائے کرام تشریف لائے ہوئے تھے۔گجرات سے حضرت بھی تشریف لائے ہوئے تھے، جب حضرت مولانا السید ابوالحسن

علی ندویؒ کی خدمت میں مغرب کے بعد زیارت و ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، حضرت مرحوم و مغفور نے کھڑے ہو کر استقبال فرمایا، نیز مصافحہ و معانقہ کے بعد قریب ہی نشست پر تشریف رکھنے کے لیے اشارہ فرمایا، یہ واقعہ جہاں مرحوم و مغفور کی بلند اخلاقی کا پتہ دیتا ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کی حضرت والا کی نگاہ میں کیا قدر و منزلت تھی، نیز دو روزہ سمینار کے اختتام کے موقع پر تجویز مرتب کرنے کے لیے جو سہ رُکنی کمیٹی کا اعلان کیا گیا تھا اس میں سر فہرست قاضی مجاہد الاسلامؒ کے ساتھ دوسرا نام مولانا ہی کا تھا۔ غرض نہ صرف گجرات بل کہ بیرون گجرات ہی نہیں؛ بیرون ہند بھی ان کی آرا کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، قبول کیا گیا اور عملی جامہ پہنایا گیا۔ ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء!

فلاح دارین کی سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں اور مستجاب دعاؤں سے ہوئی تھی، جس کو آپ نے گجرات کا ندوہ فرمایا تھا، ایک مرتبہ کی حاضری پر معائنہ بک میں تحریر فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج ۱۰ ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ کو مدرسہ ''فلاح دارین'' ترکیسر میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، اس مدرسہ سے قدیمی اور عزیزانہ تعلق ہے اور کئی بار یہاں آنے کی مسرت وعزت حاصل ہوئی ہے لیکن اس مرتبہ حاضری پر اس کی ترقی و توسیع کا بھی اندازہ ہوا اور اس سے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کے بانیوں، معاونوں، خادموں، اساتذہ و طلبہ کو برکت عطا فرمائے اور اس چمنستان علم کو پھلتا پھولتا رکھے کہ یہ صحیح معنی میں علم کا چمن ہے۔ معنوی طور پر بھی، ظاہری طور پر بھی، مختلف درجات کے طلبہ کو بھی دیکھا، اسباق سنے جو کچھ دیکھا اور سنا اس سے اطمینان اور مسرت ہوئی اور

اساتذہ بالخصوص اس کے لائق ومخلص مہتمم مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کی مساعی اور محنت کا اندازہ ہوا، اللہ نظر بد سے بچائے اور ہر طرح کے شر ورو فتن سے محفوظ رکھے۔ میرے ساتھ نائب ناظم ''ندوۃ العلما'' مولانا معین اللہ صاحب بھی رفیق اور اس تأثرات میں شریک ہیں۔''

(حضرت مولانا سید) ابو الحسن علی ندوی -رحمۃ اللہ علیہ- ناظم : ندوۃ العلما؛ لکھنؤ)(گلدستۂ محبت: ص/ ۲۰۷)

فلاح دارین میں حضرت مفکر اسلامؒ کی حاضری کئی مرتبہ ہوئی ہے، ایک مرتبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مفکر ملتؒ فرماتے ہیں: حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ترکیسر تشریف لائے تھے، ہم نے اردو کی جماعت کو حضرت کے سامنے بٹھایا تو حضرت نے فرمایا: پڑھو، لڑکوں نے پڑھنا شروع کیا، حضرت دیکھتے رہے، ایک طالب علم نے پڑھا، پھر دوسرے نے پڑھا، اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اب کتابیں بند کردو، سب کی کتابیں بند کرادیں اور کہا: آپ میں سے جس طالب علم کو جو بھی نظم یاد ہو وہ سنائے، ایک بھی طالب علم کو کوئی نظم یاد نہ تھی چوں کہ ہمارے یہاں گجرات میں اس کا رواج نہیں تھا کہ طلبہ اردو نظمیں یاد کریں، اس وقت طلبہ کے سامنے کچھ نہیں کہا؛ لیکن جب طلبہ باہر نکل گئے تو مجھ سے کہا کہ مولانا یہ بات ٹھیک نہیں ہے، جتنی نظمیں ہیں وہ سب کی سب ان کو یاد ہونی چاہیے۔ مولانا اسماعیل خان صاحب میرٹھیؒ نے جو نظمیں لکھی ہیں، اس میں انہوں نے زبان سکھائی ہے اور عقیدے بھی سکھائے ہیں۔ (صدائے دل: ۴/ ۲۲۰)

اللہ کی قدرت کی عظیم نشانی:

حضرت مفکر ملتؒ فرماتے ہیں: حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے ایک مرتبہ ہم

سے فرمایا تھا کہ عبقری شخصیتیں بڑے بڑے شہروں میں پیدا نہیں ہوئیں؛ بل کہ چھوٹے چھوٹے قصبے وگاؤں میں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ یہ حضرت نے ترکیسر کی مجلس میں فرمایا تھا، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ''نانوتہ'' کے تھے، حضرت تھانویؒ قصبہ ''تھانہ بھون'' کے تھے، چھوٹے چھوٹے گاؤں میں پیدا فرما کر اپنی قدرت کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور قرآن کی حفاظت اور اس کی تبیین کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، قرآن کی حفاظت اور ان احادیث کی حفاظت اپنے فضل خاص سے کرتے ہیں۔(صدائے دل: ۲۱۵/۴)

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ ایسے موقع پر صدیق اکبرؓ کے اس جملے کو دہرایا کرتے تھے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا: ''أینقص الدین وأنا حي؟'' کہ میرے زندہ ہوتے ہوئے دین میں کسی قسم کی کمی بیشی ہوسکتی ہے، میں زندہ ہوں اور دین میں کمی ہو؟ آپ کے دیہات میں، آپ کے علاقے میں، آپ کے ضلع میں اگر قادیانیت کا شور ہو رہا ہے، کہیں کوئی اور تحریک چل رہی ہے تو آپ بالکل غافل نہ رہیں، رات دن گشت لگائیں، رات دن دیہاتوں میں جا کر ہر ایک بچے کو توحید کا پیغام دیں، اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہر دیہات میں ہم جا کر بچوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید سکھائیں۔(صدائے دل: ۲۰۱/۴)

ہمارے لئے لمحۂ فکریہ:

حضرت مفکر ملتؒ فرماتے ہیں کہ کل ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے گذشتہ کل کی بات کر رہا ہوں، ایک صاحب نے مجھے سنایا کہ ہم یہاں ایک شہر میں گئے اور ہم نے کہا کہ مولانا علی میاں صاحبؒ بہت بڑے عالم تھے، اس صدی میں انہوں نے بڑا کام کیا، تو ان کے لیے

یہاں سمینار کرنا چاہیے، تو ایک عالم نے کہا کہ کون مولانا علی میاں صاحبؒ؟ ایک عالم پوچھ رہا ہے کہ کون مولانا علی میاں؟ ان کا کیا مسلک تھا؟ جب مولوی کو یہ پتہ نہ ہو کہ علی میاں کون ہیں اور ان کا مسلک کیا تھا اور انہوں نے کیا کارنامے انجام دئے، تو اس پر سر پیٹنا چاہئے، ایسے لوگ کیا قیادت کریں گے اس امت کی؛ جن کو یہ بھی پتہ نہیں کہ حضرت مولانا کون شخص تھے؟ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ؛ شاہ حسین، ملک فیصل، ملک فہد، زائد بن سلطان، سلطان قابوس اور امیر کویت سب ان کو دعوت دینا اپنے لیے شرف سمجھتے تھے، سلطان برونئی نے ان کو خطاب دیا، شاہ فیصل ایوارڈ ان کو ملا، کعبہ کی چابی ان کے ہاتھ میں دی گئی، کعبہ کی مرمت جب مکمل ہوئی تھی تو شاہ فہد نے کہا کہ کعبہ کی چابی ابوالحسن علی الندوی صاحب کے ہاتھ میں دی جائے، اتنا بڑا آدمی کہ جس کو یہ شرف حاصل ہوئے ہندوستان کا رہنے والا، جس کی کتابیں عرب یونیورسٹیوں میں نصاب میں داخل ہیں، اس کے بارے میں ہمارا مولوی یہ کہتا ہے کہ کون مولانا علی میاں صاحب؟ اور ان کا مسلک کیا ہے؟ بڑے دکھ کی بات ہے۔

(صدائے دل: ج: ۳، ص: ۲۳۴)

اندلس کی نشأۃِ ثانیہ میں حضرت مفکر اسلامؒ کا عظیم رول:

جہاں تک مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واقعی ان کو اتنے کمالات سے نوازا تھا جن کا احاطہ مشکل ہے، ابھی چار مہینے پہلے دو روز کے لیے میں (مفکر ملتؒ) ''مراکش'' گیا اور وہاں سے مجھے ''اندلس'' جانا تھا، ایک شنقیطی دوست کے انتظار میں لبِ سڑک کھڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا مکتبہ ہے، اخبارات ورسائل اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بک رہی ہیں، میں اس میں داخل ہوا، میں نے سوچا؛ جب تک وہ آئیں دیکھتے ہیں یہاں کیا کتابیں ہیں، تو ایک کتاب پر نظر پڑی، جس کا

نام تھا''ال إسلام في هسبانية''، اسپین میں اسلام کے بارے میں شیخ کتّانی جو''مراکش'' کے بڑے عالم ہیں، انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے، میں اس کتاب کو پڑھ رہا تھا، انہوں نے ''اندلس'' کے بارے میں لکھا ہے؛ جہاں مسلمانوں کو بالکل نیست و نابود کردیا گیا تھا، نہ وہاں کوئی مسجد باقی رہی تھی، نہ کوئی انجمن تھی، لیکن اتنے سالوں کے بعد اب وہاں حالات میں تغیر آیا، اب وہاں مسجدیں بننے لگیں، انجمنیں بھی قائم ہونے لگیں اور نوجوان جمع ہوکر کچھ دین کی دعوت کا کام کرنے لگے، وہ اِس واقعہ کو لکھ رہے تھے، اُس کتاب میں انہوں نے لکھا کہ اس میں سب سے زیادہ اہم رول اور اس کام کا سہرا سید ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ کے سر ہے۔ شیخ کتّانی نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ اسپین آئے تو انہوں نے یہ کام کیا کہ یہاں مسلمان نوجوان طلبہ کو جو''مراکش'' کے تھے، اسپین میں آکر وہ کچھ تعلیم حاصل کررہے تھے، نیز دوسرے ملکوں کے بھی تھے ان کو جمع کیا اور اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ آپ حضرات مل کر اس کام کو اٹھائیں، نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت''قرطبہ'' میں، ''اشبیلیہ'' میں، ''میڈرڈ'' میں اور''غرناطہ'' میں جوانوں کی انجمنیں قائم ہیں، یہ سب حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں صدقۂ جاریہ ہیں۔ (صدائے دل: ج:۴، ص:۳۷۴)

جب''غرناطہ'' میں''قصر حمراء'' کو دیکھنے گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بالکل سامنے''حی البیاضین'' میں عربوں کا محلہ ہے، وہاں ایک خوبصورت مسجد بن گئی ہے تو مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی کہ اسپین کی سرزمین پر مسجد کا قیام عمل میں آگیا، تو ہم خاص طور پر تلاش کرتے ہوئے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور قدرتی طور پر ہاتھ اللہ کے دربار میں اٹھے اور حضرت مولاناؒ کے لیے ہم نے دل سے دعائیں کیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کے درجات بلند فرمائے۔

حضرت مفکر ملتؒ فرماتے ہیں: حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ

میرے اندر جو تھوڑا سا جذبہ دین کے کام کرنے کا پیدا ہوا یہ میری والدہ کی دَین ہے، میری والدہ ہم کو سونے سے پہلے علامہ واقدیؒ کی ''فتوح الشام'' سنایا کرتی تھیں، جس میں صحابۂ کرام کے غزوات کے واقعات ہیں کہ انہوں نے کیسی کیسی قربانیاں دیں، ہر ہر گھر میں ہر مرد اور عورت کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو صحابۂ کرام کی قربانی کے قصے روزانہ سنائے، اگر ہمیں اس ملک میں ایمان کے ساتھ رہنا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد اس ملک میں مضبوطی سے اسلام پر قائم رہے تو صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

(صدائے دل: ج:۳،ص: ۳۹۴)

حضرت مولانا ایک عظیم انسان تھے، جن کی پاکیزہ زندگی منارۂ نور تھی، جس کی روشنی نے ہزاروں انسانوں کو صحیح راہ بتائی، مجھے اس موقع پر عالم عرب کے ممتاز ادیب وعالم شیخ علی طنطاویؒ کے یہ الفاظ یاد آرہے ہیں، انہوں نے فرمایا اور بہت خوب فرمایا:

''اذا كان مَن بنٰى حصْنًا أو قادَ جيشاً عُدّ من العظماءِ فأبو الحسن بنىٰ الإسلام فى نفوس تلاميذه حصوناً اقوى وأمتن من حصون الحجر ، بنى أمة من العلماء الصالحين والدُعاة المخلصين''.

''اگر کسی شخص کو قلعہ تعمیر کرنے یا کسی لشکر کی قیادت کے سبب عظیم شمار کیا جاتا ہے تو ابوالحسن نے اپنے تلامذہ کے دلوں میں ان پتھروں کے قلعوں سے زیادہ مضبوط اور محکم اسلامی قلعے تعمیر کئے ہیں، انہوں نے علماء صالحین اور دعاۃ مخلصین کی ایک جماعت تیار کردی ہے۔''

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تدریس، اپنی تالیف وتصنیف، اپنی خطابت اور اصلاحی مجالس کے ذریعہ نصف صدی سے زائد تک جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ ملت اسلامیہ کے علماء ومصلحین کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، مولاناؒ نے اپنی تمام تر

صلاحیتیں اسلام اور صرف اسلام کی سربلندی کیلئے وقف کردی تھیں، اسلامی دنیا کے ایک ممتاز عالم شیخ علامہ یوسف القرضاوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

’’ان الذی یشغل عقله وقلبه و وقته باستمرارٍ هو الإسلام ورسالته وحضارته وانبعاثه وصحوته وقضایا أمتِه وهجمة أعدائه، وأعظم ما یَهمّه هو تقویة الجبهة الداخلیة فی مواجهة الغزوة الخارجیة هو تربیة الفرد، لأنه اللبِنة الاساسیة فی بناء الجماعة هو تغییر النفس، ان اللّٰه لا یغیّر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسهم‘‘۔

’’وہ بات جس نے ان کے دل ودماغ اور زندگی کے پورے اوقات کو مشغول رکھا وہ صرف اسلام تھا، اسلام کا پیغام، اس کی تہذیب، اس کی نشأت ثانیہ، اس کی بیداری، نیز امت مسلمہ کے مسائل، اعداء اسلام کے حملے اور ان کا دفاع اور ان سب سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلے داخلی محاذ کو مضبوط کرنے کی فکر اور یہ کہ افراد امت کی تربیت کی جائے، اس لئے کہ یہی وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر کسی جماعت کی صحیح تعمیر ہوسکتی ہے، انسانی نفوس میں تبدیلی اور انقلاب؛ تاکہ اللہ تعالی اس کے سبب امت کی قسمت بدل دے‘‘۔

محترم حضرات! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان خدمات اور کارناموں کی فہرست بہت طویل اور عنوانات اتنے متنوع ہیں کہ جس کے بیان کرنے کے لئے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، مثلا مولاناؒ کے طریق تدریس اور نصاب درس کا عنوان، تبلیغ ودعوت، تزکیۂ نفس، فرق باطلہ کے رد میں حکیمانہ انداز سے کتابیں تیار کرنا، اسلام پسند نوجوانوں کیلئے صالح اور عصری اسلوب میں کتابوں کا تیار کرنا، ادب اسلامی کا احیاء، دینی تعلیم کے مکاتب کا قیام اور اس کی سرپرستی، مختلف اکیڈمیوں اور اشاعتی اداروں کی سرپرستی وغیرہ۔

(افکار پریشاں: ج ۱/ص: ۱۵۰)

ندوۃ العلماء کا ۸۵ رسالہ جشن ہوا تو عالم اسلام اور خصوصاً عرب ممالک کے مشہور ومعروف علماء وفضلاء حضرت کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لائے، کسی ہندوستانی عالم کو کچھ تکلیف ہوئی تو ان کی زبان سے نکلا: ہاں بھائی علی میاں کے پاس دودھ دیتی گائیں آئی ہیں، اس لئے ہمیں کون پوچھے وغیرہ، حضرتؒ کے کانوں میں جب یہ جملے پہنچے تو انہوں نے دوسرے دن جلسہ میں فرمایا: میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان عرب علماء کو ان کے مال ودولت کی وجہ سے نہیں بلایا ہے؛ بلکہ میرا مقصد صرف ہمارے علماء اور بزرگوں کی خدمات کے نمونے ان کے سامنے پیش کرنا تھا، جہاں تک دولت کا تعلق ہے؛ مجھے عرض کرنے دیجئے کہ عرب کے بعض امیروں اور خاص طور پر شاہ فیصل مرحوم نے بڑی بڑی پیشکشیں کی تھیں مگر میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ ؎

برو ایں دام بر مرغ دیگر نہ

اور پھر دنیا نے دیکھا کہ شاہ فیصل ایوارڈ ہو یا امارات کا ایوارڈ ہو، لاکھوں روپئے کی یہ دولت اس من کی دنیا کے مالک نے کسی طرح ہاتھ لگائے بغیر خیر کے کاموں میں عطا کر دیئے۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست = تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس استغناء کی مثالیں موجودہ دور میں شاید کبھی کبھی اور کسی کسی جگہ ہی نظر آئیں گی، اور اسی عالی وصف کے سبب اس مرد فقیر نے بڑے بڑے بادشاہوں، امیروں، وزیروں کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی ہے، اور خطوط کے ذریعہ ان کو صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی تلقین فرمائی، مولاناؒ کی خود نوشت سوانح اور رسائل الاعلام میں ان کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت مولانا ندویؒ کی ذات سراپا اسلام اور سیرت نبوی کا مکمل

نمونہ تھی اور آپ نے اپنے علم اور عمل دونوں سے ایسے ہی کامل اسلام کی نمائندگی کرنے والی جماعت تیار کرنے کی محنت فرمائی، عرب وعجم کے علماء وفضلاء اور مفکرین نے جس کا کھل کر اعتراف کیا۔ (افکار پریشاں: ج/۱،ص:۱۵۶)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں رحمہ اللہ کی خدمات کے متعدد میدان رہے ہیں: تدریس، تالیف، دعوت وتبلیغ، اصلاح معاشرہ، اصلاح ادب وثقافت، تربیت اساتذہ، قیام مکاتب، عالم اسلام میں نوجوانوں کی صحیح رہنمائی، مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت اور امت کے مسائل پر صاف صاف رائے کا اظہار، باطل افکار ونظریات پر متوازن اور علمی انداز میں تنقید، عالم عربی کے مسائل پر بے لاگ تبصرہ وغیرہ کتنے میدان ہیں جن میں آپ نے زندگی بھر کام کیا، زندگی کے آخری دور میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور مذہبی جنون وتشدد کی روک تھام کے لئے ''پیام انسانیت'' کے نام سے تحریک چلا کر انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے کی سعی کی، پھر حضرت رحمہ اللہ کی خدمات کا یہ دائرہ ہندوستان تک موقوف نہیں تھا، بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، برما، افغانستان اور یورپ کے ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا۔

(افکار پریشاں: ج/۱،ص:۱۶۵)

گدڑی میں لعل پنہاں ہے:

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ جب شام تشریف لے گئے تو اہلِ شام یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت مولانا ٹھاٹھ باٹ میں ہوں گے، سر پر عمامہ ہوگا، جبہ قبہ ہوگا، لیکن جب انہوں نے حضرت مولانا کو معمولی لباس پر شیروانی زیب تن کئے ہوئے دیکھا تو بول پڑے ''وجدنا أبا الحسن خفيف الجسم و خفيف اللباس'' جس وقت حضرت مولانا نے پہلا خطبہ دیا تو پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ ظاہر میں تو یہ

شخص خفیف اللباس ہے؛ لیکن حقیقت اس کی کچھ اور ہی ہے۔

(صدائے دل: ج/ ۴، ص: ۱۸۱)

مدارس حضرت مفکر اسلامؒ کی نظر میں:

بھائیو! یہ مدارس عربیہ بقول حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ ''وہ ایسی فیکٹریاں نہیں ہیں جن میں صرف کچھ پڑھنے لکھنے والے آدمی تیار کریں اور وہ اپنے پیٹ پالنے کے کچھ راستے سوچیں، ان مدارس کا یہ مقصد بالکل نہیں ہے، مدارس میں دو چیزیں کرنی ہوتی ہیں، ایک تو طلبہ کے اندر صلاحیت پیدا کرنا، دوسرے ان کے اندر صالحیت پیدا کرنا، ان دو باتوں کو آپ یاد رکھیں''۔ (صدائے دل: ۴/ ۱۹۶)

ایک مرتبہ ہم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے پاس لکھنؤ گئے، حضرت عشا کے بعد کھانا تناول فرماتے تھے، اس کے بعد طلبا و اساتذہ آکر بیٹھ جاتے تھے، حضرت مولانا نے مجلس میں طالب علموں سے یوں فرمایا کہ کسی کتاب کا سرسری طور پر مطالعہ کرلینا کافی نہیں ہے، جس کتاب کو آپ پسند کریں، اس کی عبارت آپ کو اچھی معلوم ہو، اس کو آپ بار بار پڑھیں، اتنی مرتبہ پڑھیں کہ اس کے صفحے کے صفحے چاٹ لیں، آپ کے ذہن میں محفوظ ہوجائے؛ اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے احمد امین کی کتابیں ''ضحی الإسلام''، ''فجر الإسلام'' اور ''ظهر الإسلام'' کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ اس کی عبارتیں میرے دماغ میں محفوظ ہوگئیں؛ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی تعبیرات میں احمد امین کا اسلوب ہے۔ (صدائے دل: ۴/ ۲۱۸)

آج کل ادب اسلامی اور ادب الاطفال پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے، اس لئے اس مختصر مقالہ میں ہم حضرت مولانا مدظلہ کی کتاب ''قصص النبیین' سے چند نمونے پیش کرنا چاہتے

ہیں، کیونکہ ان کی کتاب میں ادب اطفال پر کام کرنے والوں کے لئے بڑی رہنمائی ہے، اس کتاب میں واقعات کی سچائی بھی ہے، زبان کی چاشنی بھی، اور عقائد و کردار کی تعمیر بھی، بلا شبہ یہ ادب اسلامی و ادب الاطفال کا بہترین نمونہ ہے، چنانچہ قصص النبیین میں بھی حضرت مولانا نے قصص کے ذریعہ تشریح عقائد و تہذیب اخلاق کا کام کیا ہے، مصر کے مشہور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے ادب کے بارے میں فرمایا کہ ''إن الأدب هو السموبضمير الأمة'' مولانا علی میاں ندوی کا ادب اسی تعریف کے مصداق ہے۔

مصر کے مشہور مصنف اور ادیب شہید سید قطبؒ نے بھی جزء ثالث پر بہترین مقدمہ لکھا ہے اس کا ایک ایک حرف نقل کے قابل ہے مگر اختصار کے سبب صرف ایک بات نقل کرتے ہیں:

''میں نے بچوں کی بہت سی ایسی کتابیں جن میں انبیاء علیہم السلام کے قصے ہوتے ہیں، پڑھی، مجموعہ ''القصص الدينيه للأطفال'' (جو کہ قرآن کریم سے ہی ماخوذ ہیں) کی تالیف میں بھی شریک رہا ہوں، لیکن میں بلا کسی تکلف اور رواداری کے اس بات کی گواہی دے رہا ہوں کہ شیخ ابوالحسن ندوی کا یہ مجموعہ جو میرے سامنے ہے، ان سب سے فائق اور مکمل ہے، اور یہ تفوق اس وجہ سے ہے کہ وہ لطیف اشارات کرنے، قصے کے مقاصد، اس کے جزئیات اور اس کے نتائج کو اجاگر کرنے اور ان کی ضمنی تخیلات کرنے پر مشتمل ہے، نیز وہ قصے ان اہم ایمانی حقائق کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہیں جو چھوٹوں اور بڑوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ شیخ ندویؒ کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور مزید توفیق سے نوازے۔ آمین۔''

یہ ہیں وہ تاثرات جو عرب کے معروف فضلاء کے قلم سے نکلے ہیں، اور جن سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ آسانی سے لگا سکتے ہیں، افکار پریشاں جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۳ سے ۱۸۳ تک قصص کے امتیازات واختصاصات کا ذکر ہے، صفحہ ۲۶۳ سے ۲۹۷ ''ادیب مؤمن کا

سفرنامہ'' کے عنوان سے حضرت کی کتاب مذکرات سائح فی الشرق الاوسط (شرق اوسط کی ڈائری) کا حضرت مفکر ملتؒ نے بہترین ترجمہ کیا ہے، اور شاندار عنوانات سے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اب ان جواہر پاروں کو ملاحظہ فرمائیں جو اس کتاب میں موجود ہیں، وباللہ التوفیق۔

حضرت مفکر اسلامؒ کی ادبی خصوصیات:

حضرت مفکر ملتؒ نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی ''قصص النبیین'' کے ادبی پہلو پر کلام کرتے ہوئے کئی صفحات میں لعل وجواہر بکھیرے ہیں:

ایسی بہت سی خوبیاں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی ''قصص النبیین'' میں ہیں، طلبہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ حضرت مولانا نے جہاں وہ قصہ نقل کیا کہ بادشاہ کے سامنے کہا گیا کہ ''ربي الذي يحيي ويميت'' تو اس نے کہا ''أنا أحيي وأميت''، اس نے دو آدمیوں کو بلایا، ایک کو قتل کرایا اور دوسرے کو چھوڑ دیا تو وہاں حضرت مولاناؒ نے ''قصص النبیین'' میں ایک جملہ لکھا ہے اور کیسا جان دار جملہ ہے ''وكان الملك غبيًا وكذالك كل كافر'' دنیا میں ہر کافر غبی ہے، اس لیے کہ جو انسان اس سرزمین پر آیات وانفس ''إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُوْلِي الْأَلْبَابِ'' (آل عمران: آیت ۱۹۰) دیکھ کر بھی اللہ کے وجود کی وحدانیت کو نہیں پکڑ سکتا وہ غبی ہے۔ حضرت مولانا جو کہنا چاہتے ہیں وہ چھوٹا سا جملہ ہے ''وكذالك كل كافر'' لیکن ہم لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ حضرت مولانا نے یہ کوشش کی ہے کہ ''قصص النبیین'' پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کی عظمت پیدا ہو، حضرت نے ہر نبیؑ کے بارے میں بہت وقیع کلمات لکھے ہیں، وہ چھوٹے بچوں کے دلوں میں انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کی محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں، یہ خاص چیز تھی جو حضرت نے ''قصص النبیین'' میں لکھی۔ اسی

طرح حضرت نے ''مختارات'' میں بھی بہت سی مفید چیزیں طلبہ کے لیے پیش کی ہیں، ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

میں اپنے گجرات کے مدرسوں کی بات کرتا ہوں، ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ حضرت مولاناؒ نے جو حاشیہ میں بعض چیزیں لکھی ہیں اس کو تم نے پڑھا، اس نے کہا: ہم حاشیہ کبھی نہیں دیکھتے، ہم نے کہا کہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے فضول نہیں لکھ دیا ہے، کچھ کام کی وجہ سے حاشیہ لکھا ہے کہ صاحبِ قطعہ کون ہیں؟ ان کے اسلوب کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ طٰہٰ حسین کی کیا خصوصیات ہیں؟ احمد امین، احمد حسن زیات اور محمود عقاد کیسا لکھتے ہیں؟ اگر آپ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے تو کیسے بات بنے گی۔

(صدائے دل: ۲۲۱/۴)

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ جامع ازہر گئے تھے اور ازہر کے طلبہ کی حالت دیکھ کر حضرت مولانا کو بہت تکلیف ہوئی تھی، انہوں نے شیخ الازہر سے بات کی کہ جامع ازہر عالم اسلام کا مرکز ہے، یہاں کے طلبہ میں دین کا جذبہ اور دین کی تڑپ ہونی چاہیے، بہت تفصیل سے گفتگو کی تو شیخ الازہر نے کہا کہ شیخ ابوالحسن جو بات آپ زبانی کہہ رہے ہیں مجھے لکھ کر دیں؛ تاکہ میں اپنی لجنہ کے سامنے پیش کروں، حضرت مولانا رات بھر بیٹھے اور انہوں نے ایک تحریر تیار فرمائی اور صبح ''وکیل الازہر'' کو پیش کیا، حضرت مولانا کی عبارت دیکھ کر وہ سمجھے کہ کسی عرب یونی ورسٹی کے یہ فاضل ہیں، انہوں نے کہا: آپ نے عرب میں کہاں تعلیم حاصل کی؟ حضرت نے فرمایا کہ میں ہندوستان سے باہر پڑھنے گیا ہی نہیں، یہ تو میرا پہلا سفر ہے، وہ بہت تعجب کرنے لگے کہ ایک ہندوستانی آدمی نے اس طرح فصیح و بلیغ عبارت میں اس طرح یہ رپورٹ تیار کی۔ خیر! مجھے تو اس میں سے ایک جملہ یہ سنانا ہے کہ ازہر کے علماء کو

خطاب کر کے حضرت مولاناؒ نے ایک جملہ لکھا؛ وہ یہ تھا: ''فَقَدْ أَلْقَی الْقَوْمُ أَفَلاذَ کَبِدِھِمْ أَمَامَکُمْ وَ أَنْتُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ'' قوم نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہارے سامنے لاکر ڈالا ہے، قیامت کے دن ان کے بارے میں پوچھے جاؤ گے، ہر مدرس خواہ وہ کسی بھی مدرسہ میں پڑھاتا ہو اس کو یہ جملہ لکھ کر رکھنا چاہیے کہ قوم نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ہمارے سامنے لاکر ڈالا ہے اور ہم قیامت کے دن ان کے بارے میں پوچھے جائیں گے اور ہمارے اسلاف میں یہی سوز تھا، اگر کوئی طالب علم ان کے پاس جاتا تھا تو وہ سوچتے تھے کہ یہ آیا ہے تو میں اس کو کیسے سمجھاؤں۔ یہ ہمارے اکابرین جن کو ہم بزرگ مانتے ہیں، جو ہمارے ائمہ تھے، ان کے اندر کیسا سوز تھا۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ہمیشہ یہ مصرع پڑھتے تھے:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

سوزِ جگر نہ ہو تو سارے نقش ناتمام ہیں، اللہ تعالیٰ پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کو سوزِ جگر عطا فرمائے۔ (صدائے دل: ۴/ ۲۲۶)

تصوف داعی کا وظیفۂ حیات ہے:

ایک عرب عالم نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے بارے میں لکھا کہ وہ ہمارے یہاں تشریف لائے اور گورنمنٹ نے ان کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا، مولانا کے لیے تو بڑے بڑے بادشاہ اور امرا چاہتے تھے کہ ہمارے یہاں ٹھہر جائیں تو حضرت نے فرمایا کہ میرا معمول ہوٹل میں ٹھہرنے کا نہیں ہے؛ چناں چہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے مسجد کے ایک کمرے میں قیام فرمایا تو ایک عرب عالم نے یہ قصہ بیان کر کے حضرت کے انتقال کے بعد ایک جملہ لکھا جو مجھے بہت پسند آیا، جسے میں نے اپنے

مضمون میں بھی لکھا ہے کہ ''إن الداعي إلى الله يحتاج إلى تصفية القلب'' **جتنے بھی دعاۃ الی اللہ ہیں وہ اپنے دل کی صفائی کے محتاج ہیں اور حضرت چوں کہ داعی الی اللہ تھے اس لیے مسجد کے کمرے میں ٹھہرتے تھے؛ تاکہ ان کا دل پاک صاف رہے** اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ تقریر فرماتے تھے تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے، ''جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ'' میں عرب کے بڑے بڑے علما اور طلبا کے سامنے بیان کیا تو مجمع میں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکے ہوں، آپ نے عرب نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے عرب کے نوجوانو! تم اپنے دلوں پر اس جملہ کو نقش کرلو جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک زمانہ میں فرمایا تھا ''أينقص الدين وأنا حي'' کیا دین میں کمی ہوسکتی ہے اس حال میں کہ میں زندہ ہوں؟ یعنی آپ اپنی زندگی میں یہ طے کرلیں کہ ہم زندگی کے آخر تک اسی دعوت کا کام کرتے رہیں گے، میری زندگی باقی ہو اور دین میں کمی آجائے ایسا نہیں ہوسکتا، یہ نوجوان اپنے دل پر یہ جملہ لکھ لیں، مولانا نے جب یہ جملہ کہا تو عرب نوجوان رونے لگے، دنیا کے ہر مسلمان نوجوان کی یہی تڑپ ہونی چاہیے، دنیا کے کسی خطہ اور کسی علاقے میں رہ رہا ہو اس کی تڑپ اور فکر یہی ہونا چاہیے کہ ''أينقص الدين وأنا حي''، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اپنے دور کے بہت بڑے داعی الی اللہ تھے، کروڑوں روپے دیے گئے لیکن توجہ نہیں دی، شیخ زائد بن سلطان نے ان کے انتقال سے پہلے لاکھوں روپے دیے لیکن ایک پیسہ گھر نہیں لائے، کتابیں لکھتے تھے، تقریریں کرتے تھے، سیاسی جلسوں میں جاتے اور تبلیغی جلسوں میں بھی جاتے لیکن جب تک حضرت رائے پوریؒ زندہ رہے آپ ان کی خانقاہ میں جاتے رہے۔ لوگوں کو بعض مرتبہ غلط فہمیاں بہت ہو جاتی ہیں، علم تھوڑا ہوتا ہے اور اپنی محدود فہم میں اپنے کام کو ایسا سمجھتے ہیں کہ بس یہی ایک کام

ہے، اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ (صدائے دل: ۲۳۹/۴)

دل کے دریچے سے:

قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک مرتبہ اپنی خانقاہ میں تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اور کسی بات پر ذکر چلا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ علما کی غلطیاں نکالتے رہتے ہیں، یہ سن کر حضرت سیدھے بیٹھ گئے اور حضرتؒ نے جلال میں آ کر فرمایا: ایسے آدمی کا منہ قبلہ سے پھیر دیا جاتا ہے اور جس کو یقین نہ ہو قبر کھول کر دیکھ لے، ڈرنے کی بات ہے، اللہ ہمیں توفیق دے، ہم دین کا کام کریں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو علما کے ساتھ وابستہ بھی رکھیں، اس مسجد میں بیٹھ کر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے سامنے دل کھول کر یہ بات کروں، دیکھو! میں نے بھی نفسیات (سائکولوجی) کی کتاب پڑھی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کو کس طرح خوش کرنا چاہیے، میں آپ کے سامنے میٹھی میٹھی باتیں کر سکتا ہوں، یہ بھی مجھے آتا ہے، ہماری تو پوری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے؛ **لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مولانا! وعظ کڑوا ہوتا ہے اور علماء کا کام یہ ہے کہ جہاں کہیں لوگوں کو راستہ سے ادھر ادھر دیکھیں تو صاف طور پر بیان کریں کہ یہ غلط ہے اور دین وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔** (صدائے دل: ۲۴۹/۴)

عربوں کو دعوت:

جیسے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے بھی عربوں کو مخاطب کر کے ایک کتاب لکھی ہے ''إلی الإسلام من جدید'' حضرت کی یہ ایک کتاب ہے، جس میں عربوں کو مخاطب کیا ہے کہ بھائیو! تم اسلام کی طرف آؤ، تم کہاں بھٹک رہے ہو نیشنلزم کی طرف! تم نے کہاں عبد الناصر کو اپنا امام مان رکھا ہے، ''الازہر'' رسالہ کے ایڈیٹر احمد حسن زیات نے ایک آرٹیکل

لکھا، جس میں ایک جگہ ایسا جملہ لکھ مارا کہ مولانا کی طبیعت پر بڑا اثر ہوا، اس نے لکھا کہ ''إن ثورة عبد الناصر أعرف وأشمل من ثورة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم'' إنا للّٰه وإنا إليه راجعون! مولانا تڑپنے لگے کہ یہ حال ہوگیا عرب ممالک کا کہ مصر جو ''کنانة الإسلام'' کہلاتا تھا، جو ''مهد الإسلام'' ہے، جہاں ازہر ہے وہاں یہ بات لکھی جارہی ہے کہ عبدالناصر کا انقلاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب سے زیادہ مکمل ہے؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، تو مولانا کی طبیعت میں تڑپ پیدا ہوئی، پھر مولانا نے مضامین پر مضامین لکھے، عربوں کو خطاب کیا کہ کہاں جارہے ہو؟ تم کس کی طرف جارہے ہو؟ مکہ معظّمہ گئے تو وہاں کے نوجوان عالموں نے مکہ معظّمہ میں مولانا کو اپنی نادی میں دعوت دی، وہاں مولانا نے یہ بات کہی کہ ''إن سيدنا محمدًا صلی اللّٰه عليه وسلم هو روح العالم العربي والإسلامي'' اے عربو! سمجھ لو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی عالم عربی اور عالم اسلامی کی روح ہیں، اگر تم نے ان سے اپنا تعلق قطع کیا تو بیکار دنیا میں مٹ جاؤ گے! ہماری عزت تو اسلام کے ساتھ ہے، ''نحن قوم أعزنا اللّٰه بالإسلام'' ہم ایسی قوم ہیں کہ اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے، اگر ہمارے پاس اسلام نہیں ہے، ہمارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں۔ (صدائے دل: ۴/ ۲۷۲)

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا، اس مدرسہ میں حاضر ہوکر بڑی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو مزید ترقی عطا فرمائے اور ہمارے جو علمائے کرام یہاں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کام کررہے ہیں اور ان کی جو فکریں ہیں کہ ہمارے یہ طلبا اسلام کے سپاہی بن کر پورے عالم میں پھیلیں اور اپنی زندگی کا مقصد ایک ہی چیز کو بنائیں، حضرت مولانا علی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ طلبا کو حضرت صدیق اکبرؓ کا یہ جملہ اپنے قلب

پر نقش کر لینا چاہیے، حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا ''أينقص الدين و أنا حي '' کیا دین میں کمی بیشی ہوسکتی ہے میرے زندہ ہوتے ہوئے، میں زندہ ہوں اور دین میں کمی بیشی ہوتی ہوئی دیکھوں اور میں برداشت کرلوں ایسا نہیں ہوسکتا، کھڑے ہوکر کہیں گے کہ یہ بات غلط ہے اور صحیح یہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہے، اس پر ڈٹے رہیں چاہے ہماری دنیا کا نقصان ہو جائے، ہم اِن مدرسوں میں اکتساب زر کے لیے نہیں آئے کہ ہم پڑھ کر بہت دولت کمائیں گے، بالکل دولت ملنے والی نہیں ہے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کا یہ ذہن ہو تو ابھی سے وہ اپنا راستہ بدل دے۔ (صدائے دل: ۲۸۱/۴)

وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری:

میں ایک مرتبہ ندوہ گیا تو حضرت کا بیان ہونے والا تھا، یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، نئے سال کی شروعات تھی، حضرت نے اس بیان میں فرمایا کہ میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ اپنی نیتوں کو دیکھ لیں، اگر آپ کو اسلام کی خدمت کرنی ہے تو ندوہ حاضر ہے، اگر آپ کو پیسہ کمانا ہے تو یہ یونی ورسٹیاں موجود ہیں، آپ ابھی سے اپنا راستہ متعین کرلیں، یہ پیسہ کمانے کی درس گاہیں نہیں ہیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث حاصل کرنے کی درس گاہیں ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے زندگی بھر اللہ کے دین کو پہنچانے اور اللہ کے بندوں کو جہنم سے بچانے میں اتنی محنت کی کہ آیت نازل ہوگئی ''لعلك باخع نفسك ألا يكونوا مؤمنين '' اے پیغمبر! شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے اس بات پر کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اتنا سوز تھا، كان دائم الفكرة، طويل الأحزان، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے۔ (صدائے دل: ۲۸۲/۴)

أقول قولي هذا و استغفر الله لي و لكم و لسائر المسلمين فاستغفروه، إنه هو

الغفور الرحیم.

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب کسی قوم کے دماغ پر فالج ہوجاتا ہے تو اس کا دماغ کام نہیں کرتا کہ اللہ نے مجھے یہ دولت دی ہے، مجھے اس کو کہاں صرف کرنا چاہیے، میری قوم کے بچے بھوکے مر رہے ہیں، کتنے بچے ایسے ہیں جو اسکول کی فیس نہ ہونے کی وجہ سے اسکول نہیں جاسکتے اور ہم یہ اسراف کرر ہے ہیں، ہم اپنے دسترخوان پر پانچ پانچ قسم کی ترکاریاں پکا کر بیٹھتے ہیں، ہم بڑی بڑی پارٹیاں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں، یہ سب غفلت کی باتیں ہیں۔ (صدائے دل: ۳۱۹/۴)

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے مطالعہ کا انداز:

اور پھر اپنی مثال دی، فرمایا کہ میں نے احمد امین کی کتاب ''فجر الاسلام''، ''ضحیٰ الاسلام'' اور ''عصر الاسلام'' کو اتنا پڑھا کہ ان کے صفحات میرے ذہن میں محفوظ ہوگئے، آپ دیکھیں گے، مولانا علی میاںؒ کی جو عربی زبان ہے اس میں احمد امین کا اسلوب ہے۔ ہمارے اساتذہ کو تو میرے دوستو! اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کس مصنف نے کس کا اسلوب اختیار کیا ہے؟

اسکول کے نصاب تعلیم پر نظر رکھئے:

میرے دوستو! امت کو ایسے راستے پر لے جایا جارہا ہے جس کا میں اس وقت تذکرہ کرنا نہیں چاہتا، جو ہمارا نظام تعلیم ہے بہت خطرناک ہے، آپ لوگ اس کو دیکھیں کہ اسکولوں میں کیا پڑھایا جارہا ہے، ہر ایک عالم کی ذمے داری ہے کہ وہ اسکول کے نصاب کو دیکھے، اس کے ہر ہر صفحہ پر غور کرلے کہ کس انداز سے ہمارے بچے ایسے ماحول میں الحادو لادینیت کی راہ پر ڈالے جارہے ہیں اور ہمارے قیمتی سرمایہ کو ہم سے قیمت وفیس لے کر دین

سے برگشتہ کررہے ہیں، اکبرالہ آبادی نے اس نظام تعلیم پر خوب طنز کیا ہے اوراپنے ظریفانہ انداز میں ایسا شعرفرمایا جس کے بارے میں حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اکبر کا یہ شعر بہت سے دیوانوں پر بھاری ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اسکولوں کی مہم اتنی خطرناک ہے کہ جوکام فوج وسپاہ نہ کرسکی وہ اس خاموش مشن سے لیا جارہاہےاور ہماری غفلت کی انتہا یہ ہے کہ ہم اس بارے میں سوچتے ہی نہیں، علامہ اقبال کی دوررس بصیرت نے اس کاادراک کیااور فرمایا ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو * تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
ہوجائے ملائم تو جدھر چاہےاسے پھیر سونے کا ہمالہ ہوتومٹی کا ہےاک ڈھیر

اللہ اکبر! ہم اگرغفلت کریں گےتو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہم کیا جواب دیں گے؟ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔

حضرت مولاناؒ کی بعض تقاریر سننے کے بعد ایسا صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے حضرتؒ کو بھرپور ایمانی فراست سے مالا مال فرمایا تھا، برما کے شہر رنگون میں مولانا نے برما کے فوجی انقلاب سے قبل ایک پرسوز تقریر فرما کر وہاں کے مسلمانوں کو جن خطرات کی طرف متوجہ فرمایا تھا چند ہی سالوں میں دنیا نے دیکھا کہ وہ حالات پیدا ہوگئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ ان خطرات وحوادث کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرمارہے ہیں، برما انقلاب کے بعد اکثر لوگوں نے کہا واقعی۔۔۔۔ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید (افکار پریشاں:۱/۱۶۵)

اس طرح کے کئی واقعات مولانا رحمہ اللہ کی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیر پر شاہد ہیں۔

اسلام سے برگشتہ کرنے کا طریقہ: حضرت علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب اس دور میں کوئی کسی کو صاف لفظوں میں یہ نہیں کہتا ہے: تم اسلام چھوڑ دو، بلکہ اب انہوں نے ایک شکل یہ اختیار کی ہے کہ ادبی کتابوں کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرتے ہیں، وہ ادبی کتابیں اس انداز سے لکھیں گے کہ اس سے پڑھنے والے کا ذہن اسلام سے برگشتہ ہوجائے، مصر اور شام میں ایسے ادباء پیدا ہوئے اور پھر ان کو Noble Prize دئے گئے، مصر کا مشہور لکھنے والا محمود ہے اس کو Noble Prize ملا، اس نے ایک ناول لکھا ''اولاد حارتنا'' (ہمارے محلہ کے بچے) ایسے دل کش نام ہوتے ہیں، اور اس میں اس نے ایسی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے والا اسلام سے برگشتہ ہوجائے، اس لئے ان لوگوں کے یہاں ایسے لوگوں کی بڑی قدر ہے، سلمان رشدی کی قدر ہے، محمود کی قدر ہے، طٰہ حسین کی قدر ہے، بہرحال انہوں نے مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کئے جو اسلام کے خلاف لکھ رہے ہیں، میرے بھائیو! ان کے یہاں یونیورسٹیوں میں پی، ایچ، ڈی، کرنے کے لئے مسلم طلبہ آتے ہیں، تو انہیں بالقصد ایسے ہی کام سپرد کئے جاتے ہیں، مثلاً کہیں گے کہ آپ تلاش کیجئے کہ محمد ابن اسماعیل البخاری نے کہاں کہاں غلطیاں کی ہیں؟ چنانچہ وہ امام بخاریؒ کی غلطیاں تلاش کر کے مقالہ تیار کرتے ہیں، دیکھو! مسلمان لڑکے کے پاس یہ کام کروایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کو PHD کی ڈگری دیں گے، چنانچہ ایک مسلمان طالب علم نے کہہ دیا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غلطیاں نکال کر اپنا مقالہ تیار کروں، تو انہوں نے کہا کہ پھر آپ کو PHD کی ڈگری نہیں مل سکتی۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤرخین حیران ہیں کہ

ہندوستان میں یہ کیا ہوا؟ کہ اکبر نے اتنی محنت کر کے دین الہی کو جاری کیا تھا اور اس کے بعد پھر جہاں گیر آیا اور جہاں گیر کے بعد عالم گیر آئے تو پورے ملک کے حالات بدل گئے، اور پھر مذہب کا ایک رجحان پیدا ہو گیا، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اور زیادہ حالات خراب ہوتے، اس لئے کہ بگاڑ کی طرف قومیں زیادہ جاتی ہیں؛ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں کہ سرہند کے کونے میں بیٹھے ہوئے اس فقیر کی محنت نے اس ملک کے رخ کو بدلا ہے۔ (صدائے دل: ۱۶۲/۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر سرہند شریف گئے تو یہ کہا ؎

''سرہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں''

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ ادب کے ذریعہ الحاد پھیل رہا ہے، ناولوں کے ذریعہ دنیا میں الحاد پھیلایا جارہا ہے، لٹریچر کے ذریعہ الحاد پھیلایا جارہا ہے، اس لئے ہمیں بھی ان کتابوں کو دیکھنا چاہئے جو چھپ رہی ہیں کہ ان میں وہ کیا چھاپ رہے ہیں؟ ہمارے بچے اسکول میں جو سبق پڑھ رہے ہیں وہ کس انداز کے ہیں؟ اگر ہم اس کی طرف نظر نہیں کریں گے تو وہ زہر ہمارے گھروں میں پھیلتا جائے گا اور بچے ہمارے ہاتھ سے نکلتے جائیں گے۔ (صدائے دل: ۱۶۷/۳)

ایک عالم ربانی کی صدا کی طاقت:

میرے بھائیو! کبھی کبھی ایک عالم کی صدا قوموں کو بچا لیتی ہے، ہمارے ملک میں یوپی میں ایک قانون پاس ہوا تھا کہ جب بچے اسکول میں جائیں تو سرسوتی دیوی کے سامنے نمن کریں (اس کے سامنے جھکیں) ہندو اس کو تعلیم کی دیوی مانتے ہیں، بہر حال یہ قانون پاس ہونے والا تھا کہ سرسوتی دیوی کی تصویر اسکولوں میں لگائی جائے گی اور جو بھی بچہ اسکول میں

داخل ہوگا وہ پہلے اس کے سامنے جا کر نمن کرے گا؛ تا کہ اس کو علم آئے، وہاں کے کچھ وزراء یہ سوچ رہے تھے، تو جب حضرت مولانا علی میاںؒ کو پتہ چلا کہ یہ قانون نافذ ہونے والا ہے تو حضرتؒ نے فوراً بیان دیا، آپؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو صاف طور پر یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ کسی دیوی کے سامنے جھکنا شرک ہے اور مسلمان کسی قیمت پر بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے، **اگر یہ قانون لازمی طور پر نافذ کیا جائے تو میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے بچوں کو ان اسکولوں سے نکال لیں، ہم دنیوی علم کے بغیر رہنا پسند کریں گے، شرک میں رہنا پسند نہیں کریں گے،** بہر حال حضرت نے اس پر ایک بڑی زوردار تقریر فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ حضرات انبیاء کرام کو بھی اپنے بچوں کے بارے میں جو سب سے زیادہ فکر تھی وہ توحید ہی کی تھی۔ (صدائے دل: ۳/۱۶۹)

فکر علی میاں:

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا کارنامہ: **مولانا علی میاں صاحب نے جو سب سے بڑی خدمت انجام دی وہ یہ ہے کہ عرب نوجوانوں کے دلوں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کم ہو رہی تھی اور عرب قائدین کی محبت ابھر رہی تھی،** وہ تو جمال عبدالناصر پر پاگل سے ہو گئے تھے، احمد حسن زیات جیسا لکھنے والا لکھ گیا ''ان صورۃ عبدالناصر اعظم واکبر من صورۃ محمد (نعوذ باللہ من ذلک) یہ الفاظ اس کے بارے میں لکھے گئے، تو جب عربوں میں یہ ارتداد آیا تھا تو ان کے سامنے کھڑے ہو کر اگر کسی نے آواز بلند کی ہو اور ڈنکے کی چوٹ کہا ہو کہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو، تمہاری فضیلت صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وابستگی میں ہے، تو وہ حضرت مولانا ہی کی ذات گرامی تھی، **مولاناؒ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ میری کتاب** ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' **کے اندر سب سے قوی وعظ وہ ہے جس کا عنوان ہے**

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ھو روح العالم والعربی'' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی عالم عربی کی روح ہیں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہماری وابستگی ہے تو ہماری عزت ہے، آپ سے ہماری وابستگی نہ رہی تو دنیا میں ہماری کوئی عزت نہیں ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست

اپنے آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاؤ کہ دین اسی کا نام ہے، اگر آپ تک ہم نہیں پہنچتے تو تمام تر بولہبی ہے، یہ دعوت تھی عرب نوجوانوں کو اور عرب کے سینکڑوں نوجوانوں میں مولانا کی کتاب پڑھنے کے بعد شعور پیدا ہوا، مولانا نے کتاب لکھی ''ردة ولا ابابکر لھا'' مولانا نے محسوس فرمایا کہ عرب نوجوانوں کے ذہنوں میں اسلام کا یقین کم ہو گیا تھا، چنانچہ آپ نے اس کے لئے کئی رسالے مثلاً ''الی الاسلام من جدید'' لکھے، مصر گئے تو مصر کے ریڈیو سے تقریر فرمائی، کہ ''اسمعی یا مصر!'' (اے مصر! سن) سوریا گئے تو کہا: اسمعی یا سوریا! (اے شام! سن) کویت گئے تو کویت کے ریڈیو اسٹیشن سے تقریر فرمائی ''اسمعی یا زھرة الصحراء!'' اے صحراء کے پھول ذرا میری بات سن، مولانا کی یہ تقاریر چھپی ہوئی ہیں۔ (صدائے دل: ۳/۴ ۲۳)

آپ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی کتاب ''تارخ دعوت وعزیمت'' کا مطالعہ فرما چکے ہوں گے اور اس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر دور میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے دور کے حالات کو کس طرح باریکی سے دیکھا اور اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کس طرح کام کیا، امام غزالیؒ، مولانا رومیؒ کو دیکھو، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھو، اور اس سے پہلے جتنے بھی حضرات گذرے ہیں، آپ تمام کو دیکھ لیں کہ انہوں نے اپنے ملک کے اور اپنے زمانہ کے حالات کا کس گہرائی سے مطالعہ کیا اور پھر اس کو کس طرح

بدل دیا، اگر کسی زمانے میں ادب کا چرچہ تھا، تو ادبی حیثیت سے انہوں نے عجیب کارنامے انجام دیئے، مولانا علی میاں صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا روم نے ایک کتاب لکھی مثنوی، وہ تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادبی شاہکار ہے، لیکن اس ادبی شاہکار نے لوگوں کے قلوب کے اندر ایمان کی جڑوں کو مضبوط کردیا، آج بھی اگر آدمی مثنوی کی ہدایتیں اور اس کے اشعار پڑھتا ہے تو اس کے دل کے اندر ایمان تازہ ہوجایا کرتا ہے، یہ ہمارے اکابرین کی خوبی تھی کہ اپنے دور کے تقاضوں کو وہ اپنے سامنے رکھتے تھے۔ (صدائے دل: ۲/ ۲۸)

میرے بھائیو! ایک زمانے میں یہاں عیسائیوں کی اُن کے پادریوں نے صحیح رہنمائی نہیں کی، اور مذہب کی صحیح تشریح نہیں کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پورے یورپ سے ان کے مذہب کی جڑیں اکھڑ گئیں، اس کی وجہ مولانا علی میاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان کا مذہبی گروپ اپنے مذہب کو اُس انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہا جو انداز عقلیت پسند لوگ سمجھ سکتے تھے، اور بہت سی ایسی چیزوں کی تنگی کردی، جس سے نوجوانوں نے کہا کہ یہ تو ایسا مذہب ہے کہ اس کی وجہ سے ہم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے، اسلام نے بڑی وسعت رکھی ہے، اسلام میں بڑی گنجائش رکھی ہے۔ (صدائے دل: ۲/ ۵۵)

خود ہی حقوق کے غاصب بن بیٹھے:

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ بار بار یہ بات فرماتے ہیں کہ اتنی ساری یونیورسٹیاں اور اتنے سارے علوم کے باوجود آج انسان بالکل درندہ صفت ہوگیا ہے، جانوروں کی زندگی گزار رہا ہے، پڑھے لکھے لوگ جن کے پاس علم ہے، جن کے پاس ثقافت ہے، جن کے پاس کلچر ہے، جن کے پاس ایجوکیشن ہے، وہ اس طرح کا برتاؤ دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں کہ ایک جانور دوسرے جانور کے ساتھ نہیں کررہا ہے۔ (صدائے دل: ۲/ ۷۴)

باطل قوتیں اسلام کے خلاف متحد:

اسلام کے خلاف دنیا میں جو سازشیں چل رہی ہیں وہ بہت خطرناک طریقہ سے اٹھ رہی ہیں، ہر دور میں ایسا ہوتا آیا ہے کہ اسلام کے خلاف کچھ قوتیں کام کرتی رہی ہیں؛ لیکن اس وقت یہ کوششیں اور تیز تر ہوتی جارہی ہیں اوران کا دائرہ بہت وسیع ہوگیاہے، ہمارے مکاتب، مدارس اور ہمارے علماء کو یہ لوگ ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

(صدائے دل:۱/ ۵۳)

بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ یہ تاریخ کا سب سے بڑاالمیہ ہے کہ اس دور میں نصرانی طاقتیں یہودیوں کے ساتھ مل گئی ہیں، حالانکہ نصرانی شروع سے یہودیوں کے دشمن رہے ہیں، کیونکہ عیسائی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (ان کے زعم میں) یہودیوں نے ہی سولی دی ہے،تو جنہوں نے ان کے پیغمبر کو سولی پر چڑھایا ہو ان کے ساتھ دوستی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کے خلاف یہود ونصاریٰ متفق ہوچکے ہیں، انہوں نے اپنے اتحاد کے خاطر اپنے عقائد میں تبدیلی کرلی ہےاور انہوں نے آپس میں مل کر ایسے حالات پیدا کردیئے ہیں کہ اسلام کسی بھی صورت میں دنیا کے کسی خطے اور علاقے میں نہ ابھرے۔

اور پھر ان کی کوششیں ان ممالک تک پہنچ چکی ہیں جن کا تعلق ان مذاہب کے ساتھ نہیں ہے، جو یہودیت اور نصرانیت کے قائل نہیں ہیں جیسے ہندومت، یعنی دیومالائی تہذیب (سنسکروتی) کے ماننے والے ممالک؛ حالانکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مشرک ہیں اور ہمارے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے،لیکن صرف اسلام کی عداوت کی وجہ سے انہوں نے ان کے

ساتھ جوڑ پیدا کیا ہے، بہر حال اس وقت حالات بڑے عجیب ہیں۔(صدائے دل:۱/ ۵۳)

حضرت مفکر اسلام نے مغربی نصاب ونظامِ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے مغربی تہذیب کا طوفان اور اس کا مقابلہ کے عنوان سے بہت ہی اہم مضمون ذکر فرمایا ہے، جس میں مغربی تہذیب کا شجرۂ نسب اور گہرائی کے ساتھ اس پر تنقید فرما کر ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کی بہت بہترین رہنمائی فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

یونانی ورومی تہذیب:

تہذیب وعلم کی تاریخ میں یونان کا ذکر جلی حرفوں میں ملتا ہے، علم وفلسفہ، ادب وشاعری اور تہذیب وتمدن میں اس کو دنیا کی امامت کا درجہ ملا تھا، ساری دنیا پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس یونانی تہذیب کی بنیاد ہی مادیت پر تھی، یورپ کے مؤرخین نے اس کو تسلیم کیا ہے، اوران کی دینی کمزوری، مذہبی اعمال ورسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی چار بنیادی خصوصیات بیان فرمائی ہیں:

(۱) غیر محسوسات کی بے وقعتی اوران میں اشتباہ۔(یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اوراس کی ذات کا تصور دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے)

(۲) خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔

(۳) دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔

(۴) حب وطن میں افراط وغلو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

’’اگر ہم ان کو ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے تنہا ’’مادیت‘‘ کا لفظ کافی ہے۔

یورپی تہذیب کی بنیاد: مذہب دشمنی:

طلوع اسلام کے بعد جب اسلامی تہذیب کا غلغلہ بلند ہوا تو اندلس کے راستہ سے اس کی روشنی یورپ میں بھی داخل ہوئی، شروع میں علم کا شوق جن افراد میں پایا جاتا تھا، وہ خفیہ طور پر اندلس میں علم حاصل کرتے تھے اور یورپ کے کلیسا کی طرف سے ان کے ساتھ سخت معاندانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا، آہستہ آہستہ یہ رجحان بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ تیرہویں صدی میں عام ہوگیا، کلیسا کی علم دشمنی کی وجہ سے مذہب وعقلیت کی کشمکش شروع ہوئی، عرصہ تک یہ معرکہ گرم رہا، بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی اور خالص مادی تمدن کا فروغ شروع ہوا، یورپ ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوا تھا، اس لئے اس نے پوری تلافی کرنے کی کوشش کی، لیکن چوں کہ کلیسا اور مذہب سے طویل کشمکش اور بالآخر اس پر فتح حاصل کرنے کے بعد یورپ نے ترقی شروع کی تھی، اس لئے اس تمدن اور تہذیب کی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر پڑی۔

حضرت مولانا نے قدرے تفصیل سے شواہد کے ساتھ یہ حقائق پیش فرمائے ہیں:

’’ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر وسکون، مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل واجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعوی کرنے والوں کے درمیان امتیاز کرسکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک ارباب کلیسا کا جمود!؟ جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کرنا کہاں تک حق بجانب ہے؟ لیکن غصہ اور اہل مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسا کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے، انہوں نے دین کے ساتھ

کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی۔

ان میں اتنی طلب صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی، فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتے جوان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ اس مخمصہ اور مذہب وعقلیت کی اس غیر ضروری کشمکش سے نجات دیتا، جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بے ضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابل نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذہب اور تشدد پسند اہل مذہب واہل حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

یأمرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم والأغلال التی کانت علیھم (سورہ اعراف:۱۵۷)

ترجمہ: (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں، گندی چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں۔

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے عیسوی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور ارباب کلیسا کی افترا پردازیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کھڑی کردی تھیں، نیز مطالعہ وتحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجات اخروی سے آزاد وبے فکر ہونے کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

مکمل مادیت کی طرف:

غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی مسیحائی سے محروم رہے۔

بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آ گیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہو گیا، خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آ گئی، اگر چہ یہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتداء میں اس کی رفتار سست تھی؛ لیکن قوت و عزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۱۹۷ تا ۲۲۴)

اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے اجتماعی اور سیاسی مصنف، ادیب اور معلم پیدا ہوئے، جنہوں نے مادیت کا صور پھونکا اور اہل ملک کے دل و دماغ میں مادہ پرستی کے بیج بو دیئے، علمائے اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے، کبھی فلسفہ کی افادیت کی اشاعت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاولی (Machiavelli) جیسے اہل سیاست نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے رکھی تھی اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں، پبلک اور پرائیویٹ، اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، جس کو امور سیاست میں دخل نہیں دینا چاہئے، حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے۔

مادی قوت اور اخلاق میں عدم توازن:

اخلاق کے اس انحطاط کے نتیجہ میں یورپ کی سائنٹفک ترقیاں اور اکتشافات عالم انسانیت کے لئے بجائے راحت رساں ہونے کے ہلاکت و بربادی کا ذریعہ ہیں، اس کی وجہ صرف طاقت اور اخلاق کا عدم توازن ہے۔

بدقسمتی سے یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، نشأۃ جدیدہ کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین و اخلاق میں تنزل و انحطاط واقع ہوگیا، کچھ مدت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک نسل پیدا ہوگئی کہ جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے، پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ ”علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی؛ لیکن ہم ان کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں۔“ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۲۶۴)

یورپ کی آج سب سے بڑی کمزوری و بے بسی یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل اور ذرائع کا خزانہ موجود ہے، لیکن نیک خواہشات اور نیک ارادوں کا فقدان ہے، وہ ایک طرف وسائل اور ذرائع میں قارون ہے تو دوسری طرف نیک مقاصد میں محض مفلس اور قلاش! اس نے کائنات کے راز منکشف کئے اور طبعی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، اس نے سمندروں اور فضاؤں پر فرماں روائی حاصل کی؛ لیکن وہ اپنی خواہشات اور نفس پر قابو نہ حاصل کرسکا، اس نے کائنات کے عقدے حل کئے؛ لیکن اپنی زندگی کی پہیلی نہ بوجھ سکا، اس نے منتشر اجزاء اور طبعی طاقتوں میں نظم و ترتیب قائم کی؛ لیکن اپنی زندگی کا انتشار دور نہ کرسکا ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

(مقام انسانیت: ۳۹،۳۸)

اخلاق کے نام پر دجل وفریب:

اخلاق کی بھی اس نے دو قسمیں کر رکھی ہیں، دکھانے کے لئے اور ہیں اور برتنے کے لئے اور، حضرت مولانا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں ،ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز ، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں،لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں، انفرادی زندگی میں ان کا حال یہ ہے کہ اگر نو بج کر بارہ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں ؛لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکہ دینے میں انہیں ذرا تأمل نہیں۔(معرکۂ ایمان و مادیت: ۱۴،۱۵)

غلو اور انتہاء پسندی:

اسلام کے توازن واعتدال کے بالکل برخلاف اس تہذیب کی ایک بنیادی کمزوری اس کی انتہاء پسندی اور غلو ہے۔

حضرت مولانا اس کمزوری کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسراف، مبالغہ آرائی اور انتہاء پسندی اس تہذیب کی علامت اور شعار بن گئی ہے، جس سے وہ اور اس کے پیروکار پہچانے جاتے ہیں، کمانے میں اسراف ،لہو ولعب اور تفریح طبع میں اسراف ،خرچ کرنے میں اسراف ، سیاسی ومعاشی نظریات میں اسراف، جمہوریت ہو تو اس میں غلو، آمریت ہو تو اس میں مبالغہ، اشتراکیت ہو تو اس میں انتہا پسندی ،اپنے خودساختہ

قوانین اور مقرر کردہ اصول اور قدریں ہوں تو اس کی ضرورت سے زائد تقدیس، یہاں تک کہ بال برابر اس سے ہٹنا روا نہیں ہوتا اور اس سے انحراف کرنے والا ایسا مجرم سمجھا جاتا ہے، جس کے بعد وہ کسی عزت واشراف کا مستحق اور کسی احترام کا قابل نہیں رہتا، یا پھر ایسی احمقانہ اور مجنونانہ بغاوت جو عقل، ذوق سلیم اور فطرت انسانی سب کے لئے نا قابل قبول ہے اور جس کے بعد آدمی متمدن انسانوں کی صف سے نکل کر درندوں اور مویشیوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ ایک انتہاء پسندی کے نتیجہ میں دوسری انتہاء پسندی وجود میں آتی ہے، لذتیت، ہوس رانی اور خواہشات کی تکمیل میں انتہاء کو پہنچے تو اس کے رد عمل میں ایک بڑا طبقہ دوسری طرف انتہاء پسندی کا شکار ہوا اور اس نے تعذیب نفس کے لئے عجیب عجیب طریقے اختیار کئے، فرانس کی ظالمانہ وجابرانہ شہنشاہیت اور رہبانیت کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس کے نتیجہ میں کمیونزم وجود میں آیا، جمہوریت واشتراکیت کی انتہاء پسندانہ فکر بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

عقیدۂ آخرت سے عملی انکار اس کے خمیر میں داخل ہے اور مادیت اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور ہر چیز جو اس کی عقل میں نہ سما سکے اس سے انکار اس تہذیب کا امتیاز ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی مادی طاقت، طبعی قوتوں کی تسخیر، کائنات پر اقتدار، کفر اور مادہ پرستی کے ساتھ بالکل گھل مل گیا ہے اور یہ مغربی تہذیب کی مخصوص

علامت اس کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے، ہم کو کسی ایسی تہذیب اور تمدن کا علم نہیں جو اس درجہ مادی قوت رکھنے کے ساتھ مذاہب واخلاق سے اس درجہ برسر جنگ ہو، خالق کائنات اور اس کی بنائی ہوئی شریعت اور دستور وقانون کا اس طرح باغی ومنکر اور مادیت کی پرستش، نفس کی غلامی اور ربوبیت کے دعویٰ میں اس طرح مبتلا ہو جس طرح یہ مغربی تہذیب ہے۔(معرکۂ ایمان ومادیت:۱۱۹)(جدید فلسفہ اور علم الکلام، مؤلفہ اقبال ٹنکاروی)

●●●●●

مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی کی ضرورت

حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے تفصیلی مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اس مسئلے پر بہت کچھ فرمایا، مگر ان کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی، میں اس موقع پر ان کے دو تین ارشادات نقل کرنا چاہوں گا جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی کی ضرورت پر اکابر علماء کے احساسات اور اس کے ارباب اختیار کے ذہنی و فکری جمود کے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔

حضرت تھانویؒ قرآن کریم کی تدریس کے مروجہ طرز پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''قرآن شریف کا طرز عام مصنفین کے طرز پر نہیں ہے بلکہ محاورہ بول چال کا طرز ہے، نہ اس میں اصطلاحی الفاظ کی پابندی، ناواقف لوگ اس کو عام تصانیف کے طریقہ پر منطبق کرنا چاہتے ہیں، اس لیے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو صاحب کشاف نے بھی لکھا ہے، اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ضروری صرف و نحو اور کسی قدر ادب پڑھا کر قرآن شریف کا سادہ پڑھا دینا مناسب ہے؛ کیونکہ کتب درسیہ کی تحصیل کے بعد دماغ میں اصطلاحات رچ جاتی ہیں پھر طالب علم قرآن شریف کو اسی طرز پر منطبق کرنے لگتا ہے، اس طرح قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر پھر فنون ضرور پڑھے؛ کیونکہ بعض مقامات قرآنیہ بغیر فنون کے حل نہیں ہوتے۔''

(کلام الحسن ص: ۳۲)

اسی مسئلہ کو ایک اور انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

''اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں، جیسے بعض متون بغیر شرح کے پڑھائی جاتی ہیں، اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بغیر کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے، یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اول خالی قرآن کریم میں پڑھا دیا جائے پھر اسی قدر جلالین پڑھا دی جائے، اور مدرس اپنی سہولت کے لیے خواہ جلالین اپنے پاس رکھے یا اور کوئی مبسوط تفسیر، تو طلبہ کو پڑھنے میں، اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کر کے حل کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔''

(اصلاح انقلاب ص:۴۷)

جبکہ نصاب میں ضروری اضافوں کے حوالے سے حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ:

''یہ میری بہت پرانی رائے ہے اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہوگئی، اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا، وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے درس میں داخل ہونے چاہئیں، یہ بہت پرانی رائے ہے مگر کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں۔'' (الافاضات الیومیہ، جلد ششم، ص:۴۳۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ان ارشادات کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام اور طرز تدریس دونوں میں تبدیلی اور وقت کی ضروریات کو ان میں سمونے کی ضرورت کا احساس بہت پرانا ہے اور اس کا اظہار

بڑے بڑے اکابر نے کیا ہے لیکن دوسری طرف مدارس کے ارباب حل وعقد کے جمود کی بھی داد دیجیے کہ حضرت تھانویؒ جیسے بزرگ کو بھی اس حسرت کے ساتھ سپر انداز ہونا پڑا ہے کہ ''کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں''۔

ہمارے دور میں اس مسئلہ پر سب سے زیادہ بحث حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز نے کی ہے اور درجنوں مضامین و مقالات میں انہوں نے نصاب تعلیم اور طرز تدریس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ نصاب میں تین طرح کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے:

(۱) تخفیف: یعنی بھاری بھرکم نصاب کو کچھ ہلکا کیا جائے اور ایک ہی فن میں درجنوں کتابیں الگ الگ پڑھانے کے بجائے تین چار اہم اور زیادہ مفید کتابوں کی تعلیم دی جائے۔

(۲) تیسیر: یعنی مشکل پسندی کا طریقہ ترک کر کے غیر متعلقہ مباحث میں طلبہ کے ذہنوں کو الجھانے کے بجائے نفس کتاب اور نفس مضمون کی تفہیم کو ترجیح دی جائے۔

(۳) اثبات وترمیم: یعنی غیر ضروری فنون کو حذف کر کے جدید اور مفید علوم کو شامل کیا جائے۔

حضرت بنوریؒ نے اس سلسلہ میں جن نئے علوم کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، ان میں (۱) تاریخ اسلام، (۲) سیرت النبیؐ، (۳) جدید عربی ادب وانشاء، (۴) جدید علم کلام، (۵) ریاضی اور (۶) معاشیات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

عربی مدارس کے لئے نصاب تعلیم اور طریق کار

حضرت علامہ بنوریؒ اپنے ایک مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:

تجویز نصاب کا مسئلہ بے حد اہم ہے، وقت کا صحیح تقاضا ہے اور اہم ضرورت ہے، اور

جیسے کچھ ہو سکے کوشش کر کے طے کرنے کی ضرورت ہے، اتفاق سمجھیں، عرصہ سے اس کا احساس ہے، اور شغف رہا ہے؛ لیکن اس کی ضرورت ہے کہ سنجیدہ دماغ اور مخلص حضرات، تجربہ کار اصحاب جمع ہو کر کوئی خاکہ تیار کریں، انفرادی کوشش نہ تو مفید ہوسکتی ہے نہ مؤثر، نہ امت کے لئے قابل قبول، نصاب کے بارے میں تو میں بعد میں عرض کروں گا، اور شاید اس مراسلہ میں اس کی نوبت نہ آئے گی ،لیکن میرے خیال میں نصاب میں اہم چند باتیں ہوں تو تعیین نصاب کے لئے اصول موضوعہ کا کام دیتی ہیں، چند چیزیں اصل نصاب کے اصلاح سے زیادہ قابل توجہ ہیں:

(۱) نصاب کوئی بھی ہو،لیکن اساتذہ کے انتخاب میں زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(الف) مفوضہ کتابوں کی تدریس میں اعلی درجہ کی مہارت رکھتے ہوں،جس کا حال یہ ہے کہ استعداد بہت اعلیٰ ہو۔

(ب) مخلص ہوں اور دل سے چاہیں کہ طلبہ کو علم آجائے۔

(ج) جن علوم کو پڑھاتے ہوں ان سے شغف اور طبعی مناسبت ہو،غرض یہ کہ محض وقت گذارنا یا معاش کی ضرورت کا پورا کرنا نہ ہو، استعداد، اخلاص،شوق ومناسبت، یہ تین باتیں مدرسین کے لئے معیار انتخاب ہوں۔

(۲) طلبہ کے لئے آسائشیں اور راحت کا پورا خیال رکھا جائے، اگر مدرسہ میں سو طلبہ کے لئے وسعت نہ ہو، بیس رکھے جائیں ؛لیکن ان کی علمی نگرانی بہت سخت کی جائے، درسوں میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحانات میں انتہائی سختی ،کوئی تسامح نہ کیا جائے ،مثلاً اگر سہ ماہی میں فیل ہو گیا تو ششماہی کے لئے متنبہ کیا جائے کہ اگر ششماہی میں فیل ہو گیا تو سالانہ امتحان میں نہ لیا جائے گا،اس میں کوئی مراعات ہرگز نہ کی جائیں،اور بھی مراعات سم قاتل ہیں۔

(۳) اساتذہ کو کتابیں پڑھانے کے لئے اتنی دی جائیں کہ وہ آسانی سے اس کا مطالعہ کرسکیں اور اس کے متعلقات دیکھ سکیں اور ان کو صرف اس کتاب کے حواشی وشروح پر کفایت نہ کرنی چاہئے؛ بلکہ فن کی اعلیٰ کتابیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

(۴) ہر درجہ کے مناسب طلبہ کو مطالعہ کے لئے کتابیں دینی چاہئے اور ان میں امتحان ضروری ہو، یعنی بغیر تدریس صرف مطالعہ سے وہ (اس کی معلومات) حاصل کرلیں اور امتحان دیں۔

(۵) طلبہ کی اخلاقی نگرانی کی بہت شدید ضرورت ہے، اسلامی حلیہ، دینی وضع میں کوئی مسامحت برداشت نہیں کی جاسکتی، بلکہ غبی محنتی کو برداشت کیا جائے اور ذکی سست آزاد کو نہ رکھا جائے، بلکہ مدرسہ میں قواعد وضوابط ایسے ہوں کہ نماز کی پابندی اور لباس وپوشاک میں علمی وضع کی حفاظت ملحوظ رہے۔

(۶) مسابقت کے امتحانات مقرر ہوں اور انعامات دیئے جائیں، اعلیٰ کامیابی پر سہ ماہی اور ششماہی وظیفہ دینا چاہئے۔

(۷) ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا محض عام استعداد اور قابلیت کا رکھنا چاہئے، جس کا کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو، ہاں اس درجہ کی اہلیت ضروری ہے۔

(۸) عربی بولنے کی قابلیت مقاصد میں شامل کرنی چاہئے، تین سال کے بعد تدریس کی زبان عربی ہونی چاہئے۔

(۹) عربی ادب پر خاص معیار سے توجہ دینی ہوگی، تقریر وتحریر کی تربیت دی جائے اور اس کے لئے بہت تفصیل طلب اہم تنبیہات کی حاجت ہے جو بعد میں عرض کروں گا۔

(۱۰) ہر زمانہ کا ایک فن ہوتا ہے، اِس زمانہ کا فن مخصوص تاریخ وادب ہے، اس پر توجہ زیادہ کرنی ہوگی۔

(۱۱) قرآن کریم کا ترجمہ ابتداء سے شروع کرنا چاہئے، اور تین چار سال میں ختم کرنا چاہئے، بغیر کسی تفسیر محض ترجمہ ابتداء میں زیر درس ہونا چاہئے، عربی قابلیت بڑھانے کے لئے مخصوص اجزاء وسور کا انتخاب کرنا چاہئے، اور لغوی وادبی تحقیق کے ساتھ پڑھانا چاہئے۔

(۱۲) طلبہ کے لئے دار المطالعہ مخصوص ہو، ان کے لئے مفید کتابیں اور عربی مجلّات و جرائد رکھنے چاہئے۔

(۱۳) مدرسہ کے سالانہ بجٹ میں ایک رقم مستقل بسلسلۂ اصلاح نصاب اور تبدیلی کتب علاحدہ کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ نصاب کے مشکلات میں سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ہمارے غریب مدارس کے لئے قلت سرمایہ کا ہے۔

(۱۴) تین نصابوں کی ضرورت ہے:

(الف) ایک سہ سالہ نصاب جس میں فقہ، قرآن، حدیث، تاریخ، صرف، نحو، معانی، ادب، عقائد، فرائض ہوں، ایک شخص جو صرف اپنی ضرورت کے لئے عالم بننا چاہتا ہے وہ حاصل کر سکے، علم ودرس کا پیشہ نہیں بنا سکتا ہے، بلکہ تجارت وغیرہ سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

(ب) مدرس وعالم بننے کے لئے نصاب زیادہ سے زیادہ ہشت سال۔

(ج) تیسرا نصاب درجۂ تکمیل کا ہو، ایک سال کا اور دو سال کا، مفتی بننا، محدث بننا، ادیب ومؤرخ بننا، مبلغ بننا وغیرہ اس قسم کے چند شعبے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ نصاب کوئی بھی ہو، لیکن اگر ان امور کی رعایت کی جائے، تو ان شاء اللہ اچھے عالم نکل سکیں گے، طلبہ میں تکثیر سواد کی کوشش نہ کرنی چاہئے، بلکہ معیار انتخاب کے متعلق کوشش کرنی چاہئے، یہ چاہے جتنی بھی کم ملیں، ذہین ذکی اور مستعد طلبہ کے لئے مختلف ترغیب کی وجوہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا، مثلاً خصوصی وظیفہ درجۂ تکمیل پہنچانے کی ترغیب دینا؛ بلکہ

درجۂ تکمیل میں با قاعدہ ایسا وظیفہ دیا جائے جو ضروریات زندگی کے لئے کفایت کرے۔

ایک اہم بات جو سلسلہ تعلیم میں ضروری ہے اسے لکھنا بھول گیا ہوں، وہ یہ کہ ابتدائی کتابیں قابل اساتذہ کے پاس ہوں، مثلاً ہر بڑے مدرس کو ایک چھوٹی کتاب دی جائے، اس میں طرفین کے لئے فائدہ ہے، طلبہ کو مجرب استاذ سے استفادہ کا موقع ملا اور مدرس کا کام ہلکا کیا گیا، بجائے ایک بڑی کتاب کے چھوٹی کتاب دی گئی، جس میں اسے زیادہ دماغ پاشی نہیں کرنی پڑے گی، اور جب مدرس مخلص ہوگا تو یہ سوال پیدا نہیں ہوسکتا کہ بڑی کتابوں کو پڑھانے والا چھوٹی کتاب کو پڑھانا اپنی توہین سمجھے گا۔

نصاب کے بارے میں ایک چیز قابل گذارش ہے کہ موجودہ نصاب میں سوائے چند کتابوں کے کوئی ایسی کتاب نہیں جس سے عربی قدماء کی تالیفات اس سے بہتر نہ مل سکیں، نصاب کی ترمیم میں یہ بات پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے کہ کتابیں ایسی داخل درس ہوں کہ کتاب کی لفظی بحثیں کم ہوں، اور مصنف کے الفاظ کے مطالب بیان کرنے میں وقت زیادہ صرف نہ ہو، مثلاً اگر اختصار شدید سے کاغذ کم خرچ کیا گیا لیکن تفہیم میں دماغ اور وقت زیادہ خرچ کیا گیا، وقت اگر حفظ مسائل پر زیادہ خرچ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا؛ بلکہ بصیرت مختصرات کے ہونے سے کبھی حاصل نہیں ہوتی، زیادہ تر کوشش اس کی ہو کہ تفہیم مقاصد میں، وسائل میں پورا انشراح حاصل ہو، اگرچہ جزئیات کا استیعاب نہ ہو سکے، بعض عنوان درسیہ میں اگرچہ استفسار مسائل زیادہ ہے؛ لیکن پہلا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، اور وہ زیادہ ضروری ہے۔

رہا معاشیات واقتصادیات اور سیاسیات کا داخل نصاب ہونا تو یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں، امت کو اس کی اتنی ضرورت نہیں، اس کے لئے بہت مل جاتے ہیں، مشکل تو رسوخ فی العلم ہے، ہمیں صحیح علم راسخ العلم مخلص وذکی علماء تیار کرنا ہے، یہ چیزیں مطالعہ کی ہیں، بآسانی بعد

الفراغ حاصل کی جاسکتی ہیں۔(مدارس کا نصاب خوب سے خوب تر کی تلاش:۱۷)

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی بحث کی ہے اورانہوں نے ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کولکھنؤ میں عربی مدارس کے نصاب کے بارے میں ایک کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جوخطبہ ارشادفرمایا، وہ ہمارے نصاب ونظام پرایک جامع اور مکمل تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہےاوراس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کواس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہئے۔

حضرت مدنیؒ کا ۱۹۳۳ء میں مرتب کردہ جدید وقدیم علوم وفنون کا حسین مجموعہ

حضرت مدنیؒ نے ایک نصاب بنگال وآسام کے مدارس کے لئے تیار کیا تھا اور وہ ''نصاب مدنی'' کے عنوان سے میرے پاس موجود ہیں، حضرت مدنیؒ نے بہت تفصیل سے اس نصاب کوتحریرفرمایاہے۔اس کے مقدمہ میں حضرت لکھتے ہیں:

مذہبی حیثیت بھی مثل معاشی ضرورتوں کے تقاضا کرتی ہے کہ اقوام عالم کی زبان اوران کے رسم وراوج،ان کے علوم وفنون وغیرہ سے واقفیت حاصل ہوجائے۔

مذکورہ بالا اموراوراس قسم کے مختلف اورمتعدد وقایع (واقعات) عرصہ دراز سے مجھ کو پریشان کررہے تھے کہ موجودہ اوررائجہ نصاب زمانہ حال میں قابل اصلاح وترمیم ضرور ہے،مگرزمانہ نے مجھ کواب تک مہلت نہ دی۔

میں نے ایام تعلم واستفادہ میں دیوبند کا نصام تعلیم (جس کا بڑا حصہ درس نظامی کا خوشہ چین ہے) اپنے لئے معراج ترقی اورمسلم زندگی قرار دیااورحسب استعداد وقابلیت بڑے درجہ تک اس سے فیض یاب ہوا،مگر مدینہ منورہ میں مجھ کوجامعہ ازہر(مصر)اوراستنبول بخارا وغیرہ کے نصابوں سے سابقہ پڑا،پھرزندگی کے مختلف شعبوں پرغوروخوض کرنے کی نوبت بھی آئی،مختلف ممالک اورمتعدد حکومتوں کے احوال نظر سے گزرے،اسکولوں اور کالجوں کے

نصابوں پر بھی بڑے درجے تک عبور پہلے سے حاصل تھا، زمانہ حال ہی مختلف اسلامی یونیورسیٹیوں (جامعہ عثمانیہ دکن، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی، ندوۃ العلماء وغیرہ) کو بھی زیر نظر لانے کی نوبت آئی، حتی الوسع احباب واکابر اصحاب الرائے اور ارباب تجربہ سے مشوروں کی نوبت بھی بارہا آئی، بالآخر یہ موجودہ نصاب انتخاب اور غور وتدبر کے بعد قوم کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی حالت پر پوری روشنی ڈالنا اور مکمل اصلاح وترمیم مجھ جیسے ناواقف اور کم مایہ طالب علم کا کام نہیں، مگر جبکہ اکابر قوم کو اس طرف کما حقہ توجہ نہیں تو پھر کم مایہ ہی اشخاص کو قدم بڑھانا پڑتا ہے، ملک میں مختلف جماعتیں موجود ہیں، جنہوں نے بعض امور کو اپنا مطمح نظر بنا کر دوسرے ضروری مقاصد کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے، مگر اس نصاب میں اپنی فہم وتجربہ کی بنا پر صحیح راستہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ مسلمانوں کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے بام ترقی پر پہنچانے والا ہے، اگرچہ نصاب سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ طلبہ کو حافظ فنون وعلوم بنایا جائے؛ بلکہ ایک ایسی استعداد اور قابلیت پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے جس سے وہ جملہ ضروری فنون میں پوری قوت پیدا کرلیں؛ تاکہ ضرورت یا تکمیل کے وقت ان کو کوئی نقصان سدراہ نہ ہوسکے، مگر تاہم ان کو بہت سے فنون اور بہت سی اہم تر کتابوں اور اعمال سے دوچار ہونا ضروری ہے؛ تاکہ یہ ملکہ راسخہ حاصل ہو۔

میں ابھی تک محسوس کررہا ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تصنیف وتالیف غیر مکمل ہے اور موجودہ کتابیں ہماری ضرورتوں کے لئے ایک درجہ تک ہماری زبان میں ناکافی ہے، مگر تاہم ان شاء اللہ اگر اکابر قوم نے پسند فرمایا اور رائج کیا تو مجھ کو قوی امید ہے کہ ہمارے قوم وملک میں اچھے اچھے اشخاص پیدا ہوسکیں۔

اصول وقوانین کلیہ:

چونکہ یہ نصاب صوبہ بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے لیے ہے، اس لیے اس میں بنگلہ زبان کی تحریری اور تقریری ترقی کو خاص اہمیت دی گئی ہے، دوسرے صوبہ والے بجائے بنگلہ اپنے صوبہ کی اس زبان کو جو سوائے اردو کے اپنی استقلالی شان رکھتی ہو، قائم کریں۔

نصاب میں علوم دینیہ اور فنون عربیہ کو نہایت زیادہ توجہ قرار دیا گیا ہے اور حتی الوسع عربی قدیم تعلیم اور اس کی کتابوں اور فنون کو اس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے جس طرح پہلے سے چلی آتی ہے، اس لیے یہ کوئی نئی اسکیم نہیں ہے؛ بلکہ وہی پرانی (اولڈ) اسکیم ہے، ہاں پرانی (اولڈ) اسکیم میں جن فنون اور جن کتابوں کی کمی تھی اور زمانہ موجودہ میں ان کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، ان کو بھی نہایت تھوڑے تغیر سے داخل کر دیا گیا۔

اس نصاب کے تین حصے کر دیے گئے ہیں، جن کے لیے مجموعی حیثیت سے سولہ برس کی مدت ضروری خیال کی گئی ہے، اول مکتب (مدرسہ ابتدائیہ)، دوم مدرسہ ثانویہ (جونیئر)، سوم مدرسہ عالیہ (سنیئر)۔

موجودہ نظام تعلیم جو کہ تمام بنگال و آسام میں رائج ہے، علم حدیث وتفسیر کو ضروری اور تعلیم اسلامی کا عضو رئیس نہیں سمجھتا، ورنہ اس فن کی تکمیل میں داخل نہ کرتا حالانکہ یہ علوم نہایت ضروری اور اہم بلکہ مقاصد ذاتیہ میں سے ہیں۔ دوسرے فنون فقط آلات اور خدمت گزار ہیں، درس نظامی میں بھی بہت سے علوم کو ضرورت وقت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو کہ تضییع عمر کی باعث اور خسارہ دین و دنیا کا سبب ہے اور بہت سے ضروی فنون و کتب سے چشم پوشی بھی گوارا کرنے کی بدنمائی اس میں موجود ہے، اس لیے حدیث اور تفسیر وغیرہ کو اسی درجہ میں داخل کیا گیا ہے۔

اس نصاب کا ہر درجہ تقریباً مستقل اور اپنی اپنی اغراض ومقاصد میں دوسرے حصوں سے مستغنی ہے، اس لیے مکتب (درجہ ابتدائیہ) سے فارغ ہوکر بچے اگر تعلیم سے علیحدہ ہو جائیں یا اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوجائیں تو ان کو مکتب کے مقاصد میں کوئی نقصان سدراہ نہ ہوگا اور علیٰ ہذا القیاس درجہ ثانویہ اور عالیہ ہر ایک مستقل طور پر فیض رساں ہیں۔

اس نصاب میں پانچ زبانوں کی تعلیم کا لحاظ رکھا گیا ہے، بنگلہ (صوبہ کی زبان) اردو، فارسی، انگریزی، عربی، مگر اول الذکر (بنگلہ) کو بوجہ صوبہ کی زبان ہونے کے اور آخر الذکر (عربی) کو بوجہ مذہبی اور علمی زبان ہونے کے زیادہ تر اہمیت دی گئی ہے، باقی ماندہ السنۂ ثلاثہ (اردو، فارسی، انگریزی) کو بقدر ضرورت لازم قرار دیا گیا ہے، البتہ اردو زبان چونکہ ہندوستان میں مسلمانون کی مشترکہ زبان ہے اور علمی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل کرچکی ہے، اس لیے اس کا مرتبہ نسبت باقی ماندہ ہر دو زبانوں (فارسی، انگریزی) کے اعلیٰ رکھا گیا ہے، پھر انگریزی چونکہ حکومت کی زبان ہے، اور بہت سے دنیاوی ان کاروبار کا جن سے کوئی شخص تا زیست مستغنی نہیں ہوسکتا اس سے تعلق ہے، اس لیے اس کو فارسی زبان پر فوقیت دی گئی ہے۔

* اس نصاب میں قرآن شریف سے قوی تعلق پیدا کرنے کی زیادہ تر کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ طلبہ کا کوئی زمانہ قرآن شریف سے اجنبیت نہ رکھے اور یہ امر نہایت قوی ذریعہ ان کو معانی قرآن اور تفسیر کے سمجھنے اور اس کے رنگ سے قلوب کو رنگین کرنے کے لیے ہوسکے، افسوس ہے کہ رائج الوقت نصاب میں اس کی طرف سے بہت زیادہ بے توجہی برتی گئی، جس کا بدنما نتیجہ مخفی نہیں ہے۔

* اس نصاب میں علم تاریخ، ادب عربی، علم حدیث کو بھی بہ نسبت دیگر فنون کے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی وجہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں۔

طلبہ کو واقعات زمانہ اور اخبار پر مطلع ہونا، اخبار بینی سے دلچسپی پیدا کرنا، مضامین لکھنے اور ان کی اشاعت وغیرہ کی مہارت حاصل کرنا، ابنائے زمانہ کی آراء اور ان کی ذہنیتوں کا احاطہ کرنا وغیرہ وغیرہ چونکہ نہایت ضروری امور ہیں، اس لیے ہر مدرسہ میں دارالمطالعہ ہونا ضروری ہے، جس میں ہر قسم کے اخبار اور ماہواری رسائل وغیرہ موجود رہا کریں، اور وقت معین پر طلبہ جا کر چپ چاپ بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا کریں۔

* دارالمطالعہ کے لیے روزانہ ہر طالب علم (درجہ عالیہ وسافلہ) آدھ گھنٹہ صرف کیا کرے، جس میں پاؤ گھنٹہ اوقات نظام سے ہوگا اور پاؤ گھنٹہ اوقات تعطیل نماز میں سے۔

* درجہ ثانویہ اور عالیہ کے طلبہ کے لیے لازم ہوگا کہ مذکورہ ذیل دستکاریوں میں سے ایک یا چند دستکاری سیکھیں، جس کے تعین میں ان کو اختیار ہوگا: چرغہ چلانا اور کپڑا بننا، حدادی (لوہے کا کام)، نجاری (بڑھئی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا) گھڑی سازی، جلد سازی، چمڑا رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا، صیاغت (سونا کا کام) وغیرو غیرہ۔

* اس نصاب میں انگریزی زبان کو صرف اس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جس سے ضروری کاروبار انجام پاسکیں۔

* اس نصاب میں فنون کو حتی الوسع ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے؛ البتہ عربی علوم وفنون کو مختلف مصالح کی بنا پر عربی زبان میں ہی تعلیم دینا ضروری خیال کیا گیا ہے۔

* عربی زبان کے سوا اور دوسری زبانیں محض بہ حیثیت زبان تعلیم دی جائیں گی۔

* عالیہ اور سافلہ میں کچھ ایسی آسان کتابیں رکھی گئی ہیں جو کہ درسیات میں شمار نہ ہوں گی، مگر طلبہ ان کا مطالعہ کر کے مضامین کے یاد کرنے کے مکلف ہوں گے اور امتحان میں ان کا پورا لحاظ کیا جائے گا، ایسی کتابوں کو خانۂ درسیات کے آخر میں بین القوسین ذکر کیا گیا ہے۔

* عالیہ اور سافلہ کے درجات میں حسب حیثیت مذکورہ نصاب تحریر اور تقریر کی مشق کرنی لازم ہوگی۔

* ہر زبان کی تعلیم کے ساتھ اس کے املاء اور کتابت کا درست کرانا ضروری ہوگا اور ہر زبان کی خوش نویسی کا امتحان مستقل علیحدہ ہوگا۔

* روزانہ عالیہ اور سافلہ کے طلبہ کو ضروری ہوگا کہ وہ جسمانی ان فنون و اعمال کی عصر کے بعد مشق کیا کریں، جن سے صحت جسمانی پر نہایت مفید اثرات پڑیں اور فن سپہ گری بھی ہاتھ آئے، جیسے پٹہ، گدکا، لکڑی، بنوٹ اور تلوار وغیرہ۔

* طلبہ کی حاضری اور ان کے اخلاق کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے گا اور ہر دو امر کے متعلق مدرسین اور منتظمین کی شہادت پر ان کو خاص نمبر اور انعام سالانہ دیا جائے گا۔

* اس نصاب کے بعد تکمیل کے درجات ہوں گے، جن میں مختلف شعبوں اور زبانوں کی تکمیل کا لحاظ رکھا جائے گا، مثلاً شعبہ تبلیغ، شعبہ تعلیم (ٹریننگ) وغیرہ۔ انہیں درجات تکمیل میں فتاویٰ، ادبیات عربیہ، ادبیات بنگلہ، ادبیات اردو، ادبیات فارسی، ادبیات انگریزی، الجبرا، ہندسہ وریاضی (جیومیٹری) علم طب، علم قراءت، فلسفہ قدیم وجدید، منطق، تفسیر وغیرہ کی تکمیل کا لحاظ کیا جائے گا، مگر ان کی تفصیل اس نصاب میں بالفعل نہیں کی گئی، آئندہ اس کے جاری اور منظم ہوجانے پر اس کی بھی اسکیم تیار کی جائے گی۔

* ہر تین برس میں اس نصاب پر غور کرنا ہوگا اور حسب ضرورت واقتضاء وقت وتجربہ ضروری اصلاحات اور ترمیمات عمل میں لانا ہوگا۔

* اس نصاب میں اندازہ کیا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً ساڑھے سات مہینہ تعلیم میں خرچ ہوں گے، یعنی سالانہ تعطیل اور ہفتہ وار تعطیل اور ایام امتحان کو منہا کرنے کے بعد

جوزمانہ بچتا ہے، وہ تعلیم کا خاص زمانہ ہے۔

نصاب ونظام کے متعلق تجاویز:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ''ہمارا تعلیمی نظام'' میں بہت بہترین اور معتدل تجاویز پیش فرماتے ہیں:

برصغیر کے دینی مدارس کے سب سے قیمتی، سب سے گرانقدر اور سب سے اہم پونجی ان کا وہ مزاج ومذاق ہے، جو انہیں اپنے اللہ والے اکابر سے ورثے میں ملا ہے، آج ہمارے دینی مدارس بنیادی طور پر دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چین اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کے خواہش مند ہیں، اور دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت، جو اسے دنیا کے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے؛ وہ اس کے اکابر کے مزاج ومذاق ہے، جس میں علم کے رسوخ، مطالعے کی وسعت اور استعداد کی پختگی کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اپنی زندگی، اپنے ذہن وفکر اور اپنے جذبات وخیالات غرض ہر چیز میں سنت کے اتباع، سلف صالحین کی پیروی، اللہ تعالیٰ سے رجوع، اس کی طرف انابت اور اس کی رضا جوئی کی فکر ان کو حاصل تھی۔

دنیا میں مختلف علوم وفنون پر داد تحقیق دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، اور نرے ''علم'' کی حد تک تحقیق وتدقیق کے شناور دوسری معاصر درسگاہوں میں بھی بہت ہوئے ہیں؛ لیکن دارالعلوم دیوبند کے نیو ہی علم وعمل کے سنگھم پر اٹھائی گئی تھی، اور اس میں جس قدر توجہ طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی، اس سے زیادہ ان کی عملی تربیت اور ان پر ہر ادا میں اسلاف کا رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، وہاں دلوں میں خوف وخشیت کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال وحرام؛ بلکہ مکروہ ومستحب اور اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا صرف علم نہیں؛ بلکہ ان کی عملی فکر اور ان کی اہمیت دلوں میں

جا گزیں کی جاتی تھی، وہاں عبادات و اطاعات کے علاوہ معاشرت، معاملات اور اخلاق کو سنت کے مطابق ڈھالا جاتا تھا، وہاں ایثار، تواضع، تحمل، بردباری، سادگی، اخلاص اور للّٰہیت کے ملکات پیدا کئے جاتے تھے، وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھادی جاتی تھی کہ علم برائے علم اس کا مطمح نظر نہیں، اور نہ تحصیل علم کا مقصد مال و جاہ کا حصول ہے؛ بلکہ اصل مقصد اپنے آپ کو اعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اور اس کے بعد انہی اوصاف کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔ (ہمارا تعلیمی نظام: ص: ۹۲-۹۳)

لہٰذا مدارس کے نصاب و نظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اس کی روح کے احیاء کی فکر کی جائے، اس روح کی احیاء کا تعلق اصل میں تو اہل مدارس کی قلبی لگن سے ہے؛ لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:

(۱) تمام مدارس میں تصوف و احسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

(۲) اساتذہ و طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگان دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات و ملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں، اس میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی ارواح ثلاثہ، تذکرۃ الرشید، سوانح قاسمی، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہند، اشرف السوانح اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی آپ بیتی کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

(۳) ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لئے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے، اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں اس کے اس پہلو کو بطور خاص نظر میں رکھا جائے۔

(۴) جس مدرسے سے قریب کوئی صاحب بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور

طلبہ ان کی صحبت و خدمت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں، اور کبھی کبھی مدرسے میں ان کے اجتماعی وعظ و نصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ اس قسم کے اقدامات سے مدارس کی فضا بہتر ہوگی، اور ہم اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جارہے ہیں، اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی۔

دوسرا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے، دینی مدارس میں اس وقت جو نصاب رائج ہے وہ بنیادی طور پر درس نظامی کا نصاب ہے، یہ نصاب ایک عالم دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا، اور اس میں ہر علم وفن کے اندر ایسی کتابیں تجویز کی گئی تھیں جو سطحی اور سرسری معلومات کی بجائے اس علم وفن میں مستحکم اور ٹھوس استعداد پیدا کریں اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک اس بنیادی ڈھانچے میں بہت زیادہ انقلابی تبدیلیوں کی اب بھی ضرورت نہیں، البتہ قویٰ کے انحطاط اور وقت کی علمی و دینی ضروریات کے پیش نظر مختلف حیثیتوں سے نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں جو خلا محسوس ہوتا ہے، یا اس میں جو نقائص پیدا ہوگئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

دینی مدارس کو عربی زبان سے جو خصوصی تعلق ہے وہ محتاج بیان نہیں، عربی زبان تمام دینی علوم کے لئے بنیادی زینے کی حیثیت رکھتی ہے؛ لیکن ہمارے مدارس میں عربیت کا ذوق اور عربی تحریر وتقریر کا ملکہ افسوسناک حد تک نایاب ہے، اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ عربی کتابیں سمجھنے کی صلاحیت تو پیدا کر لیتے ہیں؛ لیکن عربی تحریر وتقریر کی مشق سے - الا ماشاء اللہ - بالکل عاری ہوتے ہیں، اکثر متوسط درجے کے طلباء کی بھی عبارت خوانی تک درست نہیں ہوتی اور عربی میں مضمون نگاری، تصنیف وتالیف یا تقریر و خطابت تو اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کے لئے بھی کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس میں عربی پڑھانے کا اصل مقصد کتاب وسنت اور ان کے علوم کے اصل ماخذ تک رسائی ہے، جس کے لیے تحریر وتقریر کا ملکہ ناگزیر نہیں؛ لیکن اول تو اب مشاہدہ یہ ہے کہ تحریر وتقریر کی مشق کے فقدان کا اثر عبارت خوانی اور عبارت فہمی پر بھی پڑ رہا ہے، دوسرے عربی تحریر وتقریر کی مشق اگر مقصود نہ ہو تو کم از کم اس کے محمود میں تو کوئی شبہ نہیں اور صرف ونحو اور بلاغت وادب کی اعلیٰ کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی اگر یہ وصف محمود حاصل نہ ہو تو یہ کوتاہی کچھ کم نہیں ہے۔ تیسرے عالم اسلام کے باہم مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ اب اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے مدارس سے عربی تحریر وتقریر کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے افراد پیدا ہوں، جو عالم عرب سے روابط رکھ سکیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان، پاکستان کے علماء نے جو عظیم الشان علمی اور دینی ذخیرہ اردو یا فارسی زبان میں چھوڑا ہے، اس سے عالم عرب کو روشناس کرا سکیں اور یہ مقصد عربی تحریر وتقریر کے اعلیٰ ملکے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس وقت ہمارے نظام تعلیم میں عربی صرف ونحو، ادب اور بلاغت کی تدریس پر ایک معتدبہ وقت صرف ہوتا ہے؛ لیکن یہ سارے علوم خالص نظریاتی انداز سے پڑھائے جاتے ہیں، اور ان کی اعلیٰ تربیت اور مشق کا کوئی اہتمام باقی نہیں رہا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایک طالب علم نحو وصرف کے قواعد ان کے خود ساختہ فلسفہ اور اس پر وارد ہونے والے اعتراضات و جوابات کی بحثیں تو شرح جامی، عبدالغفور اور عصام وغیرہ کی مدد سے یاد کر لیتا ہے؛ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ وہ چند سطریں عربی زبان میں لکھ دے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ اس کے لئے سخت دشوار ہوتی ہے؛ بلکہ بسا اوقات انہی قواعد کے اطلاق میں غلطیاں کرتا ہے جن کا پورا فلسفہ اسے ازبر ہے، اور اگر کوئی شخص نحو وصرف کی غلطیوں سے محفوظ رہ جائے تو

اسلوب اور انشاء کی غلطیاں تو لازماً ہوتی ہی ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں عربیت کی تصحیح وتحسین کی طرف پوری توجہ دی جائے اور مدرسے کی پوری فضا ایسی بنائی جائے جس میں عربیت رچی بسی ہوئی ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز بطور خاص قابل ذکر ہیں:

(الف) ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف ونحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشیں کرایا گیا ہو، اور پھر تمرینات کے ذریعے طلباء کو ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئی ہیں، مثلاً نحو صرف کے ابتدائی اور متوسط درجات کے لئے ''النحو الواضح'' اور اعلیٰ درجات کے لئے ''النحو الوافی'' وغیرہ، ان کی کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(ب) ادب کی تعلیم میں انشاء کے لئے مستقل وقت رکھ کر اس کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے، اس غرض کے لئے بھی اس وقت بہت سی کتابیں دستیاب ہیں، مثلاً ''الاسلوب الصحیح للانشاء'' ''معلم الانشاء'' وغیرہ، ان سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ''بلاغت'' کی تعلیم کے لئے ہمارے نصاب میں مختصر المعانی بالکل ناکافی ہے، اور اس سے ''بلاغت کا'' کا اصل مقصد بالکل حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے بجائے یا اس کے ساتھ ''دروس البلاغۃ'' یا ''البلاغۃ الواضحۃ'' اس طرح پڑھانے کی ضرورت ہے کہ اس سے بلاغت کا اصل مقصد حاصل ہوسکے۔

(ج) لیکن عربیت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت جس

بات کو حاصل ہے وہ مدرسے کی مجموعی فضا میں عربیت کا چلن ہے، اس غرض کے لئے ہماری رائے میں تو درجہ رابعہ سے اوپر کے تمام اسباق عربی زبان میں ہونے چاہئے؛ لیکن اگر یکا یک یہ تبدیلی مشکل ہو تو کم از کم مدرسے کے تمام اعلانات، دفتری اندراجات، تمام دفتری کارروائی، امتحانات کے پرچے اور ان کے نتائج وغیرہ فوری طور پر عربی میں منتقل کرنے چاہئے، اور رفتہ رفتہ مدارس کے ماحول کو اس سطح پر لانا چاہئے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مکمل طور پر عربی زبان بن جائے۔

(د) اساتذہ اور منتظمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وہ آپس میں نیز طلباء سے صرف عربی میں گفتگو کریں گے، تو بہت جلد عربیت کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوسکتا ہے، عادت نہ ہونے کی بنا پر شروع میں شاید دشواری پیش آئے؛ لیکن اگر اس دشواری پر اہتمام کے ساتھ قابو پالیا گیا تو ان شاء اللہ نتائج حاصل ہوں گے۔

(ہ) مہینے دو مہینے میں طلباء کے ایسے اجتماعات منعقد کرنے چاہئے جن میں طلبہ عربی میں تقریر کریں اور مقالے پڑھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں طریق کار شروع سے یہ تھا کہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اور عربی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طالب علم کو ایک پانچ سالہ نصاب سے گزارا جاتا تھا، ''درجہ فارسی و ریاضی'' کے نام سے موسوم تھا، اس درجے میں اردو، فارسی، دینیات، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اس قدر معیاری تعلیم دی جاتی تھی کہ ان مضامین میں ایک عالم دین کو جتنی واقفیت ضروری ہے؛ ایک طرف وہ تمام تر حاصل ہوجاتی تھی اور دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس درجے پر اپنی تعلیم ختم کرنے پر مجبور ہوجائے تو وہ دین ودنیا کی اتنی بنیادی معلومات حاصل کر چکا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اچھی

زندگی گذار سکے۔

یہ درجہ عربی اور اسلامی علوم کے لئے ایک بہترین بنیاد کا کام دیتا تھا اور جب طالب علم اس درجے سے فارغ ہوکر عربی اور اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو وہ اردو اور فارسی میں تحریر و انشاء کی اچھی صلاحیت کا حامل ہوتا تھا جو اس کو عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں بہت مدد فراہم کرتی تھی۔

یہ درجہ موجودہ دینی مدارس میں عرصے سے یا تو ختم ہو چکا ہے یا اس نے گھٹتے گھٹتے ایک سال کے درجہ اعدادیہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم جب عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کرتا ہے تو عام طور سے اس کی تحریر خراب، املاء اور انشاء ناقص اور بنیادی معلومات کمزور ہوتی ہیں، اس میں عربی صرف ونحو، ادب اور فقہ وغیرہ کے اہم مضامین کو کما حقہ سمجھنے اور انہیں اچھی طرح ہضم کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی اور یہ مضامین اسے دشوار معلوم ہوتے ہیں، اور جب بنیاد کمزور ہو جائے تو اس کمزوری کا اثر اگلے درجات تک پڑتا ہے۔

لہٰذا یہ بات ہماری نظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق درجہ اعدادیہ کی مدت بڑھائی جائے اور اس میں اردو، فارسی، دینیات، سیرت، تجوید، حساب، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ کی اتنی معیاری تعلیم دے دی جائے، جو اگلے مضامین کے لئے مناسب بنیاد فراہم کر سکے۔

(۳) درس نظامی میں تاریخ کو بطور مضمون اس لئے باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا کہ قوت مطالعہ پیدا ہونے کے بعد یہ مضمون ذاتی مطالعے سے بھی بخوبی حاصل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اب تجربہ یہ ہو رہا ہے کہ ذاتی مطالعے کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی درجات کے نصاب میں تاریخ اور سیرت کو باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے

داخل نصاب کیا جائے۔

(۴) یہی حال تصوف اور اخلاق کا ہے کہ اس کو باقاعدہ درس میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا تھا کہ مدارس کا پورا ماحول بذات خود اخلاق وطریقت کی عملی تربیت کرتا تھا اور باقی ماندہ کسر ذاتی مطالعے اور کسی مرشد کے تعلق سے پوری ہوجاتی تھی؛ لیکن اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور اخلاق کی کتب باقاعدہ داخل درس ہوں، اس مقصد کے لئے حضرت امام غزالی کی ''ہدایۃ الہدایہ'' اور ''اربعین'' ''احیاء العلوم'' کے منتخب حصے، حضرت امام سہروردی کی ''عوارف المعارف'' حکیم الامت حضرت تھانوی کی ''التکشف'' اور ''التشرف'' وغیرہ مختلف درجات میں رکھی جاسکتی ہیں۔

(۵) ایک عالم دین کے لئے یہ ضروری ہے کہ جن دوسرے مذاہب وادیان کا براہ راست اسلام سے تصادم رہا ہے اور جن کے تبلیغی مشن اب بھی سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہیں، نیز خود مسلمانوں کے وہ فرقے اور گروہ جنہوں نے اپنے کچھ مخصوص نظریات کی بنا پر اپنا مستقل وجود قائم کیا ہوا ہے، ان سب کے بنیادی عقائد وافکار سے وہ فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو؛ تاکہ بوقت ضرورت ان کی جواب دہی کرسکے، لہٰذا درس میں ''الملل والنحل'' یا ''الادیان والفرق'' کے نام سے ایک مستقل موضوع کا اضافہ ہونا چاہئے، جس میں ان ادیان وفرق کا مختصر تعارف، ان کے بنیادی عقائد وافکار اور ان کی تردید کے بنیادی دلائل بیان کردیئے جائیں، جن کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کو زیادہ واسطہ پیش آتا ہے؛ تاکہ ان سے متعلق ضروری اجمالی معلومات ہر طالب علم کو حاصل ہوجائیں اور جن لوگوں کو بعد میں ان میں سے کسی مذہب یا فرقے پر خصوصی کام کا موقع ملے، اس کے لئے یہ تعارف ایک بنیاد کا کام دے سکے۔

(۶) علوم عصریہ کو ذریعہ معاش بنانے کے لئے مدارس کے نصاب میں ان کے

اضافے کا جو تصور ہے، اس کے بارے میں پیچھے ہم اپنی رائے تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں؛ لیکن بعض عصری علوم ایسے ہیں کہ موجودہ دور میں دین کی موثر تبلیغ اس کے کما حقہ دفاع اور اس کی صحیح خدمت کے نقطۂ نظر سے ایک عالم کے لئے بحیثیت عالم ان کی فی الجملہ واقفیت ضروری یا مفید ہوگئی ہے، مثلاً انگریزی زبان، جدید مغربی فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور اصول قانون، اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) جدید مغربی تعلیم کے اثر سے دنیا میں جتنی گمراہیاں پھیلی ہیں، ان سب کے چشمے انگریزی زبان میں ہیں اور جب تک ان گمراہیوں کے اصل منابع سے کما حقہ واقفیت نہ ہو ان کی تردید اور ان پر تنقید وتبصرہ ان لوگوں کے لئے پوری طرح مؤثر نہیں ہوتا، جو ان کے براہ راست مطالعے سے مرعوب ومتأثر ہوئے ہیں۔

یہ تقریباً وہی صورت حال ہے جو عباسی خلافت کے زمانے میں یونانی فلسفہ کے رواجِ عام سے پیدا ہوئی تھی، اس وقت فکری اور عقلی گمراہیوں کا اصل سرچشمہ یونانی منطق اور فلسفہ تھا اور جن لوگوں کے ذہن اس سے مرعوب ومتأثر تھے ان کے شکوک وشبہات کا مؤثر علاج اسی طرح ہوسکتا تھا کہ علماء اسلام نے اس منطق اور فلسفے کو داخل نصاب کیا، اس میں اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کی، اور پھر وقت کی گمراہیوں کا ایسا مؤثر سد باب کیا کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی موت آپ مر گئیں۔

اس وقت دینی علوم کے نصاب میں منطق اور فلسفے کو اس لئے داخل نہیں کیا گیا تھا کہ علماء اسے ذریعہ معاش یا اپنا مستقل مشغلہ بنائیں گے؛ بلکہ اس کا مقصد وقت کی ایک اہم دینی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔

بعینہ اسی طرح آج مغرب سے اٹھنے والے نظریات اور ان کی گمراہیوں نے پوری دنیا

کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور عالم اسلام کا بھی وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ معاشرے کی ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے، انہی نظریات سے متأثر اور بڑی حد تک ان کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، ان نظریات کی تردید میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ ان لوگوں کے ایمان ویقین کے تحفظ کے لئے تو کسی درجے میں کارآمد ہے جس پر دین کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط ہے؛ لیکن جو لوگ ان نظریات سے ایسے متأثر ہوئے ہیں کہ ان پر دین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے، ان کو واپس لانے کے لئے کافی نہیں، ایسے لوگوں کے لئے اسی طرز پر کام کی ضرورت ہے جس طرز پر یونانی نظریات کی یلغار کے مقابلے متکلمین اسلام نے انجام دیا تھا، یہ کام علمائے امت کے ذمے ایک قرض ہے، جس کی ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوگی مغربی گمراہیوں کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائے گا۔

(ب) چونکہ ان مغربی نظریات پر مؤثر اور بھرپور تنقید کے لئے ان کے اصل ماخذ تک رسائی ضروری ہے، اس لئے اب تک یہ کام ان لوگوں نے انجام دیا ہے جو ان ماخذ تک رسائی تو رکھتے ہیں؛ لیکن انہوں نے دینی علوم باقاعدہ متوارث طور پر اساتذہ سے نہیں پڑھے تھے، اس کے بجائے ان کی دینی معلومات متفرق مطالعے پر مبنی تھیں، جس سے ظاہر ہے کہ علم کا رسوخ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے ان لوگوں نے ان مغربی نظریات کے مقابلے میں دین کی جو تشریح وتعبیر کی وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی تھی، اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں جن سے خود مسلمانوں کے درمیان افتراق وانتشار کا دروازہ کھل گیا، ان نئی غلط فہمیوں کا مؤثر سد باب صرف سلبی انداز میں نہیں ہوسکتا؛ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ علم دین میں رسوخ رکھنے والے علماء بذات خود ایجابی طور پر وہ کام کریں جس کی غلط انجام دہی نے ان نئی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

(ج) مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر ''تحقیق'' کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا ایک انبار تیار کر دیا ہے، جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے، یہ لٹریچر جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے جو آج کے ذہن کو اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں، اس زہر کا تریاق فراہم کرنا علماء کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے انگریزی زبان اور ان عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے جن کو اس کارروائی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

(د) اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور مشرق بعید کے ممالک میں آباد ہے، ان لوگوں کو؛ بالخصوص ان کی نئی نسلوں کو اسلام پہنچانے کا کوئی راستہ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں، ان خطوں کے مسلمانوں کو اب اپنی نئی نسلوں کے دین کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہے اور اس غرض کے لئے کافی جدوجہد کے بعد مساجد اور دینی مراکز میں ایسے علماء کی ضرورت روز افزوں ہے جو علوم دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی جانتے ہوں؛ تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کرسکیں، راقم الحروف کو ایسے متعدد ممالک میں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے اور یہاں رہتے ہوئے بھی شاید کوئی مہینہ خالی گزرتا ہو جس میں وہاں سے انگریزی جاننے والے علماء کی طلب نہ آتی ہو۔

چونکہ ایسے صحیح الفکر اور راسخ علماء کی تعداد ہمارے درمیان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے جو انگریزی جانتے ہوں، اس لئے ان تمام مقامات پر وہ لوگ پہنچ رہے ہیں جو انگریزی تو بے شک جانتے ہیں؛ لیکن یا تو ان کی دینی معلومات سطحی اور سرسری نوعیت کی ہیں یا ان کے نظریات طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔

(ہ) مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لئے انگریزی زبان میں

بڑے وسیع دینی لٹریچر کی ضرورت ہے؛ لیکن حال یہ ہے کہ انگریزی میں قرآن کریم کی کوئی ایک تفسیر بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کے بارے میں آنکھ بند کر کے لوگوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا جاسکے، اسی طرح روزمرہ کے دینی اور فقہی مسائل پر مشتمل کوئی ایسی مستند کتاب اب تک تالیف نہیں ہوئی، جو ان لوگوں کو دین کی تعلیمات سے ٹھیک ٹھیک روشناس کرا سکے، اس وقت یا تو چند گنی چنی اردو کتابوں کے تراجم ہیں، جن کی صحت کی بھی کوئی ضمانت نہیں، یا پھر اہل باطل کا فراہم کیا ہوا لٹریچر ہے جسے لوگ چاروناچار پڑھنے پر مجبور ہیں، ان مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرانا اور ان کے دین وایمان کی حفاظت علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے، جو انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

(و) موجودہ صنعتی دور نے تجارت ومعیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں، ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروجہ کتب میں اس لئے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا تصور پہلے نہیں ہوسکتا تھا، ان صورتوں کو سمجھ کر ان کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے اور یہ کام اسی وقت ٹھیک ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو ان کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں اور اس کے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں، اب تک ہوتا یہ ہے کہ صورت مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے، اس لئے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے اسی کے مطابق جواب چلا جاتا ہے؛ لیکن مستفتی چونکہ عالم نہیں ہوتا، اس لئے وہ بسا اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر صورت مسئولہ کے وہ اہم اجزاء- جن پر جواب کا دارومدار ہوتا ہے- بیان نہیں کر پاتا، اس لئے جواب مختلف ہوجاتا ہے، اور یہ بھی صرف ان معاملات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں تاجر کے دل میں

کوئی شبہ ہو اور اس کی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہو جائے، ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے جن کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا یا استفتاء کا تقاضا پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جس طرح حضرت امام محمدؒ بازاروں میں گھوم گھوم کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے از خود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے؛ تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدون کر جائیں اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں، موجودہ دور کے اہل علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہل عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کے بعد حسب ضرورت تصنیف و تالیف اور فتوی کے ذریعہ ان معاملات کا شرعی حکم امت پر واضح کریں، اس غرض کے لئے معاشیات کا اتنا علم؛ جس سے اہل عصر کے معاملات اور ان کے تجارتی مسائل کا علی وجہ البصیرۃ علم ہو سکے، ایک عالم دین کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔

(ز) اس وقت جدید معاشی اور سیاسی نظریات نے پوری دنیا کو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا ہے، اسلامی ممالک بھی عملاً انہی میں سے کسی نہ کسی کیمپ کے ساتھ وابستہ اور ہر پسماندہ یا ترقی پذیر ملک ان دونوں کی آویزش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، سرمایہ داری، اشتراکیت اور سیکولر سیاسی نظریات مسلمانوں کے درمیان اپنے افکار کے پرچار اور مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں، اس صورت حال کا مقابلہ علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے؛ کیونکہ وہی دین کا پورا تحفظ کرتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتا سکتے ہیں؛ لیکن اس غرض کے لئے ان تمام نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔

(ح) اس وقت عالم اسلام میں رفتہ رفتہ یہ شعور جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم نے جدید عصری علوم کو مغربی قالب کے ساتھ جوں کا توں اپنا کر کس قدر سنگین اجتماعی غلطی کی ہے، چنانچہ اب یہ آوازیں تقریباً ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ کر اپنے

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانا چاہیے، اور ان علوم کی نصابی اور تحقیقی کتابوں میں اسلامی تعلیمات، علماء اسلام کے افکار اور ان کی خدمت کو اس طرح سمونا چاہئے کہ اس مغربی افکار کی بالا دستی ختم ہو جائے، اس غرض کے لئے اب عالم اسلام میں جگہ جگہ مختلف علوم کے تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں، ان مراکز میں ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جو دین کا وسیع وعمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع سے بھی کماحقہ واقف ہوں اور چونکہ راسخ الفکر علماء میں ایسے لوگ کمیاب بلکہ نایاب ہیں، اس لئے ان مراکز میں وہ ذہن پہنچ رہا ہے جو دین کی صحیح بصیرت نہیں رکھتا۔

ان مراکز کے اثرات و نتائج جلدی تو ظاہر نہیں ہوں گے؛ لیکن دس بیس سال میں ان کے نتائج پوری طرح منظر عام پر آجائیں گے اور علوم عصریہ کی تمام درسگاہوں میں انہی کی تحقیقات سکہ رائج الوقت بنیں گی، لہٰذا ان مراکز کی صحیح تحقیقی رہنمائی کا فریضہ بھی علماء دین پر عائد ہوتا ہے، جس کے لئے متعلقہ موضوعات کی فی الجملہ واقفیت ناگزیر ہے۔

یہ تمام کام- جن کی ضرورت واہمیت سے شاید ہی کوئی دردمند اور سلیم الفکر مسلمان انکار کر سکے- ایک دو یا چند افراد کے بس کے نہیں ہیں اور نہ یہ ساری ضروریات کسی مختصر مدت میں پوری ہو سکتی ہیں، اس کے لئے ایسے پختہ کار، راسخ الفکر اور ذی استعداد علماء کی پوری کھیپ درکار ہے، جو اپنی اپنی طبعی مناسبت کے لحاظ سے اپنے لئے کام کے مختلف دائرے تجویز کرے اور ان دائروں میں شب و روز محنت کر کے یہ قرضہ چکائے، مگر اس سارے کام کی بنیاد دینی مدارس ہی میں فراہم کرنی ہوگی۔

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ان مضامین کی تدریس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام مضامین کے متخصصین پیدا کرنے مقصود ہیں اور نہ یہ تاثر

درست ہے کہ ان مضامین کی تدریس کے لئے کوئی بہت زیادہ وقت صرف کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ بفضلہٖ تعالیٰ درس نظامی کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس نصاب کو قرار واقعی طور پر پڑھ لے، اس کا ذہن منضبط اور علمی وفکری باتوں کے لئے پوری طرح تیار ہوجاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا ادراک بہت جلد کرلیتا ہے، جسے سمجھنے میں دوسرے لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے؛ اس لئے اگر دینی مدارس کے طالب علم کو انگریزی زبان کے ساتھ مذکورہ بالا چند مضامین کی بنیادی واقفیت حاصل ہوجائے تو وہ ضرورت کے وقت ان شاء اللہ اس بنیاد پر عمارت خود کھڑی کرسکے گا۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں علماء کی خدمات اور ان کی کوششوں کو مؤثر بنانے اور ان کا دائرۂ اثر بڑھانے کے لئے مذکورہ بالا اقدامات نہایت ضروری ہیں؛ لیکن (اور یہ "لیکن" بھی ہمارے نزدیک بے حد اہمیت رکھتا ہے) ان اقدامات سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ اس بات کا پورا اطمینان ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اتباع سنت کا وہ مزاج و مذاق، جو ان مدارس کی اصل روح اور ان کی سب سے قیمتی متاع ہے؛ اسے کسی بھی مرحلے پر ادنیٰ ٹھیس نہ لگے، اس مزاج و مذاق کے بارے میں ہم اپنی گذارشات اسی مضمون کے ابتدائی حصے میں پیش کرچکے ہیں اور اس کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے، کیونکہ اس کو مجروح کرکے جو کام بھی کیا جائے گا وہ ان مدارس کو تباہی کی طرف لے جائے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جن مضامین کے اضافے کی تجویز سابقہ صفحات میں پیش کی گئی ہے وہ اس وقت مفید ہوسکتی ہے جب ان مدارس کے اصل علوم عالیہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ کے معیار تعلیم میں نہ صرف یہ کہ کوئی ادنیٰ خلل یا نقص واقع نہ ہو؛ بلکہ ان کے معیار تعلیم کو مزید مضبوط اور مستحکم بنایا جائے۔

ان دونوں ناگزیر شرطوں کے پیش نظر ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جن عصری

مضامین کو داخل نصاب کیا جائے ان کے لئے ایسے پڑھانے والے تلاش کئے جائیں جو اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے دینی مدارس سے فکری اور عملی طور پر پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور اپنی تدریس کے دوران طلبہ کا ذہن ان مضامین کے مقصد تدریس کے لئے تیار کرتے رہیں، اس غرض کے لئے اگر مدارس کو اپنے بعض اساتذہ کو رخصت دے کر تیار کرنا پڑے تو اس میں بھی چنداں حرج نہیں ہوگا اور ظاہر ہے کہ مضامین کا یہ اضافہ بتدریج ہی مناسب ہوگا، اس لئے اگر ایک مرتبہ اصولی طور پر مذکورہ بالا مقاصد کی تحصیل کی طرف توجہ ہوجائے تو رفتہ رفتہ اس کے مناسب وسائل ان شاءاللہ فراہم ہوتے جائیں گے۔

(۷) نصاب سے متعلق ساتویں بات منطق اور فلسفے کی تعلیم سے متعلق ہے، بعض حضرات یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین کو پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی؛ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں، ان مضامین کی اہمیت کے لئے تنہا یہ بات کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ بالخصوص اصول فقہ انہی علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز و اسلوب پر مشتمل ہے، اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لئے منطق اور فلسفے کی واقفیت ضروری ہے، آج ''تفسیر کبیر'' جیسے دریائے علم سے استفادہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفے کا علم رکھتا ہو، لہٰذا ان مضامین کو یکسر ختم کر دینا ہمارے نزدیک سخت نقصان دہ ہوگا؛ لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہئے جس حد تک وہ اسلامی علوم کے لئے زینے کا کام دیں، ان کو ایک مستقل علم مقصود کے طور پر پڑھنے پڑھانے کا واقعی اب کوئی جواز نہیں، لہٰذا جہاں ان مضامین کی تعلیم مذکورہ ضرورت سے زائد ہو رہی ہو وہاں اس کو ضرورت کی حد تک محدود کر کے دوسرے مضامین کے لئے گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ فلسفہ میں

عنصریات اور فلکیات کے جو حصے اب تحقیق اور مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکے ہیں، ان کی غلطی پر تنبیہ کے ساتھ جدید تحقیقات پڑھانا ضروری ہے، جس کے لئے علامہ نجیبؒ کی ''توفیق الرحمٰن'' علامہ آلوسی کی ''ما دل علیہ القرآن'' اور مولانا محمد موسیٰ صاحب کی ''جدید فلکیات'' سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۸) نصاب کے سلسلے میں آخری گزارش یہ ہے کہ قویٰ کے مسلسل انحطاط اور مسائل کی پیچیدگیوں کی بنا پر عرصے سے یہ بات محسوس ہو رہی ہے کہ دورۂ حدیث کے لئے ایک سال کی مدت ناکافی ہے، اس مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور عموماً یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق و تفصیل کے ساتھ ہو پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے اور اس کے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں، ایک صحیح البخاری کو لے لیجئے، استاذ اور شاگرد شب و روز محنت کرنے کے باوجود آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صحیح البخاری کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جسے رواداری میں گزار دیا جائے۔

اسی طرح دورہ حدیث کی بعض انتہائی اہم کتب مثلاً طحاوی شریف اور موطائین اسی وقت کی قلت کی بنا پر اکثر برائے نام ہوتی ہیں، حالانکہ ان کو اہتمام کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے، اگر دورہ حدیث کو دو سالوں پر منقسم کر دیا جائے تو امید ہے کہ - ان شاء اللہ - علم حدیث کے ساتھ مطلوب مناسبت پیدا ہو سکے گی اور طالب علم حدیث کے تمام ابواب علی وجہ البصیرۃ پڑھ سکے گا اور اس کے ساتھ اصول حدیث کی کوئی معیاری کتاب مثلاً ''تدریب الراوی'' یا ''فتح المغیث'' وغیرہ بھی اہتمام کے ساتھ ہو سکے گی، جو ایک حدیث کے طالب علم کے لئے ازبس ضروری ہے۔ (ہمارا تعلیمی نظام: ص: ۹۴-۱۰۶)

نزلہ بر عضو ضعیف:

حضرت علامہ بلیاویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم کے تین ارکان ہیں: استاذ، طالب علم اور نصاب۔ ان میں سے دو جاندار ہیں اور ایک بے جان ہے؛ چونکہ نصاب بے جان ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کرسکتا اور دوسرے دونوں جاندار رکن اپنا اپنا دفاع کر سکتے ہیں، اس لیے دونوں جاندار اپنی اپنی کوتاہیوں کا سارا بوجھ بے جان نصاب پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں؛ حالانکہ اصل کام معلم اور متعلم کا ہوتا ہے، اور وہ اگر مخلص، باصلاحیت اور محنتی ہوں تو نصاب کی کمزوریوں کو رفع کیا جا سکتا ہے، اس لیے اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ استاذ کو صحیح معنوں میں استاذ بنایا جائے اور طالب علم میں طلب علم کا ذوق بیدار کیا جائے؛ تاکہ وہ محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکے۔

اساتذہ کو نہ صرف تعلیم و تربیت کے فن سے مستقل طور پر آراستہ کرنے کی ضرورت ہے؛ بلکہ دینی و اخلاقی تربیت اور روحانی معیار کے حوالے سے بھی ان کی خصوصی تربیت ضروری ہے؛ کیونکہ استاذ صرف تعلیم نہیں دیتا، بلکہ طالب علم کے ذہن، اعمال اور اخلاق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

کتاب فہمی کے ساتھ ساتھ علم اور فن کے ساتھ مناسبت کو بھی اہداف میں شامل کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے اساتذہ کی خصوصی تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے، پرانی کتابوں کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں نئی کتابوں میں سے بھی انتخاب کیا جائے، مشکل زبان کے بجائے آسان زبان کو ترجیح دی جائے، علم وفن کو بطور علم وفن پڑھا جائے اور کتاب فہمی کے معیار کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جائے، خاص طور پر عربی زبان کی تعلیم میں جدید اسلوب اور طریق کار سے استفادہ کیا جائے۔ (دینی مدارس کا نصاب و نظام: ۳۲۳)

جدید علوم سے واقفیت:

جدید علوم سے اجمالی واقفیت اور ان کی بنیادی اصطلاحات اور معلومات سے آگاہی تو ہر عالم دین کے لیے ضروری ہے؛ کیونکہ اس کے بغیر علمائے کرام قومی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کو ان کی زبان، اسلوب اور اصطلاحات میں دین کی تعلیم اور پیغام نہیں پہنچا سکیں گے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری شعبوں میں تخصص کے درجات کا قیام بھی اہم ضرورت ہے، ذہین علمائے کرام کو معیشت کے جدید علم اور بینک کاری کی تعلیم دی جانی چاہئے؛ کیونکہ اسلامی بینک کاری کا دائرہ پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے، لیکن انہیں اسلامی علوم سے بہرہ ور ماہرین معیشت مشورہ اور رہنمائی کے لیے نہیں مل رہے اور اس شعبہ میں بڑا خلا پایا جاتا ہے، صحافت کا ذوق رکھنے والے علماء کو اردو، عربی اور انگلش میڈیا کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے صحافت کی تربیت دی جانی چاہیے؛ کیونکہ میڈیا آج کے دور کا بڑا ہتھیار ہے اور اسلامی عقائد و احکام کے خلاف پروپیگنڈہ اور مسلمانوں کی کردار کشی کا سب سے بڑا مورچہ یہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ علمائے کرام اس شعبہ میں آگے بڑھیں اور پوری مہارت اور ٹکنیک کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب و دفاع کے لیے شعوری محنت کریں۔

مسیحی تاریخی پس منظر:

ہمارے فاضل علماء کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسیحی مذہب کا تاریخی پس منظر کیا ہے، اس کے بڑے بڑے فرقے کون کون سے ہیں، ان کا مسلمانوں کے ساتھ عقائد میں کیا اختلاف ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تہذیبی فرق کیا ہے، گزشتہ چودہ سو برس میں ان کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت تھی، صلیبی جنگوں کی مختصر تاریخ کیا ہے، مذہبی دور کی عیسائی

حکومتوں کے ساتھ ہمارا کیا جھگڑا تھا، آج کی غیر مذہبی اور سیکولر مسیحی حکومتوں کے ساتھ کیا تنازع ہے، مسلم مسیحی کشمکش کی موجودہ صورت حال کیا ہے، اور عالمی مسیحی ادارے اور مشنریاں کس کس محاذ پر اور کس کس طریقہ کار سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کر رہے ہیں؟ اس کے ساتھ عقائد کے بارے میں دونوں طرف کے دلائل سے واقفیت اور مناظرہ و مباحثہ کی تیاری بھی ہو جائے تو یہ سونے پر سہاگہ کا کام دے گی، اسی طرح دیگر معاصر مذاہب کے بارے میں ہمارے فضلاء کو بنیادی معلومات حاصل ہونی چاہئے؛ ورنہ موجودہ بین الاقوامی ماحول میں وہ دین کی صحیح طور پر خدمت نہیں کر سکیں گے، اس کے علاوہ اسلام کے داخلی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری کی تاریخ، باہمی فرق اور علمی وفکری کشمکش سے بھی فضلاء کا واقف ہونا ضروری ہے۔ (دینی مدارس کا نصاب ونظام: ۲۳۳)

دینی مدارس میں جدید فکر وفلسفہ کی تعلیم کے سلسلہ میں تجاویز

* دینی مدارس کے فضلاء کے لیے ایسے کورسز کا اہتمام جن میں انہیں انگلش زبان، دیگر مذاہب اور تحریکات کے تعارف، قانون وسیاست اور اسلام کو درپیش جدید چیلنجز کے حوالے سے ضروری تیاری کرائی جائے۔

* تاجر حضرات، ملازمین اور اس طرح کے دیگر طبقات کے لیے فہم دین کے شارٹ کورسز جن کے ذریعہ سے وہ ضروریات دین سے واقف ہوں اور ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔

* غیر مسلم حضرات جو اپنے مذہبی کے دائرے سے نکل کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور اپنے ماحول سے کٹ جاتے ہیں، ان کی کفالت، دینی تعلیم اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رفاہی تعلیمی ادارے کا قیام۔

* سلوک و احسان اور دین کی عملی و اخلاقی تربیت کے لیے خانقاہی نظام کی روشنی میں مناسب تربیتی ماحول کے قیام کی کوشش۔

* اسکولوں اور کالجوں میں تعطیلات کے دوران میں ان کے طلبہ اور طالبات کے لیے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم کے شارٹ کورسز کا اہتمام۔

* نئے مسائل کی تحقیق اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ان کے حل کے لیے ایک ریسرچ سینٹر کا قیام جس میں جید علمائے کرام اور ارباب دانش امت مسلمہ کی علمی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔

* ایک معیاری ویب سائٹ کا قیام جس کے ذیعہ سے ضروری دینی وملی معاملات میں امت مسلمہ کی راہنمائی کی جا سکے وغیرہ۔

حضرت مولانا ومفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے بتایا کہ ان کے ہاں دارالعلوم کراچی میں پروفیسر محمد حسن عسکری مرحوم کی کتاب ''جدیدیت'' ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جس میں ارسطو سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مغربی مفکرین کے فکر وفلسفہ کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعارف کرایا جاتا ہے اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا کہنا ہے کہ پروفیسر حسن عسکری نے یہ کتاب انہی کے کہنے پر اس مقصد کے لیے لکھی تھی۔

(دینی مدارس کا نصاب و نظام:۲۳۸)

عصری تعلیم یافتہ علماء کا کردار:

اس سلسلے میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، مثلاً ان کی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں، ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے

سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے، جس کی وجہ سے مساجد و مدارس کو ضرورت اور معیار کے مطابق ائمہ، خطباء اور مدرس میسر نہیں آتے، ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مروجہ معیار کسی طرح بھی اس درجہ کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے، پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے، اس لیے جسے سرکاری ملازمت میں جانے کا راستہ مل جاتا ہے، وہ لازماً ادھر کا رخ کرے گا اور مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کے فقدان اور خلا کا مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر جائے گا۔

دینی مدارس کو ابھی تک اپنے وجود کے تحفظ اور اپنے کردار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظات کی فضا کا سامنا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی تیار کردہ کھیپ کو دوسرے شعبوں کے حوالے کر کے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں؛ اس لیے اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسہ تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کسی بھی طبقے کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہوگا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا، ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈا مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی؛ بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی، اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

* درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور

عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔

* گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

* اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت وضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

* مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضرورت کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

* اباحیت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

* مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

* اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش، خوراک اور صفائی کے معایار کو بہتر بنایا جائے اور کام کو پھیلانے کے بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

* مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت، خدمات اور کردار کے حوالہ سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

(دینی مدارس کا نصاب ونظام: ۲۷۳)

مغربی طوفان کے مقابلہ میں مدارس کا کردار:

(۱) جدید مغربی فلسفہ حیات کے اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارے

دینی مدارس کا کردار کیا ہے؟ اور

(۲) مسلم معاشرے میں نفاذ اسلام کے ناگزیر علمی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان مدارس کا نظام کار اور حکمت عملی کیا ہے؟

ایک دور تھا جب یونانی فلسفہ نے عالم اسلام پر یلغار کی تھی اور عقائد و افکار کی دنیا میں بحث و تمحیص کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اگر اس وقت عالم اسلام کے تعلیمی مراکز اور اہل علم یونانی فلسفہ کی اس یلغار کو وقتی طوفان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنے کان اور منہ لپیٹ کر اس کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہتے تو اسلامی علوم و عقائد کا پورا ڈھانچہ فلسفہ یونان کی حشر سامانیوں کی نذر ہو جاتا؛ لیکن علمائے اسلام نے اس دور میں ایسا نہیں کیا بلکہ یونانی فلسفہ کے اس چیلنج کو قبول کر کے خود اس کی زبان میں اسلامی عقائد و افکار کو اس انداز سے پیش کیا کہ یونانی فلسفہ کے لیے پسپائی کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا اور اس کے بپا کیے ہوئے فکری اور نظریاتی معرکوں کے تذکرے آج رازی، غزالی، ابن رشد اور ابن تیمیہ کی تصنیفات میں یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔

یورپ کے جدید فلسفہ حیات کی یلغار بھی یونانی فلسفہ کے حملہ سے کچھ مختلف نہیں ہے، یہ فلسفہ حیات جس نے انقلاب فرانس کے ساتھ اپنا وجود تسلیم کرایا اور پھر یورپ کے صنعتی انقلاب کے زیر سایہ اپنا دائرہ وسیع کرتے ہوئے آج دنیا کے اکثر و بیشتر حصہ کو لپیٹ میں لے چکا ہے، خود کو انسانی زندگی کے ایک ہمہ گیر فلسفہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور انسان کے پیدائش کے مقصد سے لے کر انسانی معاشرت کے تقاضوں اور مابعد الطبیعیات کی وسعتوں تک کو زیر بحث لاتا ہے، ڈارون، فرائیڈ، نطشے اور دیگر مغربی فلاسفروں اور سائنس دانوں کی گزشتہ دو صدیوں پر محیط فکری کاوشوں اور نظریاتی مباحث کا خلاصہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

کلیسا کی بدکرداریوں اور مظالم کے ردعمل کے طور پر جنم لینے والے اس فلسفہ کو یورپ نے ایک مکمل فلسفہ حیات کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ دنیا میں موجود، اسلام سمیت تمام فلسفہ ہائے حیات کو مکمل شکست سے دوچار کر کے فنا کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے یورپ کی فکری یلغار کی ماہیت اور مقاصد کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اسے محض اقتصادی اور سیاسی بالادستی کا جنون سمجھ کر اس انداز میں اس کا سامنا کرتے رہے کہ اس کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ یونانی فلسفہ کے درآنے سے ہمارے ہاں عقائد کے نئے مباحث چھیڑ گئے تھے، جنہیں علمائے کرام نے اپنے فکری اور علمی مباحث میں سمو دیا اور ہمارے عقائد کی بیشتر کتابیں ان مباحث سے بھرپور ہیں؛ حتی کہ دینی مدارس کے نصاب میں آج تک طلبہ کو عقائد کے حوالے سے انہیں مباحث سے روشناس کرایا جاتا ہے جو یونانی فلسفہ کی پیداوار ہیں، اور جن میں سے زیادہ تر کا آج کے نئے فکری اور اعتقادی تقاضوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں؛ لیکن جو اعتقادی مباحث یورپ کے فلسفہ حیات نے چھیڑے ہیں، نہ ہماری عقائد کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہم طلبہ کو ان مباحث کی ہوا ہی لگنے دیتے ہیں۔

ڈارون کا نظریہ ارتقاء ان کے مقصد وجود میں کشش جنسی کی محوری حیثیت کے بارے میں فرائیڈ کے تصورات، اجتماعی زندگی سے مذہب کی مکمل لاتعلقی، اور غیر محدود فکری آزادی کا نعرہ آخر اعتقادی مباحث نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور کیا انہیں افکار و نظریات کا شکار ہو کر مسلمان کہلانے والوں کی ایک بڑی تعداد اسلام کے اجتماعی کردار سے منکر یا کم از کم مذبذب نہیں ہو چکی ہے؟ اس اعتقادی فتنہ کی روک تھام کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کیا کردار ہے؟

ہمارے نصاب میں تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی کون سی کتاب میں یہ مباحث شامل ہیں اور ہم اپنے طلبہ کو ان مباحث سے روشناس کرانے اور انہیں ان کے جواب کی خاطر تیار کرنے کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ (دینی مدارس کا نصاب ونظام: ۲۸۰)

اصلاح نصاب کے سلسلہ میں گذارش:

موجودہ حالات میں دینی مدارس کے نظام و نصاب میں جن اصلاحات، ترامیم اور اضافوں کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے انہیں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

(۱) دینی مدارس میں مروجہ زبانوں پر اس درجہ کے عبور کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی کہ ایک فارغ التحصیل عالم دین کسی مسئلہ پر اپنا مافی الضمیر انگلش، عربی یا کم از کم اردو میں ہی شستہ انداز میں قلم بند کر سکے یا اس کا زبانی طور پر کسی علمی محفل میں سلیقہ کے ساتھ اظہار کر سکے، اس لیے دینی مدارس میں ایسا نظام قائم کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تحریری اور تقریری طور پر مافی الضمیر کے اظہار پر فضلاء کو دسترس حاصل ہو اور انگلش بھی کم از کم اس درجہ میں لازمی ہے کہ لکھی ہوئی چیز پڑھ اور سمجھ کر وہ اس کے بارے میں اپنی زبان میں اظہار خیال کر سکیں۔

(۲) درس نظامی کے مروجہ نصاب میں تاریخ بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ کے بارے میں قابل ذکر مواد موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے ایک فارغ التحصیل عالم دین عام طور پر تاریخی تسلسل اور اہم واقعات کی ترتیب تک سے بے خبر رہ جاتا ہے اور یہ بات خود دینی رہنمائی کے تقاضوں کے منافی ہے۔

(۳) دوسرے ادیان و مذاہب، معاصر فلسفہ ہائے حیات اور نظام ہائے زندگی کا

تقابلی مطالعہ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے انتہائی ضروری ہے اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے پس منظر اور مرحلہ وار پیش قدمی سے بھی علماء کا باخبر ہونا لازمی ہے، ورنہ موجودہ عالمی تناظر میں اسلام کی صحیح ترجمانی کا فریضہ سرانجام دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

(۴) ملت اسلامیہ کے اندرونی فقہی مذاہب اور مسالک کی تاریخ اور جدوجہد کے ادوار سے واقفیت بھی ایک عالم دین کے لیے ناگزیر ہے؛ لیکن مناظرانہ انداز میں نہیں بلکہ تعارف اور بریفنگ کے انداز میں؛ تاکہ اصل تقابلی تناظر سامنے رہے اور اپنے فقہی مذہب اور مسلک کی خدمت کرتے ہوئے بھی شعور و ادراک کے ساتھ ایک عالم دین کا رشتہ استوار رہے۔

(۵) دینی مدارس میں اس وقت مختلف علوم و فنون میں جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ بہت مفید اور ضروری ہیں؛ لیکن ان کتابوں کے لکھے جانے کے بعد کی صدیوں میں علوم و فنون میں جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں اور ہر علم میں نئے نئے شعبوں اور ابواب کا اضافہ ہوا ہے ان سے علماء کرام کو لاتعلق رکھنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ انہی علوم و فنون میں نئی لکھی جانے والی مفید کتابوں کا انتخاب کیا جائے اور انہیں بھی شامل نصاب کیا جائے۔

(۵) ہمارے ہاں درس نظامی میں عام طور پر کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے، جس سے طالب علم میں استعداد تو پیدا ہوتی ہے اور اس کی مطالعہ و استنباط کی صلاحیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن اس کی نظر متعلقہ علم و فن کے وسیع تر تناظر اور افق کے بجائے کتاب کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جبکہ علم و فن کے تمام پہلوؤں سے اس کی شناسائی نہیں ہوتی، اس لیے طریق تدریس میں اتنی تبدیلی ضروری ہے کہ کسی علم یا فن کی ضروری کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس علم و فن کے تعارف، تاریخ، ضروری مباحث اور جدید معلومات پر محاضرات کا بھی اہتمام کیا جائے؛ تاکہ طلبہ اپنے اساتذہ کے علوم و مطالعہ سے زیادہ بہتر انداز میں فیض

یاب ہو سکیں اور علوم و فنون کی فطری پیش رفت کے ساتھ ان کا تعلق قائم رہے۔

(۷) ہمارے ہاں نظری، فقہی اور فروعی مباحث میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کے احترام اور برداشت کا معاملہ خاصا ناگفتہ بہ ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ خالصتاً فروعی حتیٰ کہ اولیٰ و غیر اولیٰ کے جزوی اختلافات بھی بحث و مباحثہ میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ کفر و اسلام میں معرکہ آرائی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے، یہ صورتحال بہت زیادہ توجہ کی طالب ہے اور دینی مدارس کے اربابِ حل وعقد کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اقدامات کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔

(۸) ہمارے ہاں درس نظامی میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظام و نصاب موجود نہیں ہے، حالانکہ تمام نظام ہائے تعلیم میں اس کی ضرورت و افادیت مسلم ہے، مگر درس نظامی کے مدارس میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور ذوق رکھنے والا فاضل کسی نہ کسی مدرسہ میں تدریس کی جگہ حاصل کر لیتا ہے مگر اس کے بعد طلبہ کی ذہن سازی، تربیت اور ان کی فکری ترجیحات کے تعین میں وہ کسی اصول، ضابطہ و قانون اور متعین اہداف کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ یہ معاملات خالصتاً اس کے ذاتی ذوق اور رجحانات پر منحصر ہوتے ہیں، جس کے اثرات لازماً طلبہ پر بھی پڑتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی سطح پر اساتذہ کی تربیت کے کورس طے کیے جائیں اور بتدریج اس سلسلہ کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ کسی مدرسہ میں تدریس کا منصب حاصل کرنے کے لیے یہ کورس شرط سمجھا جانے لگے۔

(۹) قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ آج کے دور میں یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظام حیات کو ایک مستقل مضمون اور باضابطہ نصاب کے طور پر پڑھایا جائے اور اسلامی احکام و قوانین پر فکر جدید کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات و شکوک کو سامنے رکھتے ہوئے طلبہ کو شعوری طور پر اسلامی نظام کی ترجمانی اور نفاذ کے

لیے تیار کیا جائے۔

(۱۰) ابلاغ عامہ کے تمام میسر ذرائع مثلاً پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور کمپیوٹر و انٹرنیٹ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ وفضلاء کی اس درجہ کی شناسائی اور مہارت ضروری ہے کہ وہ ان کے استعمال کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں اور ان ذرائع سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے کام کی نوعیت اور دائرہ کار کا ادراک کرتے ہوئے اس کے توڑ کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کر سکیں۔

(۱۱) درس نظامی کے نصاب کی اس انداز میں درجہ بندی ہونی چاہیے کہ تمام طلبہ کے لیے قرآن وحدیث، فقہ اور عربی گرامر کی یکساں ضرورت کی ایک حد متعین کرکے اس کے بعد طلبہ کی جداگانہ صلاحیتوں اور ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے مختلف علوم وفنون میں گروپ بندی کا اہتمام کیا جائے؛ تاکہ ہر طالب علم اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق تعلیمی میدان میں آگے بڑھ سکے۔

(۱۲) دینی مدارس کو اپنے اردگرد رہنے والے عام شہریوں بالخصوص اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لیے بھی مناسب اوقات میں مختصر کورسز کا اہتمام کرنا چاہیے، جن کے ذریعے وہ ضروری عربی گرامر کے ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ اور ضروریات زندگی کے حوالہ سے حدیث وفقہ کا منتخب نصاب پڑھ سکیں۔

(۱۳) دینی مدارس کے وفاقوں یا بڑے دینی مدارس کی سطح پر باصلاحیت اور ذہین فضلاءِ درس نظامی کے لیے تخصص کے ایسے کورسز کا اہتمام ضروری ہے جن کے ذریعہ انہیں مروجہ بین الاقوامی زبانوں مثلاً عربی، انگلش، فرنچ اور فارسی وغیرہ میں تحریر وگفتگو کی مہارت حاصل ہو، موجودہ عالمی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اسلام کی دعوت، ترجمانی اور دفاع کے لیے تیار کیا جائے اور ان میں بریفنگ، لابنگ اور دفتری کام کی جدید ترین تکنیک

کو سمجھنے اور اسے استعمال کرنے کی صلاحیت واستعداد پیدا کی جائے۔

(۱۴) طلبہ میں تحریر وتقریر اور مطالعہ وتحقیق کا ذوق بیدار کرنے کے لیے وفاقوں اور مدارس کی سطح پر خطابت اور مضمون نویسی کے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا جائے۔

(دینی مدارس کا نصاب ونظام:۲۸۹)

اساتذہ کے لئے تدریب وتربیت کا نظام:

* دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ایک مستقل تربیتی نظام کی ضرورت ہے، جس کا اہتمام دینی مدارس کے وفاقوں اور ملک کے بڑے دینی اداروں کو کرنا چاہئے، اس نظام میں ایسا جامع کورس ترتیب دیا جائے جو فکری، روحانی، اخلاقی، علمی اور فنی حوالوں سے اساتذہ کو ضروری تقاضوں سے باخبر کرنے اور ان کے مطابق ان کی عملی ترتیب پر مشتمل ہو اور اس میں تعلیمی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حالات زمانہ اور مستقبل کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہو۔

* دینی مدارس کے مہتمم حضرات کو توجہ دلائی جائے کہ وہ کسی استاذ کے انتخاب کے لیے اپنی موجودہ اور روایتی ترجیحات کا ازسرنو جائزہ لیں اور ادارہ سے وابستگی، علمی استعداد اور ذوق تدریس کے ساتھ ساتھ فکری رجحانات اور اخلاقی و دینی معیار کا بھی لحاظ رکھیں اور اجتماعی وملی سوچ اور وسیع تر دینی مفادات کو ترجیح دی جائے۔

* بڑے دینی مدارس میں سال کے مختلف حصوں میں اساتذہ کے لیے تین روزہ ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے، جن میں انہیں تعلیم وتدریس کے فنی تقاضوں اور دینی وفکری تربیت کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی جائے اور جدید تحقیقات ومعلومات سے انہیں آگاہ کیا جائے۔

* دینی مدارس اپنی تعلیمی سرگریوں کو صرف دینی مدرسہ کی چار دیواری تک محدود نہ رکھیں؛ بلکہ اردگرد بسنے والے عام مسلمانوں کو بھی اپنے تعلیمی نظام میں شریک کریں اور ان

کے لیے ترجمہ قرآن کریم، عربی گرامر اور فہم دین کورس کا اہتمام کریں وغیر ذلک۔

اسکول کالج کے بچوں کے لئے نصاب:

مختصر کورسز عربی زبان کے حوالے سے ہوں، قرآن فہمی کے حوالے سے ہوں، ضروریات دین کی تعلیم کے لیے ہوں یا عقائد کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ہوں، یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں اور ان کی طرف دینی اداروں اور مراکز کا بڑھتا ہوا رجحان یقیناً خوش آئند امر ہے۔ لیکن اس کے لیے چند امور کی طرف بروقت توجہ دینا ضروری ہو گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان مختصر کورسز میں پڑھایا جانے والا مواد کیا ہے؟ کیونکہ یہ مواد اگر باہمی مشاورت سے طے ہوگا تو اس سلسلہ کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا اور ہم آہنگی کا دائرہ بھی قائم رہے گا، لیکن اگر کیف ما اتفق ہر جگہ الگ الگ نصاب زیر تعلیم ہوگا تو ترجیحات میں تفاوت اور اہداف و مقاصد کا تنوع مزید فکری و ذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سطح پر جو امور سب سے زیادہ ضروری ہیں انہیں درج ذیل ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے:

* قرآن کریم صحیح تلفظ کے ساتھ اور تجوید کے بنیادی قواعد کے مطابق پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور عوامی سطح پر اس کا اہتمام کم ہوتا ہے، اس لیے یہ کوشش کی جائے کہ ان کورسز کے شرکاء کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی اس حد تک مشق کروائی جائے کہ وہ خود محنت کر کے قرآن کریم کی صحیح تلاوت کر سکیں۔

* نماز کے ضروری احکام و مسائل اور طریقہ و آداب کے علاوہ نماز میں پڑھے جانے والے وظائف، تسبیحات اور دعاؤں کا تلفظ صحیح کرانے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی سکھایا جائے؛ تاکہ نماز پڑھتے ہوئے نمازی ذہنی طور پر محسوس کر رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیوں

پڑھ رہا ہے؟ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ضروری مسائل سے واقف کرایا جائے۔

* قرآن کریم کی چند سورتیں و آیات اور ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث ترجمہ کے ساتھ یاد کرادی جائیں اور روزمرہ معمولات کے حوالے سے مختصر دعائیں بھی ترجمہ کے ساتھ یاد کرائی جائیں۔

* معاشرتی زندگی کے مسائل، خاندانی نظام کی اہمیت، باہمی میل جول کے شرعی آداب، چھوٹے بڑے کے حقوق و آداب، اور انسانی حقوق کے اسلامی تصور و احکام سے متعارف کرایا جائے۔

* حلال وحرام کے مسائل اور ضروری احکام بتائے جائیں۔ اور زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے احکام و مسائل ذہن نشین کرائے جائیں۔

* وجود باری تعالیٰ، توحید، رسالت، قیامت، ختم نبوت، حجیت حدیث، مقام صحابہ کرامؓ اور دیگر ضروریات کے حوالے سے عقائد سے روشناس کرایا جائے، اور اہل السنۃ والجماعۃ کے متفقہ عقائد مناسب ترتیب کے ساتھ اہتمام سے پڑھائے جائیں۔

* فکر و تہذیب کی موجودہ عالمی کشمکش سے انہیں آگاہ کیا جائے اور فکری و تہذیبی مسائل کے حوالے سے اہل دین کے موقف اور جدوجہد سے انہیں روشناس کرایا جائے۔

* ہمارا خیال ہے کہ اگر موسم گرما کی تعطیلات میں چالیس روزہ یا دو ماہ کے لگ بھگ دورانیہ کے ایسے کورسز کا اہتمام کر کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات کو ان میں شرکت کی ترغیب دی جائے تو ملک بھر میں دینی تعلیم کے فروغ اور دینی ماحول کے استحکام کی فضا قائم ہوسکتی ہے۔ جو اسلام اور اہل دین کے خلاف عالمی میڈیا اور لابیوں کی ہمہ گیر یلغار کے ماحول میں دن بدن زیادہ ضروری ہوتی جارہی ہے، میڈیا اور ذرائع ابلاغ جو کچھ کر رہے

ہیں اس کا علاج ہمارے پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین کی تعلیم کے نظام سے وابستہ کر لیں اور معاشرہ میں قرآن وسنت کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کریں، عام مسلمانوں اور خاص طور پر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات میں دینی تعلیم کے فروغ اور مسائل و احکام سے واقفیت کا ذوق بیدار کرنے سے بڑی حد تک اس زہر کا تریاق ہو جائے گا جو عالمی میڈیا اور لابیاں مغربی تہذیب و فلسفہ اور ثقافت کے فروغ کے لیے مسلسل پھیلا رہی ہیں۔(دینی مدارس کا نصاب و نظام: ۳۲۲)

وفاق کے نصاب کا تنقیدی جائزہ-سفارشات

علم فقہ:

علم فقہ کے نصاب کی نمایاں ترین خامی یہ ہے کہ اس میں فقہ وشریعت سے متعلق معاصر سوالات ،مباحث اور موضوعات کو کلیۃً نظر انداز کیا گیا ہے، اور کوئی ایک کتاب بھی ایسی شامل نصاب نہیں جو معاصر قومی و بین الاقوامی عرف کے تناظر میں متعلقہ سوالات کو موضوع بناتی ہو،اس خلا کی شکایت عرصہ دراز سے مدارس کے جید ترین علماء کرتے آرہے ہیں،لیکن تا حال اس حوالے سے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مثال کے طور پر ملکی قوانین کی تعلیم کی ضرورت کے حوالے سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوئی پون صدی قبل لکھا تھا کہ:

’’یہ میری بہت پرانی رائے ہے اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہوگئی، اس لئے کہ کوئی عمل نہیں کرتا، وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے درس میں داخل ہونے چاہئیں، یہ بہت پرانی رائے ہے؛ مگر کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں۔‘‘

اصول فقہ:

جہاں تک اصول فقہ کا تعلق ہے تو اس علم کے گہرے اور عمیق تقابلی مطالعے کو نصاب سازی میں اہمیت نہیں دی گئی، حالاں کہ اصول فقہ کے کلاسیکی دور میں جو نہایت اہم اصولی بحثیں فقہاء اور اصولیین کی مرکز توجہ بنی رہیں، اور جو مختلف اصولی مکاتب فکر کے قیام کا سبب بنیں، ان سے ان کے تاریخی تناظر میں روشناس کرانا بے حد اہم ہے، قرآن وسنت کا باہمی تعلق، خبر واحد کی حیثیت، استحسان، اجماع اور قیاس کا مقام، اہل مدینہ کا عمل وغیرہ، دراصل یہ وہ مباحث ہیں جو مختلف اصولی اور فقہی مکاتب فکر کو اصلاً ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں، ان مباحث کی توضیح کے بغیر علم اصول فقہ اور فقہ کی تاریخی وعلمی تناظر میں تفہیم ناممکن ہے۔

اسی طرح مقاصد شریعت جیسی اہم بحث اس نصاب سے بالکل غائب ہے، حالاں کہ مقاصد کا فلسفہ ایک ہمہ گیر فلسفہ ہے، اور اس کا اثر اصول فقہ کے کم وبیش تمام اہم مباحث پر پڑتا ہے، مقاصد شریعت کے حوالے سے شرعی احکام کے ظاہری ڈھانچے کے ابدی یا وقتی ہونے کا جو نقطہ معاصر اہل علم کی ایک بڑی تعداد پیش کر رہی ہے، وہ بجائے خود ایک بہت اہم اصولی بحث ہے، اور اس میں مخالف نقطہائے نظر کے تعارف کے ساتھ ساتھ ایک متوازن اور معتدل نقطے سے طلبہ کو متعارف کرانا بے حد ضروری ہے۔

مزید برآں اصول فقہ کی تدریس کے لئے جو کتب منتخب کی گئی ہیں، ان سے اس علم کے مباحث، ان کے تاریخی ارتقا اور بالخصوص اطلاقی علمی بحثوں کے ساتھ ان کے ربط کا کوئی مرتب اور منضبط تصور طلبہ کو نہیں ملتا۔

صرف ونحو:

صرف ونحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے،

زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بے کار ہیں، مفردات، الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئر کا فن، اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں، تو انجینئرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

اسی حوالے سے تنقید کا ایک پہلو یہ تھا کہ نصاب اور خاص طور پر طرز تدریس سالہا سال کی مشق اور مہارت کے باوجود طلبہ میں اظہار مافی الضمیر اور تحریر و انشاء کی صلاحیت پیدا نہیں کر پاتا، ماضی قریب میں عربی زبان کے نامور ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس صورتحال کا شکوہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک بڑی تعجب خیز اور ناقابل فہم بات ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتیں ان علوم و تصنیفات کے درس و مطالعہ میں صرف کرے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، لیکن اس زبان میں اظہار خیال سے بالکل معذور و قاصر ہو، زبانوں کے سلسلہ کا یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے، جو صرف ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی مجالس کی خصوصیت ہے۔

عربی زبان کی تعلیم کے ممتاز اور ماہر و متخصص مولانا محمد بشیر سیالکوٹی نے ان دونوں پہلوؤں سے موجودہ نصاب کے نقائص کو تفصیلاً واضح کیا ہے، ذیل میں ان کے تجزیے کے منتخب حصے نقل کئے جاتے ہیں:

''کمسن بچوں کی تعلیم و تربیت کی نصاب سازی میں تدریج کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ بچوں کو پہلے آسان اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دی جائے اور پھر اسے ان کی ذہنی سطح اور معیار کے مطابق درجہ بدرجہ ترقی دی جائے، اس وقت مدارس کے پہلے تعلیمی مرحلے میں مروجہ نحوی کتابوں کے مواد کا بڑا حصہ (تقریباً اسی فیصد) بچوں کے لئے نامناسب ہے۔''

اسلامی مدارس کے پہلے تعلیمی سال میں داخل ہونے والے چھوٹے بچوں کو علم نحو و صرف کی ایسی جامع کتابوں کی تدریس شروع کرادی جاتی ہے، جن میں تمام مباحث اور مسائل کی جزئیات مذکور ہونے کی بناء پر بچوں کے لئے نہایت مشکل اور پیچیدہ خیال کی جاتی ہیں، چنانچہ ہم ان کے ہاتھوں میں ابواب الصرف ،ارشاد الصرف اور علم النحو ، العوامل المائۃ (شرح مائۃ عامل) یا ترکیب جیسی خالص فنی کتابیں دیکھتے ہیں جن میں

(۱) ان علوم کے تمام مباحث اور مضامین درج ہیں، ان کا اسلوب بیان علمی اور فنی ہے، ایسی اصطلاحات مذکور ہیں، جنہیں کمسن بچے سمجھ نہیں سکتے۔

(۲) ان کے مضامین کے انتخاب میں بھی انہیں کمسن بچوں کی عمر اور سطح کے مطابق نہیں رکھا گیا اور

(۳) نہ ان کے مباحث اور مضامین کے اندراج ،ترتیب اور تقدیم و تاخیر میں کمسن بچوں کے لئے مناسب یا نامناسب ہونے کو ملحوظ رکھا گیا، بلکہ ان مشکل اور پیچیدہ مضامین کی ترتیب وہی ہوتی ہے جو بڑے تعلیمی مراحل کے طلبہ کے لئے ہوتی ہے۔

''ہماری درس گاہوں میں عربی زبان کی درسی کتابوں میں عملی استعمالات کی تمرینات موجود ہیں، اور نہ معلم ایسی مشق کراتا ہے، ہم پہلے سال ہی پورے علم الصرف کی کئی فنی کتابیں پڑھاتے ہیں، اور رٹواتے ہیں جن میں فن کے تمام مسائل مذکور ہوتے ہیں، ہم تین چار سال تک علم الصرف کی غیر عملی کتابیں رٹواتے رہتے ہیں، جن میں زندہ عربی زبان کو پڑھنے ، بولنے اور لکھنے کی تمرینات موجود نہیں ہوتیں، ہم پہلے سال ہی پورے علم النحو کی فنی کتاب کی تعلیم دیتے ہیں ؛ بلکہ دو تین کتابیں پڑھاتے ہیں، ہم نحو کی سات آٹھ ایسی کتابیں پڑھاتے ہیں جن میں عملی تمرینات موجود نہیں ہوتیں ،اور ان کی تدریس تین چار سال جاری

رہتی ہے۔ (درس نظامی کی اصلاح اور ترقی، ص: ۲۸۱،۲۸۱)

(۱) اس ضمن میں سفارش ہے کہ زبان کے جدید طرز تدریس اپنانے سے عربی زبان کا تناسب کم کیا جا سکتا ہے، اور علوم دینیہ کا تناسب بڑھایا جا سکتا ہے۔

(۲) زبانوں کی تدریس ابتدائی درجات میں شروع ہو جانا ضروری ہے، اس درجے میں اردو، مقامی زبانیں، عربی، فارسی اور انگریزی بولنے، پڑھنے، لکھنے کی مہارت سکھائی جائے، گرامر کو متوسطہ درجوں اور ادب کو ثانویہ درجوں میں شروع کیا جائے، عربی زبان میں صرف ونحو کی بنیادی تعلیم ثانویہ عامہ تک مکمل ہو جائے، تفصیلی تعلیم عربی زبان وادب میں تخصص کے درجات میں دی جائے، لکھنے اور بولنے کو صرف ونحو اور بلاغت اور ادب سے الگ کر کے ابتدائی درجوں میں کر دیا جائے، زبان کی تدریس کے جدید طریقے کو رواج دیا جائے، جو گرامر کی تفصیلات میں جائے بغیر روزمرہ بول چال پر زور دیتا ہے، گرامر میں بھی جو باتیں بنیادی اور ضروری ہیں اور پڑھنے، لکھنے اور بولنے کے لئے ان کا جاننا لازمی ہے ان کو دیگر تفصیلات سے الگ کرنا ضروری ہے، اور صرف ونحو اور بلاغت کے لازمی اور تخصص دو درجے کر کے اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں عرب ممالک اور عربی زبان سکھانے کے اداروں کے تجربات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) زبانوں کی تدریس میں اردو اور فارسی کے علاوہ ہندوستان کی مقامی زبانوں کو بھی شامل کیا جائے۔

علوم آلیہ:

(۴) علوم عقلیہ میں بعض علوم آلیہ ہیں جیسے منطق، اور بعض فکری جیسے فلسفہ اور کلام، درس نظامی میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ قدیم ہیں، اور آج کی منطق اور فکر کا ساتھ نہیں

دیتیں، یہ کتابیں جس وقت منتخب کی گئی تھی، وہ زمانہ کے عصری تقاضوں کو پورا کرتی تھیں، علوم کے ارتقاء کی وجہ سے یہ کتابیں نہ صرف علمی طور پر ناکافی ہوگئی ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر استدلال اور کلامی دفاع بھی مؤثر نہیں، درس نظامی کے اصول کے مطابق علوم آلیہ کی کتابوں کا انتخاب عصری ضرورتوں کے مطابق کیا جانا ضروری ہے۔

سفارشات:

(۱) علوم آلیہ یعنی منطق اور عقلی استدلال کی تعلیم کے لئے جدید کتابوں کو داخل نصاب کیا جائے۔

(۲) منطق اور عقلی استدلال کی ترتیب کے لئے علم الاختلاف کو بطور مضمون پڑھایا جائے۔

(۳) اصول فقہ کے جو ابواب استدلال اور اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو علوم آلیہ کے طور پر پڑھایا جائے۔

علوم عقلیہ:

(۵) علوم عقلیہ کی افادیت علوم آلیہ کی حیثیت سے ہی نہیں؛ بلکہ علوم عقلیہ کی مبادیات اور اصول علوم الہیہ اور علم الکلام میں علمی مسلمات کے اعتبار سے تسلیم کر لی گئی تھی۔

(٦) اس کے علاوہ بلاغت وسیاسیات اور دیگر علوم میں بھی یونان کے قدیم علوم کی کتابیں درس نظامی میں شامل کر لی گئی ہیں، آج ان علوم میں اتنی ترقی ہوئی ہے کہ قدیم کتابیں نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ ہمیں کائنات کو سمجھنے اور منطقی استدلال ترتیب دینے میں رکاوٹ بن رہی ہیں، ہمارے علم الکلام میں الجزء لایتجزی کو الہیاتی استدلال میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن ایٹمی نظریات نے نہ صرف جزء لایتجزی کے مفروضے کی نفی کر دی

ہے، بلکہ ایٹم کو تقسیم کر کے ایک نئی کائنات دریافت کر لی ہے۔

(۷) علوم عقلیہ میں پڑھائی جانے والی قدیم سائنسی معلومات پر مبنی کلامی اور فقہی استدلالات آج کے ذہن کے لئے نا قابل فہم ہیں، خصوصاً مابعد الطبعیات کے اکثر مسلمان اب مسلمان نہیں رہے، نہ یہ آج کی معقولات ہیں، ان علوم کو درس نظامی کا حصہ بنانے سے نہ صرف یہ کہ یہ دین کا حصہ بن جاتے ہیں؛ بلکہ طالب علم کے تصور کائنات کے اصول بن جاتے ہیں۔

سفارشات:

(۱) علوم عقلیہ کے حوالے سے ایسی قدیم کتابیں جن کی معلومات سائنس اور علوم کے بارے میں اب پرانی ہو چکی ہیں، متروک ہیں، ان کو نصاب سے خارج کر دیا جائے، ان کی جگہ جدید کتابیں داخل نصاب کی جائیں، اس میں عرب ملکوں میں علوم عقلیہ کے نصابات سے مدد لی جا سکتی ہے۔

(۲) علوم عقلیہ کو تخصصات، ایم اے میں رکھا جائے، ان مضامین کی تدریس میں جامعات اور مدارس میں تعاون اور اشتراک کے امکان پر غور کیا جائے۔

(۳) مزید براں سماجی علوم درس نظامی میں یا تو سرے سے شامل نہیں یا شامل ہیں تو ضمنی حیثیت سے، تاریخ، عمرانیات، بشریات، فلسفہ علوم اور علم نفسیات کو شامل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

علوم دینیہ:

(۱) علوم دینیہ کو علوم نقلیہ بھی کہا جاتا ہے؛ تاکہ ان کو علوم عقلیہ سے ممیز کیا جا سکے، اس لئے کہ دونوں کے اصول، مناہج استدلال اور مسلمات میں فرق کیا جاتا ہے، اسی لئے ان کی نصاب سازی اور اغراض و مقاصد میں بھی فرق ہے، تاہم تناسب اور دورانیے کے اعتبار سے

ان پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاسکی، درس نظامی کے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس کے منتہی کو علوم دینیہ پر اتنا عبور ہونا چاہئے کہ وہ اجتہاد کے اہل ہواور اس کی شرائط پوری کرتا ہو، کسی فقہی مذہب کا مقلد ہوتے ہوئے بھی ایک عالم کے لئے اجتہاد کی مطلوبہ بنیادی شرائط پر پورا اترنا لازمی ہونا چاہئے۔

(۲) قرآن مجید اور حدیث علوم دینیہ کے بنیادی مصادر ہیں، علم فقہ، علم الکلام تخصصات میں شمار ہوتے ہیں، تاہم قرآن مجید اور حدیث پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ علوم القرآن اور علوم الحدیث کی باقاعدہ تدریس ضروری ہے، اسی طرح فقہ میں بھی اصول فقہ کے علاوہ متعدد علوم تدوین پا چکے ہیں۔

(۳) درس نظامی میں علوم دینیہ کی تدریس میں توجہ مبادیات پر مرکوز رہتی ہے، اس لئے اکثر طلباء میں متوقع ذہنی وسعت اور علمی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، جو آج کی ضرورت ہے۔

سفارشات:

(۱) دینی کتب کی تدوین، ان کتابوں کی نوعیت (مختصر، مطول، شرح، حاشیہ، ذیل، تکملہ وغیرہ)، ان کی درجہ بندی (اصل، اصول، نوادر وغیرہ)، کتاب کے موضوعات کی ترتیب، ان کتابوں کی تدریس و تالیف، فہارس، مکتبات، لغت اور تراجم کی کتب، مخطوطات، وغیرہ کا تعارف نصاب میں شامل کیا جائے۔

(۲) کتاب پڑھنے کی مہارتیں درجہ ثانویہ میں متعارف کرادی جائیں، مثلاً کتابوں کے اہم نکات لکھنا، خلاصہ تیار کرنا، تبصرہ اور تنقید، اغلاط کی نشاندہی وغیرہ۔

(۳) کتاب کی تدریس کے وقت اس کے مصنف، اور متعلقہ علم یا فن میں اس کتاب کا مقام، اس کی تاریخ، اس کے مصادر وغیرہ کا تعارف و بیان ضروری ہے۔

(۴) علوم القرآن میں قرآن کریم کی تاریخ اوراصولی اورتاریخی مباحث کو نصاب میں شامل کیا جائے ،متن قران ،رسم المصحف ، اوراختلافات قرأت پر جدید تحقیقات سے روشناس کرایا جائے۔

(۵) اصول تفسیر کو باقاعدہ علم کے طور پر شامل کیا جائے،تفسیر کی تدریس میں تفسیر کے مناہج پرروشنی ڈالی جائے،تفسیر کے مدارس سے متعارف کرایا جائے ،مفسرین کے اختلافات اوران کے دلائل سے روشناس کرایا جائے۔

(۶) قرآن کریم اورتفسیر کے بارے میں جدید مباحث اوررجحانات ،حالیہ تحقیقات اورتفسیری ادب سے متعارف کرایا جائے۔

(۷) قرآن کریم سے متعلق تحقیقی کام کے لئے جوآسانیاں پیدا ہوئی ہیں،اس کے اشاریے،ویب سائٹ اوردوسرے ٹکنیکی وسائل سے واقف کرایا جائے۔

(۸) علوم حدیث میں مختلف رجحانات ،مباحث اورنئی تالیفات سے متعارف کرایا جائے،جرح وتعدیل کے علاوہ نقد متن حدیث اوردیگر علوم سے متعارف کرایا جائے۔

(۹) تدوین حدیث کی تاریخ،مدارس تدوین اورحالیہ کوششوں سے روشناس کرایا جائے۔

(۱۰) علم فقہ کی تدریس میں مختلف فقہی مذاہب کی کتابوں کوشامل کیا جائے۔

(۱۱) علم الفقہ کے ارتقاءاورتاریخ سے روشناس کروایا جائے۔

(۱۲) فقہی کتب کی تدریس کے وقت فقہاء کے اختلافات کومعروضی طور پر پیش کیا جائے ،ان کے دلائل اوراستدلال کوانہی کے مذہب کے لحاظ سے بیان کیا جائے۔

(۱۳) علوم فقہ کی تمام شاخوں کونصاب میں شامل کیا جائے۔

(۱۴) اصول فقہ کوالگ مضمون کے طور پر پڑھانے پراکتفاء نہ کیا جائے؛ بلکہ فروغ

فقہ کی تدریس کے وقت متعلقہ اصول فقہ بھی بیان کئے جائیں۔

(۱۵) علم الفقہ کی تدریس میں فتاوی کی تاریخ، اصول اور آداب سے بھی متعارف کرایا جائے۔

(۱۶) طلبہ کو عصری قانونی نظام، آئین، عدالتی نظام، بین الاقوامی قوانین سے روشناس کرایا جائے۔

(۱۷) فقہی موضوعات کی تعلیم میں فتاوی، قضاۃ کے فیصلوں اور حکمرانوں کے فرامین پر بحث کو شامل کیا جائے۔

(۱۸) دور حاضر میں مختلف ممالک میں جو قانون سازی ہوتی ہے، اس سے بھی متعارف کرایا جائے۔

دیگر سفارشات:

(۱) دینی اور اخلاقی تربیت پر زور دیا جائے۔

(۲) تدریس کے لئے محاضرات کے علاوہ دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جائیں، محاضرات کتاب کے بجائے موضوعات کو مرکز بحث بنائیں۔

(۳) تدریس میں سوال و جواب کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۴) علوم وفنون کی تدریس کے ساتھ ملکات اور مہارات کو بھی شامل کیا جائے، ان میں تحریر وتقریر، استدلال، تنقید وتبصرہ وغیرہ شامل ہیں۔

(۵) سائنسی مضامین، جدید علوم اور امتحانات کے حوالے سے دینی مدارس اور جامعات میں اشتراک اور تعاون کو فروغ دیا جائے۔

(۶) تحقیق وتحریر کی تربیت کے لئے اجتماعی تحقیقی منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی

جائے ،طلبہ کی مختلف ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کوفروغ دیا جائے۔

(۷) درس نظامی کے طلبہ میں انتظامی اہلیت پیدا کرنے کے لئے خصوصی عملی تربیت دی جائے،جس میں انتظامی امور،نظم وضبط کے اصول اورقوانین ، بجٹ،حسابات ، آڈٹ اوراکاؤنٹ شامل ہوں۔

(۸) تخصصات کے طور پر درس نظامی کے طلباءکوتدریس،خطابت،افتاءاورقضاء کے شعبوں کے حصول کے لئے الگ سے عملی تربیت دی جائے۔

●●●●●

مدارس کا نصاب ونظام تعلیم - چند گذارشات

دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشر کی طرف سے ۲۰۰۷ء میں ''مجلس مشاورت برائے تسہیل نصاب'' منعقد ہوئی تھی، اس موقع پر مدارس گجرات کے مہتممین وناظم تعلیمات حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ تقاضۂ وقت کے مطابق نصاب میں تبدیلی کب، کیسے اور کیوں کی جائے؟ ان کا حل تحریری شکل میں پیش فرمائیں، اس مناسبت سے یہ مقالہ تحریر کیا گیا تھا، بعدہ حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی صاحب اور حضرت مولانا یحییٰ نعمانی صاحب سے دارالعلوم ماٹلی والا میں اسی موضوع پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو ان کی طرف سے یہ مقالہ ماہنامہ ''الفرقان'' میں پیش کرنے کی دعوت دی گئی، لہٰذا مذکور ماہنامہ میں بھی یہ مقالہ شائع کیا گیا۔

از : مولانا مفتی اقبال محمد ٹنکاروی

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين.

اعوذ بالله من الشيطن الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون.

تفقہ فی الدین کے لئے عربی بولنے لکھنے کی نہیں بلکہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔اور لینذروا سے قوم کی زبان، عقائد، روایات اور استعداد سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۱) نصاب تعلیم کا مسئلہ محض نظری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری رواں دواں عملی

زندگی سے ہے۔

(۲) نصاب تعلیم پر غور کرتے وقت ہمیں ہندوستان کے حالات وضرورت کا جائزہ لینا ہے، ہمارا مسئلہ آزاد اسلامی ملکوں جیسا نہیں ہے، اس میں مقصد اور ضرورت دیکھنا ہے کہ پڑھنے والے کی عملی زندگی کے مستقبل کا میدان کیا ہوگا۔

(۳) آزادی کے بعد ہمارا بڑا مسئلہ دین اور علم دین کا تحفظ رہا ہے، ہمیں ہندوستان میں ہر سطح کی ضرورت کے آدمی ان درس گاہوں سے ملنے چاہئے، مدرّس، مفتی، محدث اور فنون پڑھانے والے، عربی اردو میں تقریر وتحریر کی صلاحیت والے خطباء، صحافی، امام ومؤذن اور مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر پڑھانے والے کی بھی ضرورت ہے۔

ان ضرورتوں کیلئے ہمیں درس نظامی کے مطابق چلنے والے مدارس ہی زیادہ کامیاب نظر آئے۔ملت کی زیادہ تر ضرورت (انہی مدارس کی بہت سی خرابیوں کے باوجود) ابتک پوری ہورہی ہے۔

(۴) قدیم وجدید دونوں کے حاملین پیدا کرنے کی کوشش اب تک ناکام ثابت ہوئی ہیں، حضرت مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے اس کی بہت ساری مثالیں پیش کی ہے، اور حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندویؒ نے بھی اس قسم کی کوششوں کو سطحی فرما کر لکھا ہے کہ اس سے دینی علوم کی ٹھوس صلاحیت پیدا کرنے سے طلبہ کی توجہ قدرے ہٹ جاتی ہے۔

(۵) فن میں کمال پیدا کرنے والی کتابیں رکھنی چاہئے۔

(۶) تربیت یافتہ مدرس رکھنے چاہئے، معلمین کی تدریب وتربیت ہونی چاہئے۔

(۷) کثرت مضامین سے پرہیز کیا جاوے۔

(۸) افسوس یہ ہے کہ ہمارے مدارس کے علماء کرام انہی کتابوں کا درس پسند کرتے ہیں

جن کی اردو شروحات موجود ہوتی ہیں۔اور اس میں بھی وہی مباحث زیر درس ہوں گے جو شروحات میں ہیں، اس فن کی امہات کتب کو بھول سے بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے، انہیں اس فن کی اہم کتب یا جدید عربی شروحات کا پتہ بھی نہیں چلتا یا اس سے دل چسپی ہی نہیں ہوتی، رسما کتاب پڑھا دی، فن سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

(۹) علامہ یوسف قرضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ مدارس اور جامعات میں آپ بہتر نصاب تو ضرور پائیں گے لیکن اچھا استاذ آپ کو نہیں ملے گا، اگر کوئی علمی نقطۂ نظر سے بہتر بھی ہو، تاہم ایمانی قوت و رہنمائی کے لحاظ سے مردہ دل ہوگا، یہاں قطر میں ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ ہم نے اسلامی علوم میں موضوع کے لحاظ سے بڑی عمدہ کتابیں لکھی؛ تاہم ان کتابوں کو ایسا استاذ میسر نہیں آیا جو انہیں تر و تازگی کے ساتھ زندہ جاوید طلبہ تک منتقل کر سکے بلکہ زندہ موضوع کو مردہ بنا دیا اور ان کے اپنے جمود سے نصاب کی حرارت کو بھی خاکستر کر دیا۔

(دینی مدارس:ص:۱۱۲)

(۱۰) نصاب پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اصل طریقۂ تعلیم بدل گیا ہے، قدیم زمانہ کے حضرات اساتذہ ایجاز و اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے ذہن نشین کر دیتے تھے، لمبی لمبی تقریروں سے استعداد خراب ہوتی ہے۔(دینی مدارس:ص:۱۱۱)

نصاب کی تبدیلی کے ساتھ جب تک طلبہ، اساتذہ اور منتظمین میں اپنے مقصد کی ڈھن نہیں ہوگی یہ تبدیلی کوئی مسئلہ حل نہیں کرے گی ،سادگی اور دین کا کام کرنے کی طلب کی وجہ سے ہی ہمارے بزرگوں نے چھوٹے چھوٹے دیہات میں قلت وسائل کے باوجود زندگیاں وقف کر دی، وہ چیز اب مفقود نظر آتی ہے بلکہ ہر سال فارغین کی اتنی کثیر مقدار کے باوجود

مکاتب کو ائمہ اور صدر مدرس نہیں مل رہے ہیں، لہذا انصاب کے ساتھ ہم اپنے کو بھی بدلنے کی کوشش کریں، اگر ہمارے اندر اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کی زندگی کا ہلکا سا اثر بھی آجائے تو مدرسوں کی دنیا بدل جائے، مطالعہ وتحقیق کا ذوق پیدا ہو، خدمت دین کا جذبہ ہو۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد اصل مقصود یعنی نصاب تعلیم کے سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

{۱} اردو فارسی کے نصاب کی سفارشات:

(۱) اردو کے پیچھے محنت کی جائے، مکاتب سے بچے کچے آتے ہیں، اردو کو لازمی قرار دیا جائے، اردو املاء اور تحریر کی طرف بھی توجہ دی جائے۔

(۲) فارسی اول- دوم میں مسائل کی آسان کتابیں تعلیم الاسلام، بہشتی ثمر، بہشتی زیور وغیرہ بھی رکھی جاوے تا کہ طلبۂ عزیز کی نماز وغیرہ صحیح ہو، خاص کر کے تراویح کے موقع پر اس کی ضرورت ہوتی ہے یا جبکہ طالب علم فارسی پڑھکر تعلیم منقطع کردے۔ اسی طرح بنیادی عقائد اور سیرت وغیرہ کے مضامین بھی آجائیں۔

(۳) اردو اچھی طرح پڑھے بغیر حفظ کے فورا بعد عربی اول کا درجہ نہ دیا جائے۔

(۴) فارسی قواعد میں حضرت مولانا مفتی سعید صاحب دامت برکاتہم کی آسان قواعد فارسی اول۔دوم رکھی جائے۔

(۵) گلستاں، بوستاں کے اخلاقیات والے چند ابواب پڑھائے جائیں، اس میں تکرار کے بجائے تدارک کا لحاظ کیا جائے۔

(۶) فارسی اول دوم میں فارسی کتابوں کا نصاب کم کر کے اردو اور عربی کی آسان کتابیں رکھی جائیں، جناب افضل حسین صاحب کی کتاب اردو زبان کی تعلیم، اسلام کیا ہے؟

اور حیات المسلمین، اردو زبان کی پہلی، دوسری، تیسری ڈابھیل کی مطبوعہ کتابیں زیادہ مناسب ہے۔

{۲} عربی نصاب کی سفارشات :

نحو وصرف اور ادب وانشاء:

(۱) ہر فن کی ابتدائی کتاب اردو زبان میں ہوتا کہ بیک وقت حل زبان، حل عبارت اور حل موضوع کا بوجھ سر پر نہ پڑے۔

(۲) عربی کی ابتدائی کتابوں کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہو، اس کے بعد عربی میں ہو۔

(۳) عربی نحو کی کتابوں کے انتخاب میں ان کتابوں کو ترجیح دی جاوے جن میں قواعد آسان انداز میں ہوں اور مثالیں زیادہ ہوں، دنیا کی تمام زبانوں کے قواعد (صرف ونحو) مشق اور مثالوں سے پڑھائے جاتے ہیں، تحریر وتقریر کی مشق، عربی میں ترجمانی اور اظہار مافی الضمیر میں جو چیز مفید ہے اس کا لحاظ کیا جاوے۔ نحو قاسمی، آسان نحو، تسہیل النحو، تدریب النحو، مذکرات فی النحو والصرف، تمرین النحو، معجم القواعد العربیہ، النحوالواضح ابتدائی، قرآن کریم کی مثالیں بھی دی جاوے، اس کے لئے مفتاح القرآن، محفوظات اور ارشادالطالبین، النحوالقرآنی وغیرہ کتب معاون ثابت ہوں گی۔

(۴) ابتدائی کتب پڑھانے والے اساتذہ کا ذی استعداد ہونا۔

(۵) نحو وصرف اور ادب کی ابتدائی کتب میں لسانیات کو ترجیح دی جاوے اور علوم وفنون کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

(۶) عربی زبان وادب کی تدریس میں عرب ممالک کے ماہرین تعلیم کی جدید تیار کردہ کتابوں سے مدد لی جائے۔

(۷) انشاء کی مشق کاپی میں لکھوانے کے بجائے درسگاہ میں ہی تختۂ سیاہ پر لکھوائی جائے یا زبانی یاد کروائی جاوے، اس میں سبق کم ہوگا لیکن مقصد حاصل ہوگا، ورنہ طلبہ دوسرے کی کاپی سے نقل کریں گے۔

(۸) سوال و جواب، تمرینات اور محاورے کے انداز کی کتابوں کو ادب وانشاء میں ترجیح دی جاوے۔

(۹) انشاء اور تمرینات کی کتابیں زمانے کے ذوق اور اسلوب کے مطابق ہوں، تاکہ عرب ممالک کی زبان، محاورات اور اسلوب وطرز تکلم وتحریر سے ربط باقی رہے، خلا پیدا نہ ہو۔

(۱۰) بقول حضرت مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم ''ادب کی درس وتدریس میں کوئی بجے تلے طریقہ کی پابندی کرنا مشکل ہے، اس میں اصل پڑھانے والے کی کڑھن اور فکر کو بڑا دخل ہے''۔

(۱۱) طلبۂ عزیز کو عربی کے بہترین اسلوب والے اصلاحی وادبی مجلّات اور رسائل حل کروانے کی مشق بھی کروائی جائے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بقول امیر شکیب ارسلان کے عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا وہ عصر حاضر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ، تعبیر اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

بلاغت ومعانی:

علم بیان میں دروس البلاغۃ کو تلخیص کے بجائے رکھا جائے، مختصر المعانی سے عملی فائدہ کم ہوتا ہے، اس کے بجائے اسرار البلاغۃ علم بیان میں اور دلائل الاعجاز علم معانی میں جو مختصر المعانی سے بھی

قدیم کتابیں ہیں، ان میں فن بلاغت مستقلا مدوّن کیا گیا ہے اور قواعد کلیہ بیان کئے ہیں، یہ پڑھائی جائیں، بطور مشق کے البلاغة الواضحة اور المنهاج الواضح للبلاغة اور اردو میں تسہیل البلاغة بھی مفید ہے، ابن قیمؒ کی **المشوق الی علوم القرآن** اور علامہ باقلانی کی اعجاز القرآن بھی بہت اچھی کتابیں ہیں، جن میں قرآنی آیات کو بطور مثالوں کے پیش کیا گیا ہے۔

علامہ رشید رضا مصری کی رائے:

مشہور مصری فاضل مفتی محمد عبدہ کے شاگرد علامہ رشید رضا نے اپنے فاضلانہ خطبہ صدارت میں جو انہوں نے اجلاس ندوۃ العلماء (۱۹۱۲ء) میں دیا تھا، قدماء کے طرز تصنیف پر روشنی ڈالنے کے بعد (جس میں فن کی تحصیل و تسہیل پر زور دیا جاتا تھا) فرمایا:

''پھر ہمتیں پست ہوگئیں اور تحقیقات کا شوق دھیما ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی کتابوں کے خلاصے لکھے جانے لگے جس میں مختلف علوم کے ضروری قواعد اور مسائل مختصر عبارت میں بیان کئے جاتے تھے، اور ان کے ساتھ مثالیں اور دلیلیں درج نہیں کی جاتی تھیں، پھر اختصار کی لے یہاں تک بڑھی کہ ایک مصنف کسی مسئلہ کو ایک وقت جس مختصر عبارت میں لکھتا تھا، دوسرے وقت خود اس کو نہ سمجھ سکتا تھا، اس کے بعد وہ زمانہ آیا جس میں ان خلاصوں کی شرحیں اور شرحوں کی شرحیں لکھی جانے لگیں، اور رفتہ رفتہ ان شرحوں پر بھی حاشیے چڑھنے لگے، اس زمانے میں طریقہ تعلیم یہ نکلا کہ کسی فن کی کتاب استاد کے ہاتھ میں ہے اور شاگرد اس کے روبرو اول اس کتاب کا متن پڑھتے ہیں، پھر اس کی شرح پھر اس کا حاشیہ، اس کے بعد استاد تقریر کرتا ہے، ان تمام کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ایک مختصر کتاب کی عبارت سمجھ میں آجائے اور اس عبارت کے حل کرنے کے لئے اوروں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سمجھ لیا جائے''۔

فن بلاغت ومعانی کا زوال اور اصلاح کی کوشش:

اس کے بعد فن بلاغت ومعانی وبیان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’اسرار البلاغۃ شیخ عبدالقاہر جرجانی کی تصنیف ہے اور علم بیان کے مسائل اس میں بیان کئے گئے ہیں، دلائل الاعجاز بھی ایک ایسی ہی کتاب علم معانی میں ہے، ان دونوں کتابوں کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ طریقۂ تصنیف اور طریقۂ تعلیم کو زمانہ مابعد میں کس قدر تنزل ہوا ہے، یہ پہلی کتابیں ہیں جن میں فن بلاغت مستقل طور پر مدون کیا گیا ہے، اور اس میں کلیہ قاعدے بیان کئے گئے ہیں، یہ کتابیں ان کتابوں سے کہیں زیادہ افضل اور مفید ہیں جو ان کے بعد اور ان ہی کی مدد سے لکھی گئیں، اور درس میں جاری کی گئیں، مثلا مفتاح سکاکی ومختصر علامہ تفتازانی، ان کے بعد کی کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ممالک اسلامیہ کے مدارس میں عربی زبان کی بلاغت مردہ ہوگئی ہے، میں نے اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے حجاز، عراق اور قسطنطنیہ میں اسرار البلاغہ اور دلائل الاعجاز کی تلاش کرائی اور جب ان کتابوں کے نسخے مل گئے تو ان کی تصحیح کی اور ان کو چھپوایا، شیخ مرحوم نے ان کتابوں کا درس جامع ازہر میں دیا اور بہت سے طلبہ ان کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ازہر میں عربی زبان کی فصاحت وبلاغت از سرنو زندہ ہوگئی، حالانکہ اس سے پہلے وہ مرچکی تھی۔ (خطبہ صدارت علامہ سید رشید رضا در اجلاس سیزدہم ندوۃ العلماء ۱۹۱۲ص:۲۸، ۳۰،بحوالہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص:۱۴۹-۱۵۰)

منطق:

منطق میں آسان منطق، مرقات اور شرح تہذیب کافی ہے، اس میں بھی طلبہ کو کتاب کی مثالوں کے علاوہ خارجی مثالوں سے فن کو زندہ رواں دواں شکل میں رائج بتایا جاوے۔

حکمت:

قدیم فلسفہ میں معین الفلسفہ اور ھدایت الحکمت کافی ہے، اس کے ساتھ فلکیات جدیدہ فہم الفلکیات، علم جدید کا چیلنج، عقلیات اسلام، مذہب اور سائنس اور جنرل نالج کے عنوان سے چھپی ہوئی کتابیں مفید ہوگی۔

عقائد:

عقائد میں عقیدۃ الطحاوی، شرح عقائد کے علاوہ دار العلوم دیوبند سے چھپے ہوئے محاضرات جس میں یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، قادیانیت، شیعیت، رضاخانیت، مودودیت اور غیر مقلدیت کا تعارف کرایا گیا ہے وہ بھی بہت مفید ہے، اسی طرح عرب مما لک سے الادیان والفرق اور الغزوالفکری کے عنوان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور الانتباھات المفیدۃ اور عقلیات اسلام کے نام سے اس کی تشریح کی گئی ہے وہ بھی مفید ہوگی۔ مولانا یوسف خان جامعہ اشرفیہ لاہور کی کتاب تقابل ادیان جو دہلی سے شائع ہوئی ہے اس میں اسلام کے علاوہ تیرہ ۱۳/مذاہب کا تقابل مطالعہ جدید اسلوب میں کیا گیا ہے۔

حضرات اساتذہ کرام کو جدید مغربی فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، اصول قانون وغیرہ سے خود بھی واقفیت رکھنی چاہیئے اور طلبہ کو بھی اس سلسلہ کے مضامین پڑھاتے وقت جدید نظریات، ان کے اسلام مخالف ہونے کی صورت میں ان کی تردید، کمزوری، نقصانات وغیرہ بتا کر اسلام کی ہمہ گیری وہمہ جہتی فوقیت، احکام اسلام کی پختگی وغیرہ سے طلبہ کے ایمان اور علم میں رسوخ پیدا کیا جاوے۔

اب اردو عربی میں بہت سی کتابیں ان مضامین کی آچکی ہیں، جن میں مغربی مفکرین، مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات وغیرہ مذکور ہیں، مدارس کے کتب خانہ نیز طلبہ کے دار المطالعہ میں یہ کتابیں رکھی جائیں۔

جدید فلسفہ اور علم الکلام:

مدارس کے نصاب میں یونانی فلسفہ کی دو کتابیں ھدایت الحکمت اور اس کی شرح میبذی یا ھدیۂ سعیدیہ پڑھائی جاتی ہیں، اس میں بہت سی باتیں کافی مفید ہیں، لیکن کچھ ابحاث جدید فلسفہ اور سائنسی تجربات ومشاہدات کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکی ہیں، اسی طرح کچھ افکار کا اب موجودہ دنیا میں کوئی قائل ہی نہیں رہا ہے، دوسری طرف یورپ کی نشأۃ ثانیہ نے جدید افکار وملحدانہ نظریات کی بھر مار لگا دی ہے؛ لہذا ضرورت تھی کہ جدید فلسفہ سے ہمارے طلبۂ عزیز واقف ہوں کیونکہ لادینی نظام تعلیم میں نیوٹن اور ڈارون کے ملحدانہ خیالات ہی پڑھائے جاتے ہیں، ہمارے طلبہ عزیز وعلمائے کرام کو غیر مسلم یا مسلمان تعلیم یافتہ حضرات سے جب سابقہ پڑتا ہے تو اسی قسم کے اشکالات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے طلبہ یورپی واسلامی فکر کا اعتقادی وتاریخی فرق نہیں جانتے ہیں، اسی طرح اس جدید فلسفہ کے افکار ونظریات کی بنیادی وجوہات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں لہذا ان کے لئے تعلیم یافتہ حضرات کا جواب دینا مشکل ہوجاتا ہے۔

اس لئے بندہ نے جدید فلسفہ وفکر کی اعتقادی، تاریخی وسائنسی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف جدید وقدیم کتابوں سے کچھ مضامین کو جمع کیا ہے جس میں ان کے اشکالات کے ساتھ ساتھ عصری زبان میں ان کے جوابات (جدید علم کلام) دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت مولانا زاھد الراشدی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

معقولات کے حوالے سے جب عقائد کے مختلف پہلوؤں پر بحث ومباحثہ شروع ہوا تو ایک دور تک اس کے مسائل کی نوعیت اس طرح تھی کہ اللہ تعالی کی رؤیت ممکن ہے یا نہیں؟ اللہ تعالی کی ذات اور اس کی صفات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ قرآن کریم اللہ تعالی کی صفت ہے یا

اس کی مخلوق؟ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کوئی مسلمان ایمان کے دائرے سے نکل جاتا ہے یا نہیں؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوجانے سے، ان کی نیابت امامت کے حوالے سے ہوگی یا خلافت کے عنوان سے ہوگی؟ وغیرہ ذلک۔ اُس دور میں اِس علم یا فن کو ''فقہ'' کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اور فقہ صرف احکام وقوانین تک محدود نہیں ہوتی تھی بلکہ ایمانیات یعنی عقائد اور وجدانیات یعنی تصوف وسلوک بھی فقہ ہی کے شعبے شمار ہوتے تھے، چنانچہ عقائد پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا رسالہ ''الفقہ الاکبر'' کہلاتا ہے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ عقائد کے اس عقلی مباحثے کو علم التوحید والصفات، علم النظر والاستدلال اور علم اصول الدین بھی کہا جاتا تھا۔ چونکہ ان مسائل پر عام طور پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا اور اس مباحثہ میں معتزلہ پیش پیش ہوتے تھے، اس لیے شہرستانی کے بقول سب سے پہلے معتزلہ نے اسے ''علم الکلام'' کا نام دیا، مگر اہل سنت کے اکابر علماء نے اسے پسند نہیں کیا، چنانچہ اصول فقہ کی متداول کتاب ''التوضیح والتلویح'' کے محشی نے نقل کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرو بن عبید کو تباہ کرے کہ اس نے کلام کا دروازہ کھولا ہے، امام ابو یوسفؒ نے فتویٰ دیا کہ متکلم کے پیچھے نماز جائز نہیں، امام احمد بن حنبلؒ نے اس کی مذمت کی اور امام شافعیؒ نے اسے شرک کے بعد بدترین برائی سے تعبیر کیا، لیکن رفتہ رفتہ یہ بحث ومباحثہ آگے بڑھتا گیا اور ان علمائے اسلام نے بھی جو اس بحث وکلام کو پسند نہیں کرتے تھے اسلامی عقائد کی عقلی وضاحت اور اثبات کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے اپنے علمی معمولات میں شامل کرلیا، چنانچہ علم الکلام کے نام سے ایک پورا نصاب ہمارے دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

ہمارے علم العقائد والکلام کے بیشتر مباحث یونانی فلسفہ اور ان کے ساتھ ساتھ ایرانی، ہندی اور قبطی فلسفہ کے ساتھ ہمارے علمی تعارف کی پیداوار ہیں اور ہمارے یہاں اسے

''معقولات'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ خود اس فلسفہ کی اپنی ہیئت تبدیل ہو چکی ہے اور ارتقائی مراحل نے اس کی شکل و صورت تک بدل کر رکھ دی ہے۔ مثلا ماضی میں سائنس کو معقولات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اور وہ فلسفہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی، چنانچہ ہمارے یہاں فلکیات اور طبعیات کو معقولات ہی کے ایک حصہ کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، جب کہ سائنس ایک عرصہ سے فلسفہ و معقولات سے الگ ہو کر ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اب وہ معقولات اور فلسفہ کا حصہ نہیں ہے بلکہ مشاہدات و محسوسات کے دائرے میں شامل ہو چکی ہے۔

اس لئے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ عالمی افق پر گذشتہ تین صدیوں کے درمیان رونما ہونے والی علمی تبدیلیوں اور خاص طور پر فلسفہ، سائنس اور عمرانیات کی انسانی ذہنوں پر حکمرانی سے پیدا شدہ صورت حال میں ہمیں ''علم العقائد والکلام'' (بلکہ اس سے زیادہ اہم فلسفہ) کے نصاب کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا۔ اسکا مطلب عقائد میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ ان کی تعبیرات و تشریحات کے اسالیب اور ترجیحات کی ازسرنو تشکیل ہے جو وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ماضی میں یونانی اور دیگر فلسفوں کی آمد پر ہم نے اپنے عقائد پر پوری دل جمعی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے ان کی علمی و عقلی توجیہات و تعبیرات کا ایک نظام تشکیل دیا تھا جس کے ذریعہ ہم نے اپنے عقائد و ایمانیات کے خلاف فلسفہ و معقولات کی یلغار کا رخ موڑ دیا تھا، آج بھی اسی کام کے احیاء کی ضرورت ہے اور عقائد و ایمانیات کے باب میں جدید فلسفہ، سائنس اور عمرانیات کے پیدا کردہ مسائل اور اشکالات کسی اشعری، ماتریدی، ابن حزم، غزالی، ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہؒ کی تلاش میں ہیں، جو ظاہر ہے کہ انہی مدارس کی کوکھ سے جنم لیں گے، اس لیے دینی مدارس کو اس پہلو سے اپنے ''بانجھ پن'' کے اسباب کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے اور ان کے علاج کا اہتمام کرنا چاہئے کہ

ان کے ذمہ آج کے دور کا سب سے بڑا قرض یہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی بطور نمونہ عقائد وایمانیات سے تعلق رکھنے والے چند سوالات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو آج کے علمی تناظر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں میں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں اور ان کے قابل اطمینان جوابات فراہم کرنا ہماری اسی طرح کی ذمہ داری ہے جس طرح ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی نے اپنے دور کے علمی چیلنج کا منطق واستدلال کے ساتھ سامنا کیا تھا:

- انسان کو جب نفع ونقصان کے ادراک کے لئے عقل دی گئی ہے تو پھر مذہب کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے؟
- وحی کی ماہیت کیا ہے اور کیا یہ انسانی عقل ووجدان سے ہٹ کر کوئی الگ چیز ہے؟
- وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے؟
- انسانی سوسائٹی جب مسلسل ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے تو نبوت کا دروازہ درمیان میں کیوں بند ہو گیا ہے؟
- سائنس اور مذہب کا باہمی جوڑ کیا ہے؟
- مذاہب کی مشترکہ صداقتوں پر یکساں ایمان رکھنے اور ان کے مشترکہ مصالح پر مشتمل احکام پر عمل کرنے میں کیا حرج ہے اور کسی ایک مذہب کی پابندی کیوں ضروری ہے؟
- سوسائٹی کے ارتقاء اور تجربات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے افکار ونظریات اور تہذیب کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟
- قرآن وسنت کے معاشرتی احکام اس دور کی عرب ثقافت یا رواجات کے پس منظر میں تھے یا اس سے مختلف ثقافتوں کے ماحول میں بھی واجب العمل ہیں؟

■ احکام وقوانین میں مصالح ومنافع اور اہداف ومقاصد معتبر ہیں یا ظاہری ڈھانچہ بھی ضروری ہے؟

■ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا تعالی کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ وغیرہ ذلک۔

یہ مسائل نئے نہیں ہیں بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی عنوان سے زیر بحث رہے ہیں؛ لیکن آج کے عالمی تناظر میں یہ زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں اور ایک مسلمان کو اسلامی اعتقادات اور ایمانیات کے معیار پر باقی رکھنے کے لئے ان سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے ایسے جوابات ضروری ہیں جو آج کے علمی تناظر اور ہمہ نوع معلومات کے افق میں قابل اطمینان ہوں۔

مولانا عبدالباری ندویؒ اس سلسلے کی جدید کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

دوسری قوموں کی طرف سے عقلی وفکری، سیاسی، اخلاقی ومعاشرتی، تہذیبی وتمدنی کسی پہلو سے اسلام پر جو شکوک وشبہات ظاہر کیے جائیں ان کو تحریر وتقریر کے ذریعہ دور کیا جائے، اس سے معاندین پر حجت قائم ہوگی، اور حق پسندوں کو یہ شکوک قبولِ حق میں مانع نہ ہوں گے، اس خدمت کے لیے فرض کفایہ کے درجہ میں ایک ایسی جماعت کا مسلمانوں میں موجود رہنا ضروری ہے جو غیر مسلموں کے ایسے علوم وفنون، افکار ونظریات سے اچھی طرح واقف ہو، جن کا اسلامی عقائد واعمال، اصول وفروع پر نفیاً واثباتاً کسی طرح کوئی اثر پڑتا ہو؛ تاکہ ان کی تردید یا ان سے تائید کا کام لے سکے، ہمارے قدیم متکلمین یہی خدمت انجام دیتے تھے۔

عہد حاضر میں بھی اس خدمت کے لیے حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ ”کچھ وہ لوگ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو (جیسے نو تعلیم یافتہ یا انگریزی داں مسلمان) یا سرے سے غیر مسلم ہوں۔“

اسی طرح ''دوسری قوموں کے شبہات سے اسلام کو جس مضرت کا اندیشہ ہے'' اس سے بچانے کو حضرت نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج یہ بہت بڑا فرض کفایہ ہے، فرنگی سائنس و فلسفہ، علوم وفنون، تہذیب و تمدن و سیاسیات و معاشیات کی راہ سے جو شکوک و اعتراضات راہ پا گئے ہیں اور پاتے رہتے ہیں، یورپ کے حاکمانہ غلبہ کی مرعوبیت اور نت نئی سائنسی ایجادات و اکتشافات کی ہیبت نے ان کے زہر کو خصوصًا بہت تیز کر دیا ہے، جدید تعلیم کے اثر سے یہ زہر تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کرتا ہے، اور مزید یہ کہ سیاسی و تہذیبی قیادت بھی چوں کہ ساری دنیا میں اسی طبقہ کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔

قدیم وجدید فلسفہ میں فرق:

یونانی فلسفہ وحکمت سے مرعوبیت نے مسلمانوں کی سیاسی واقتداری قوت وسطوت کے عین شباب میں ایک تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر قبضہ پالیا تھا؛ لیکن اس وقت اول تو اس طبقہ کے ہاتھ میں عام مسلمانوں کی قیادت وحکومت نہ تھی، دوسرے یونانی فلسفیات سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات زیادہ تر عقائد کے دقیق مسائل تک محدود تھے، سیاسیات ومعاشیات، تہذیب وتمدن جن کا اثر عوام وخواص کے سارے طبقات پر پڑتا ہے، ان کے بھیس میں لادینی نظریات وتصورات کی دعوت واشاعت نہ ہوتی تھی، آج ذہن پہلے ان ہی راستوں سے مسموم ہوتا اور بالآخر غیر شعوری طور پر ایمان وعمل سب کو لے ڈوبتا ہے، یونانیات کے مقابلہ میں اگر ہمارے علماء ومتکلمین کو زیادہ تر صرف ایمانیات کے ایک محاذ کا سامنا تھا، تو آج انفرادی واجتماعی، سیاسی ومعاشی، تمدنی وثقافتی غرض زندگی کے ہر ہر محاذ پر مسلح ہونے اور رہنے کی ضرورت ہے۔

اس لئے وہ سائنسی نظریات جس کا تعلق عقائد و معاشرت سے ہے ان کا صرف اجمالی ذکر کر کے ''جدید فلسفہ و علم الکلام'' میں ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا عبدالباری ندویؒ اس سلسلے میں رقمطراز ہے:

سائنس کی عملی تعلیم درکار نہیں، البتہ سائنس کا فلسفہ و مذہب سے فرق و تعلق، اس کی تحقیق ورسائی کی تجدید ،طبیعیات، حیاتیات اورفلکیات وغیرہ کے خاص خاص ایسے نظریات ومعلومات، جن کا مذہب پر سلبی وایجابی کوئی اثر پڑتا ہو، مثلاً مادہ کی ساخت ونوعیت، حیات کی حقیقت وماہیت، ارتقاواضافیت وغیرہ کی محض نظری تفہیم وتشریح، جدید فلسفہ خصوصًا تصوریت (آئیڈیلزم) اورعلمیات (اپسٹما لوجی) کے مباحث سے پوری واقفیت ضروری ہے۔

قدیم فلسفہ کی اصطلاحات سے واقفیت:

منطق ،فلسفہ وکلام کا اس قدر جزءِ شریک نصاب رہنا مناسب ہوگا کہ ان کے مسائل اور اصطلاحات وتعبیرات سے ذہن مانوس ہوجائے اور اولاً تو خود ہمارے دینی علوم تفسیر، حدیث وفقہ میں ان تعبیرات واصطلاحات سے تقاضائے وقت کی بنا پر اسی طرح کام لیا گیا تھا، جس طرح آج رائج الوقت اصطلاحات وتعبیرات سے دینی مضامین میں بے تکلف لیا جاتا ہے اور جن سے بالکلیہ ناآشنارہ کر اسلاف کے ان خاص وخالص دینی کارناموں سے بھی پوری طرح استفادہ دشوار ہے۔ دوسرے راقم ہٰذا کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان سے ذہن کی تشحیذ وتربیت کا نفع خاصا ہوتا ہے، ایسا نفع کہ خود جدید خیالات وعقلیات کی فہم وتفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے؛ بالخصوص قدیم علمِ کلام کے اصول ومبادی سے تو آج جدید کلام کی تدوین میں بڑا کام لیا جاسکتا ہے، جس کا اندازہ خود حضرت حکیم الامتؒ کے مختصر رسالہ ''**الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ**'' سے کیا جاسکتا ہے۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ: ص/ ۲۱۸ تا ۲۲۴)

خلاصۂ مضامین کتاب:

''جدید فلسفہ وعلم الکلام''میں بندہ نے انہیں خطوط پر مختلف مضامین کو جمع کیا ہے، تمہیداور مقدمہ کے عنوان سے قدیم فلسفہ وعلم الکلام کی مختصر تاریخ کے ساتھ جدید فلسفہ کے بنیادی اصول اور مادہ کے سلسلے کی جدید تحقیقات کا بھی اجمالی ذکر کیا ہے۔

اوراصل کتاب میں اسلام اور سائنس کے تعلقات، نیز عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعدترکی سلاطین کا سائنسی علوم سے بے تعلق ہونا اور اسکے نتیجے میں اسلامی دنیا سے سائنس کا رخ یورپ کی طرف ہوجانا،لیکن یورپ کی مسیحیت کا سائنس کو مذہب کے لئے رکاوٹ سمجھ کر اسکا شدیداحتساب کرنا،سائنس دانوں کو مذہب سے متنفرکرکے مادیت کی طرف لے جانے کا سبب بننا،اور پھر مذہبی الحادی سائنس کا روحانی ،اخلاقی اقدار سے عاری ہوکر دنیا میں فساد مچانے کا ذکرکیا ہے۔اس کے بعد سائنس کی تعریف،اقسام اور نیوٹن وڈارون کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا تفصیلی جواب دیا گیا ہے، اس ضمن میں مشاہدہ وتجربہ کی حقیقت ، اصول تعلیل ،نظریۂ کوانٹم ،ایٹم کے سلسلے کی نئی تحقیقات ،انسان کے بارے میں سائنس کی عدم معلومات وغیرہ کا ذکرکیا گیا ہے۔

عقائد میں حق سبحانہ وتعالی کے وجود پر کائناتی شہادتیں ،دلیل موت وآخرت، اثبات رسالت ،قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے کے دلائل ،مذہب اور تمدنی مسائل (اصول قانون)اوراسلام کا معاشرتی نظام ،معیشت کا اشتراکی وسرمایہ دارانہ نظام اوراسلامی معیشت کے بنیادی اصول، سیاست کے مختلف نظام واسلامی خلافت کا نظام اوروحدت ادیان وغیرہ تمام مضامین پر تفصیلی سائنسی دلائل سے ہی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے،(معین الفلسفہ سے) قدیم فلسفہ کی چندضروری اصطلاحات کا بھی ذکرکیا گیا ہے،تا کہ طلبۂ عزیز قدیم تفسیر

وعقائد کی کتابیں پڑھتے وقت ان اصطلاحات سے بالکل نا آشنا نہ ہوں، اور اسی مناسبت سے حضرت تھانویؒ کی کتاب الانتباہات المفیدۃ سے اصول موضوعہ، انتباہات اور کچھ عقلی وسائنسی اشکالات کے جواب دینے کے اصول بھی نقل کئے ہیں۔

فقہ:

فقہ کی کتابوں میں نور الایضاح یا الفقہ المیسر ، قدوری اور ھدایہ میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، علم الفرائض میں مواریث کے عنوان سے شائع ہونے والی کتابوں کے انداز اور مثالوں کو بھی دیکھنا چاہئے ،فقہ کی کتابوں کے نصاب کو ترتیب دینے کی بہت ضرورت ہے، ہر کتاب کتاب الطہارت سے شروع ہوتی ہے اور ابتدائی کتابوں میں بھی وہ اختلافات بیان کئے جاتے ہیں جو ھدایہ وغیرہ میں پڑھانے ہوتے ہیں، تکرار سے بچ کر تمام مباحث کے احاطہ کی کوشش کرنی چاہئے ،غیر ضروری مباحث سے پرہیز کیا جاوے، اس میں مقدار خواندگی کی تکمیل نہیں ہوتی ہے، حضرت نانوتویؒ کی خصوصی وصیات میں مقدار خواندگی کی تکمیل پر خاص توجہ دی گئی اور حضرت نے تکمیل پر ظاہری ومعنوی برکات کی اطلاع دی ہے۔

عربی دوم میں نور الا یضاح یا الفقہ المیسر کے بعد قدوری کے ابواب النکاح والطلاق پڑھائے جاوے؛ تاکہ عربی سوم میں اصول الشاشی میں خاص وعام کی بحث کی تفریعات ومثالیں آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

قدوری میں باب البیوع سے لیکر اخیر تک کے تمام مضامین نفس مسئلہ بیان کرتے ہوئے طلبہ کو پڑھائے جاوے۔اور مشق کے لئے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کی کتاب التسهيل الضروری لحل مسائل القدوری رکھی جاوے جس میں عربی میں ہی سوال وجواب بہت اچھے انداز میں پیش کئے ہیں۔

ھدایہ کا حق کما حقہ ادا نہیں ہوتا ہے، لہذا عربی چہارم میں شرح وقایہ پڑھانے کے بجائے ھدایہ کو ہی ۲ حصوں میں تقسیم کیا جاوے اور دو حصے عربی چہارم میں، دو عربی پنجم میں اور دو عربی ششم میں رکھے جاوے۔ یہ کتاب کسی ایسے مفتی کو ہی پڑھانے کے لئے دی جاوے جن کو افتاء کی اچھی مشق ہو۔ ساتھ میں ان کو مکلف کیا جاوے کہ نصاب کا اختصار اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ کتاب کا حق صحیح ادا کرتے ہوئے طلبہ عزیز کو جدید مسائل سے واقف کرائیں۔ اس کے لئے جواہر الفقہ، فقہی مقالات اور فقہ اکیڈمیوں کے تمام مجلّات و فیصلے اور ھیئۃ کبار العلماء (سعودی عربیہ) کے فیصلے اور دیگر کتب فتاوی کی مراجعت کرتے ہوئے ھدایہ کے ابواب کے متعلق جدید مسائل سے طلبۂ عزیز کو واقف کریں۔ حوالے اور امہات الکتب نیز جدید فقہ و اصول فقہ سے بھی طلبہ کو روشناس کرائیں۔

عبادات کے مسائل کے علاوہ معاملات، معاشرات، معیشت، بینکنگ، وقف، حظر و اباحت وغیرہ مسائل جن کی کثرت سے ضرورت پڑتی ہے وہ ابواب پڑھائے ہی نہیں جاتے ہیں یا سرسری طور پر ان سے گزر جاتے ہیں، جبکہ دار الافتاء میں اور روزمرہ کی ضرورت میں مفتی حضرات کو ان سے ہی زیادہ سابقہ پڑتا ہے، اسی طرح ھدایہ اول سے پہلے رسم المفتی کو درس میں رکھا جاوے تاکہ طالب علم حنفی مذہب کے طبقات کتب اور فتوی کے مدارج کو بھی سمجھ سکے۔ ھدایہ کے درس میں جدید فقہی مباحث پر بھی گفتگو ہو، جس باب کے مناسب جدید مسائل ہوں ان کو وہاں ذکر کیا جاوے، اس کے لئے جواہر الفقہ، فقہی مقالات اور مختلف فقہی اکیڈمیوں کے فیصلے اساتذہ کے پیش نظر ہوں۔

اصول فقہ:

اصول فقہ میں اصول شاشی سے پہلے آسان اصول فقہ یا تسہیل اصول الفقہ پڑھائی

جاوے اور بعد میں اصول شاشی، نور الانوار اور حسامی رکھی جاوے۔اصول فقہ میں ان کتابوں کے علاوہ قیاس، استحسان، اجتہاد، مصالح مرسلہ، عرف و عادات، استصلاح، استصحاب، سد ذرائع، تقلید، تلفیق وغیرہ موضوعات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے؛ جو فقہ کی تشکیل جدید اور نئے مسائل کے حل کیلئے بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے لئے حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب کی الموجز اور شیخ ابوزہرہ، شیخ خلاف اور شیخ خضری بکؒ کی اصول فقہ اور دیگر بہت سے رسائل مستقل عناوین کے ساتھ عرب ممالک سے شائع ہوئے ہیں۔

مدارس اسلامیہ کے اصول فقہ کے نصاب میں اجتہاد اور تقلید و تلفیق کے مضامین عموماً پڑھائے نہیں جاتے، نور الأنوار میں ادلۂ ثلاثہ (کتاب وسنت اور اجماع) سے ہی بحث ہوتی ہے، اور حسامی میں اگر چہ باب القیاس ہی پڑھایا جاتا ہے، لیکن اسمیں قیاس کی شرطیں اور ائمہ کرام کے طریقۂ استدلال پر ہی زیادہ (مناظرانہ انداز میں) گفتگو کی جاتی ہے۔

شعبہ افتاء کے نصاب میں اگر چہ رسم المفتی، مقدمۂ رد المحتار اور الأشباہ والنظائر میں ضرورت وحاجت کے ضمن میں مسائل کو ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن اس کے حدود وشرائط پر تفصیلی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔

اللہ تعالی جزائے خیر عطاء فرمائے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو کہ آپ نے مسئلۂ مفقود الخبر میں مالکی مذہب پر فتوی دینے کے ضمن میں افتاء بمذھب الغیر کے مسئلہ کو اٹھایا اور اپنی معرکۃ الآراء کتاب الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ میں اس کے قواعد وشرائط کو اجمالاً نقل کرتے ہوئے علامہ شامیؒ کی رسم المفتی اور مقدمۂ شامی کی عبارتوں کی مکمل وضاحت فرمائی، اور علامہ شامیؒ کی عبارتوں سے جن حضرات نے استدلال کرتے ہوئے

مسئلہ مفقود الخبر میں مالکی مسلک پر عمل کرنے سے انکار کیا تھا، حضرت حکیم الامتؒ نے علامہ شامی کی ان ہی عبارتوں کی ایسی دل نشین تقریر فرمائی کہ وہ خود حضرت تھانویؒ کے مستدلات میں سے ہو گئیں۔

واضح رہے کہ دوسرے ائمہ کے مسلک پر فتویٰ دینے کے سلسلے کے اصول وضوابط مجموعی طور پر ائمہ اربعہ کے نزدیک یکساں ہی ہیں، اس لئے تمام مسالک کے اصولیین کی کتابیں اور ان کے مجتہدین حضرات کی عبارات کو نقل کیا گیا ہے، تاکہ مسئلہ کے اتفاقی ہونے کو ثابت کیا جاوے۔ کچھ مضامین کا تکرار بھی اسی لئے ہوا ہے کہ ایک ہی مسئلہ کو مذاہب اربعہ کے علمائے اصول نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

تقلید و تلفیق کے عنوان کے ماتحت کئی دیگر جزئیات بھی اصولیین حضرات نے نقل کئے ہیں، لیکن یہ تمام مباحث چھوڑ کر صرف افتاء بمذہب الغیر، تتبع رخص اور تلفیق کے مسئلہ کو ہی گفتگو کا محور بنایا ہے۔

حنفیہ میں سے امام قدوری، ابن ہمام، امیر بادشاہ، شاہ ولی اللہ وغیرہم اور دیگر مذاہب کے بھی کچھ اصولیین حضرات نے یہ بات ذکر کی ہے کہ انتقال مذہب کے مانعین نے عدول مذہب سے ''سدذریعہ'' کے طور پر روکا ہے؛ کیوں کہ آزاد طبیعت کے لوگ ہر لمحہ ایسی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے حرام کو حلال کر سکیں، اور اپنے فاسد اغراض کی تکمیل کی خاطر وہ شاذ اقوال اور مذاہب کی رخصتوں کو اختیار کرتے ہیں۔

انتقال مذہب کے مانعین نے اس لئے منع فرمایا تاکہ لوگ رخص مذاہب کی پیروی نہ کرے، کسی شرعی مانع کی وجہ سے نہیں روکا، کیونکہ شریعت میں اخف پر عمل کرنے سے نہیں روکا گیا ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اپنی امت کیلئے آسان اور اخف معاملات ہی پسند فرماتے

تھے؛لیکن ضروری ہے کہ یہ اتباعِ رخصت شریعت کوکھلونا بنانے کے طریقہ پر نہ ہو، جیسے کسی حنفی کا شوافع کی رائے پر شطرنج کھیلنا (لہولعب کے قصد سے)اورکسی شافعی کا مثلث شراب پینا احناف کےقول کے مطابق (اس سے کھیلتے ہوئے)تو یہ سب افعال حرام ہوں گے کیونکہ نصوص قطعیات کوکھلونا بنانا حرام ہے۔

کسی دوسرے امام کاقول اختیارکرنے کے لئے چند باتوں کااطمینان کرلیناضروری ہے۔

(ا)سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں؟ایسا نہ ہوکہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرلیا جائے،اس اطمینان کا طریقہ یہ کہ کوئی ایک مفتی خود رائے کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کرے بلکہ دوسرے اہل فتوی حضرات سے مشورہ کر لے،اگر وہ بھی متفق ہوتو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتوی دیا جائے۔

(۲)جس امام کاقول لیا جائے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتوی علماء سے معلوم کی جائیں۔محض کتابوں میں دیکھنے پر اتفاق نہ کیا جائے کہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتی اور ان کے نظر انداز کردینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

(۳)ائمئہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیوں کہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حدتک پہنچ جائے۔(البلاغ:ص/۴۲۰)

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ ضرورت ومقتضیات زمانہ کی وجہ سے بھی احکام میں تغیر ہوتا ہے۔بہت سے احکام زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں اسلئے کہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے،نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہے،اہل زمانہ میں فساد پیدا ہوجاتا ہے۔اب

اگر شرعی حکم پہلے کی طرح باقی رکھا جائے تو یہ مشقت اور باعث ضرر ہوگا اوران اصول وقواعد کے خلاف ہوگا۔ سہولت وآسانی اور نظام کائنات کوعمدہ طریقہ پر رکھنے کیلئے ضرر فساد کے ازالے پر مبنی ہے۔(رسائل ابن عابدین: ج/۱،ص/۱۲۶)

جنون کی وجہ سے فسخ نکاح کے قائل صرف امام محمدؒ ہیں لیکن ضرورت کی وجہ سے ان کی رائے شیخین کے مقابلے میں قبول کی گئی۔(عالمگیری: ص/ ۱۳۴) تعلیم قرآن، امامت، اذان اسی سلسلہ کے مسائل ہیں۔

علامہ شامیؒ نے حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ اگر صاحبین کی رائے امام صاحب کے موافق ہوتو اس سے بلاضرورۃ تجاوز نہ کیا جاوے، مگر جب اندازہ ہو کہ اگر امام صاحب موجود ہوتے تو وہ بھی یہی رائے قائم فرماتے۔(رسم المفتی: ص/۷۰)

فقیہہ ابو اللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں: جب امام اعظم کے مذہب میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی قول نہ ملے تو امام مالکؒ کے مذہب کی طرف رجوع کیا جاوے، کیونکہ وہ سارے مذاہب میں ہمارے مذہب سے سب سے زیادہ قریب ہے۔(شامی: ج/۲،ص/۵۲۸)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ خلاصہ نقل کرتے ہیں کہ مجتہد کیلئے بعض مسائل میں مذہب غیر اختیار کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے(۱) اسکا یہ عمل ایسی تلفیق کو لازم نہ ہو جس کے باطل ہونے پر دونوں اماموں کا اجماع ہو جیسا کہ تحریر الاصول، الإحکام اوراسنوی وغیرہ کتب میں گذرا۔

(۲) مذہب غیر کا اختیار کرنا اپنے امام کے مذہب پر عمل کرنے سے پہلے ہو، اس طرح کہ اس حادثہ میں اپنے امام کے مذہب پر عمل ہی نہ کیا ہو۔

وفی غیر ما عمل به له ان يقلد غيره من المجتهدين (تیسیر التحریر: ۴/ ۲۵۴)

(۳) رخصت تلاش کرنے کے لئے نہ ہو کیونکہ عامی کیلئے بالاجماع اسطرح کرنا جائز

نہیں ہے، مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ متقدمین مشائخ نے ضرورۃ شدیدہ اورعموم بلوی کی شرط نہیں لگائی ہے لیکن اس فساد اور تلاعب بالدین کے زمانہ میں اس شرط کا لحاظ کرنا ضروری ہے جیسے کہ علامہ شامیؒ نے ذکر کیا ہے۔ (جواہر الفقہ :۱/۱۶۶)

خلاصہ کلام یہ کہ اگر ہم تلفیق اور تتبع رخص کو مطلقاً مباح قرار دیں تو یہ امت کے لئے فتنہ اور آزمائش ہوگی ، اور شریعت کی ہتک حرمت ہوگی ؛ کیونکہ یہ دونوں اباحت پسندی ، آزادی ، لہوولعب اور خواہش کی پیروی کا سبب بنیں گے ، ہاں اگر قابل اعتماد فقہائے کرام دورِ جدید کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور امت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لئے ضروری شرائط کے ساتھ رخصت اور تلفیق کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں، تو میری رائے میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام علماء راسخین کے اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں انجام پائے۔

ایک عامی کے لئے کسی نہ کسی مذہب کی تقلید ہی ضروری ہے تو اگر وہ کسی معین مذہب کی تقلید نہیں کرنا چاہتا تو اس کی وجہ عموماً اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ جس مذہب میں جو مسئلہ اس کی خواہش کے مطابق ہوا سے اختیار کرنا چاہتا ہے، اور اتباعِ ہوا بالاتفاق ممنوع ہے۔

پس جن لوگوں نے عوام کی اس کمزوری کا لحاظ کیا انہوں نے مذہب معین کے التزام کو ان کے لئے ضروری قرار دیدیا؛ تاکہ اتباع شریعت کے پردے میں اتباع ہویٰ نہ کی جاسکے۔

چنانچہ علامہ نوویؒ نے الکیاہراسی کے قول کی جو مذہب معین کے التزام کو ضروری قرار دیتے ہیں یہ وجہ بیان کی ہے:

”لو جاز اتباع ای مذهب شاء لافضی الی ان يتلقط رخص المذاهب متبعا هواه ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز وذلك يودی الى انحلال ربقة

التکلیف۔ (شرح المھذب مقدمہ: ص ۵۵/)

اور جن لوگوں نے مذہب معین کے التزام کو ضروری قرار نہیں دیا، انہوں نے بھی عدم اتباعِ ہویٰ کی شرط لگادی اس لئے نتیجہ کے طور پر بالعموم دونوں رایوں میں کوئی فرق نہ ہوگا، کیونکہ اتباع ہویٰ جس کا منشا نہ ہو وہ "یک در گیر ومحکم گیر" کے اصول سے تجاوز ہی کیوں کرے گا۔

فقہ میں اختلافیات کی کتابیں:

اصول المسائل الخلافیة ،تأسیس النظر (ابوزید دبوسیکی) رفع الملام عن الائمة الاعلام، علامہ ابن تیمیہ کی یا حضرت شیخ زکریاؒ کی اختلاف ائمہ ہفتہ میں ایک دن مناسب ہوگی۔

اصول فقہ میں حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب کی الموجز عربی سوم میں اصول الشاشی کی جگہ بہت مناسب ہے، اس میں آسان انداز اور صحیح اسلوب سے اصول فقہ کو ترتیب دیا گیا ہے گویا کتب احناف کا خلاصہ ذکر کیا ہے، تب ہی تو محدث وقت فقیہ زماں وکیل احناف حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: فقد نظرت فی کتاب "الموجز فی أصول الفقه " تألیف الأخ الفاضل العالم الثّبت المتقن فضیلة الشیخ مولانا محمد عبیداللّٰه الأسعدی، أحد نابغی إخواننا علماء الدیار الهندیة ، زان اللّٰه بهم البلاد ، وهدی بهم العباد ،فوجدته مختصرًا نافعاً ، ومیسّرًا جامعًا ، قد استَخلَص من کتب أصول الحنفیة لُبابها ، وقرّبه إلی المستفیدین بأوجز عبارة وأوضحها ، مع التوثیق لکل نص و التحقیق لکل بحث ومسألة ، بما یفی بالمرام ویتسع له المقام.

فحمِدتُ له هذا الجهد العلمی المشکور ، وهذا السعی المبرور، واللّٰه

المسئول أن ینفع به وبآثاره، ویتقبل منه صالح القول والعمل، ویقیم به الدین، وینفع به المسلمین۔ (الموجز فی اصل الفقه مقدمة الشیخ عبد الفتاح أبو غدة)

عربی چہارم وپنجم میں نورالانوار اور حسامی کے بجائے اصول بزدوی یا اصول سرخسی (جو دارالکتب العلمیہ بیروت سے تخریج احادیث وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے) رکھی جاوے تو نہایت ہی مناسب ہے، کیوں کہ اس میں بہترین اسلوب میں کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ اصول فقہ کو واضح کیا گیا ہے اور شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب ''اصول سرخسی'' کو مبسوط (جو پندرہ جلدوں میں ہے اس کے تحریر کرنے) کے بعد لکھی ہے، چنانچہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''فذلک الذی دعانی إلی إملاء شرح فی الکتب التی صنفها محمد بن الحسن رحمه الله، باکد إشارة وأسهل عبارة ولما انتهی المقصود من ذلک رأیت من الصواب أن أبین للمقتبسین أصول ما بنیت علیها شرح الکتب، لیکون الوقوف علی الأصول معیناً لهم علی فهم ما هو الحقیقة فی الفروع، ومرشداً لهم إلی ما وقع الإخلال به فی بیان الفروع''. (المحرر فی أصول الفقه: ص: ۵)

اسی طرح فقہ اور افتاء میں جزئیات کے ساتھ ساتھ قواعد شرعیہ اور مقاصد شریعت کی بھی کتابیں رکھی جاوے، ہر عالم تو مفتی نہیں ہوگا لیکن وہ کچھ قواعد شرعیہ ومقاصد شریعت سے واقف ہوگا تو اس کی روشنی میں قانون واحکام شرعیہ پر ہونے والے اعتراضات کا تشفی بخش جواب دے سکتا ہے۔

قواعد کے لئے شرح القواعد الفقہیہ ،قواعد الفقہ ،اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ اور شیخ مصطفی زرقاءؒ کی المدخل الفقهی العام اور مقاصد شریعت کے لئے المقاصد العامه،

نظریۃ المقاصد عند الامام الشاطبی وعند الامام ابن عاشور اور مقاصد شریعت وغیرہ کتابیں ہیں، اور اسرار شریعت کے لئے حضرت مولانا مفتی سعید صاحب دامت برکاتہم کی کتاب رحمۃ اللہ الواسعۃ کا پہلا حصہ خاص مفید ہوگا۔

مقاصد شریعت کے قواعد:

مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے اصول فقہ کے نصاب میں کتاب وسنت پر تو قدرے تفصیل سے بحث ہوتی ہے، لیکن اجماع اور قیاس کے مباحث تشنہ رہتے ہیں، اس میں قیاس کے مباحث تو بہت ہی اہم ہیں۔

آج اس کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے، مقیس علیہ، مقیس، علت اور حکم کی تفصیلی شرائط، مختلف ائمہ کے نزدیک تعلیل کی شرعی حیثیت، اس کی مختلف اقسام کا تفصیلی جائزہ اور موجودہ پیش آنے والے مسائل کا حل کس طرح کیا جاوے، ان کو عصری مثالوں سے عملی تطبیق دیتے ہوئے سمجھایا جاوے تاکہ یہ فن نظریاتی کے بجائے عملی شکل میں زندہ نظر آئے اور طلبہ کو اس کی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔

مقاصد شریعت کے فوائد:

کتاب وسنت اجماع امت اور قیاس کے علاوہ بھی بعض دلائل ہیں جو احکام شرعیہ کے استنباط کے لئے مجتہدین کے ذریعہ استعمال کئے جاتے ہیں، اگرچہ ان کے دلیل حکم شرعی ہونے کے بارے میں مجتہدین کے درمیان اختلاف آراء ہے، مثلاً: استحسان، استصلاح، استصحاب، عمل اہل مدینہ، قول صحابی، براءۃ اصلیہ، اخذ بالاخف، تحری، عرف، تعامل، عموم بلوی، اخذ باقل ما قیل وغیرہ۔ اصطلاح میں اسے استدلال کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی دلیلیں جو نہ نص ہیں، نہ اجماع اور نہ قیاس، استدلال کی ان مختلف اقسام کے بارے میں ائمہ کی رائیں

یکساں نہیں ہیں، مثلاً: ''استحسان'' امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک معتبر ہے۔ امام شافعیؒ اپنے مشہور قول کے مطابق اسے تسلیم نہیں کرتے، امام مالکؒ ''عمل اہل مدینہ'' کو حجت مانتے ہیں، دوسرے حضرات اس کے قائل نہیں، اس طرح یہ ادلہ مختلف فیہ ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان مختلف فیہ دلائل میں سے بعض وہ ہیں جو ہر عہد کے مسائل کے مطالعہ، تجزیہ اور مشکلات کے حل میں ممد ومعاون ہوسکتے ہیں۔ اس کے لئے ان ادلہ پر علماء کے لئے نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

کتاب وسنت میں جو احکام آئے ہیں وہ کسی نہ کسی مصلحت اور مقصد پر مبنی ہیں، شریعت کا کوئی حکم مقصدیت سے خالی اور مصلحت سے عاری نہیں ہوسکتا۔ کچھ مقاصد عمومی نوعیت کے ہیں، جو پوری شریعت اسلامی کے لئے اساس وبنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، اور غور کیجئے تو یہ انسانی زندگی کی تمام ضرورتوں اور مصلحتوں کو جامع بھی ہیں، یعنی دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال اور عقل کی حفاظت۔ انسان اپنی زندگی میں جو بھی بہتر کام کرتا ہے وہ اسی دائرہ کے اندر ہوتا ہے، اسی لئے اسلامی قانون کے ماہرین نے ان ''مقاصد خمسہ'' کو شریعت کے احکام کی اصل قرار دیا ہے، پھر اگر غور کیا جائے تو ہر حکم کے ساتھ جزئی مقاصد اور مصالح بھی وابستہ ہیں، نماز خدا کی یاد کو تازہ رکھتی ہے، روزہ سے ضبط نفس کی قوت پیدا ہوتی ہے، زکوۃ سے غریبوں کی مدد ہوتی ہے، نکاح قلب ونگاہ کو عفیف وپاکدامن بناتا ہے، تجارت ضروریات زندگی کی فراہمی کا ذریعہ ہے، سود کی حرمت کا مقصد غریبوں کے استحصال کو روکنا ہے، زنا کی ممانعت کا مقصد معاشرہ کو بے حیائی، بداطواری اور امراض خبیثہ سے محفوظ رکھنا ہے، یہی حال دوسرے احکام کا ہے، فقہاء نے اجتہاد واستنباط میں ان بنیادی اور جزوی مقاصد ومصالح کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

ان مقاصد و مدارج کا فہم تفقہ فی الدین کے لئے روح اور اساس کا درجہ رکھتا ہے۔اس کو پیش نظر رکھے بغیر جو رائے قائم کی جائے گی وہ یا تو افراط پر مبنی ہوگی یا تفریط پر، اور اس میں اباحیت کا رنگ ہوگا یا حرج و تنگی کا، اور یہ دونوں ہی باتیں شریعت کے مزاج و مذاق اور اس کے مقصد و منشاء کے خلاف ہیں، اس لئے ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان پر غور کرنے ،ان کے بارے میں حکم شرعی کو جاننے اور مزاج شریعت سے ہم آہنگ رائے قائم کرنے کے لئے مقاصد احکام اور مدارج احکام پر عمیق نظر اور بصیرت ضروری ہے، کیونکہ فقہی جزئیات ہوسکتا ہے کہ ایک خاص عہد کے تقاضوں پر مبنی ہوں، لیکن شریعت کے مقاصد اور مصالح کی حیثیت دائمی اور ابدی ہے۔

مقاصد شریعت کا موضوع ایک مستقل فن کے طور پر معروف نہیں رہا، لیکن یہ حقیقت بھی اسی طرح اٹل مانی جائے گی کہ احکام شریعت کے استنباط اور قانون سازی کے عمل میں مقاصد شریعت ایک روح بن کر جاری وساری ہے، علامہ شاطبی نے کہا ہے کہ اجتہاد کے لئے دو شرطیں ہیں: پہلی شرط مقاصد شریعت سے واقفیت ہے اور دوسری شرط تمام متعلقہ علوم اسلامیہ سے واقفیت۔

مقاصد شریعت کی وجہ سے شریعت کے احکام اپنے فطری مزاج یعنی یسر وسہولت پر باقی رہتے ہیں۔ مقاصد شریعت کی وجہ سے ہی بدلے ہوئے حالات میں بھی شریعت کے احکام اپنی روح اور مقصود سے وابستہ رہتے ہیں، مقاصد شریعت ہی ہے جس کی بنیاد پر متعارض مصالح میں اور احکام کے مدارج و مراتب میں صحیح درجہ بندی قائم ہو پاتی ہے، اور اس پر یہ بھی اضافہ کیجئے کہ یہ مقاصد شریعت ہی ہے جس کی وجہ سے شریعت کے احکام سے اس کے مطلوبہ نتائج تک رسائی ہو پاتی ہے، مقاصد شریعت فقہی اختلاف آراء سے استفادہ

کا ماحول فراہم کرتے ہیں، اور مقاصد شریعت کے ذریعہ ہی شریعت اسلامی زمینی حقیقتوں سے جڑ کر سب کے لئے قابل عمل بنی رہتی ہے، اور یہ بھی کہ مقاصد شریعت کے ذریعہ اسلامی شریعت کی عظمت وہمہ گیری، حسن وخوش نمائی اور ثبات وتغیر پذیری نمایاں ہوتی ہے، اور آخر میں یہ کہ مقاصد شریعت صرف قانون سازی میں نہیں بلکہ حیات اجتماعی کے مختلف معاملات کے اندر سلوک وکردار، اقدامات اور فیصلوں میں رہنما رول ادا کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ فقہاء مجتہدین نے ہمیشہ اپنی رائے قائم کرنے میں ان مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اصول وقواعد کی تدوین پر نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے، ہاں حنفیہ کے یہاں استحسان اور مالکیہ کے یہاں مصالح مرسلہ جیسے فقہی مصالح کے ذیل میں اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

عرب ممالک سے مقاصدِ شریعت کے عنوان پر آنے والی کتابوں میں اکثر تو بہت اچھی ہوتی ہیں، لیکن بعض میں مقاصد کو بنیاد بنا کر ائمہ مجتہدین کے اجتہادات کو رد کیا جاتا ہے، اور غلو پسندی سے کام لیتے ہوئے متقدمین کے فقہی ذخیرہ کی اہمیت کو ختم کر دیا جاتا ہے، تعارض ادلہ کا عنوان ذکر کر کے مختلف نصوص کے معارضہ کو مقاصد کی روشنی میں حل کرنے میں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے اور اس طرح اسلاف کے قیمتی فقہی ذخیرہ اور اصول فقہ وقواعد (الاشباہ والنظائر وفروق) فقہیہ کی اہمیت کالعدم قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس طرح اصول فقہ، قواعد فقہیہ ومقاصد شریعت کی گہری بصیرت کے بغیر ہی کچھ حضرات نے مقاصد شریعت جیسے مشکل موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور اس میں یہاں تک لکھ دیا کہ مصلحتوں کے لئے قرآن وحدیث کے صراحت کردہ احکام میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے۔

اسلامی شریعت کے عمومی نظریات، امتیازات، آفاقی اصول وکلیات اور قانون سازی

کے بنیادی اصول وغیرہ عنوانات پر بھی علمائے کرام اور ماہرین قانون نے مستقل کتابیں لکھیں ہیں اور اس میں انسانی قانون کے بالمقابل اسلامی قانون کا اصولی موازنہ کرتے ہوئے اسلامی قانون کی قانونی حیثیت، تقدیس کا پہلو، قانونی معنویت، قانونی وحدت، نفاذ کی قوت، انسانی نفسیات ومصالح کی رعایت، اور دونوں میں مقاصد کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے اسلامی قانون کے آفاقی اصول وکلیات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جس میں اسلام کا نظریۂ مساوات، نظریۂ آزادی، فکر وضمیر کی آزادی، مذہبی آزادی، زبان وبیان کی آزادی، اسلام کا نظریۂ شوریٰ، جمہوریت اور آمریت کی ناکامی کے اسباب، تحدید اختیارات کا نظریہ اور حکمران کے لیے حدودِ اختیارات کو بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ پیش کرتے ہوئے اللہ تعالی کی حاکمیت، شریعت کی بالادستی اور حکمرانی، شریعت کی عقلیت اور تجرباتی منہج، عمل اور نیت، اجتماعی اور منظّم شریعت، انسان کی سرگرمیوں میں شریعت کی مداخلت کے حدود، ثبات اور لچک میں توازن، اسلامی شریعت کی ہمہ گیری، توسط واعتدال، عدالت، شریعت اور تاریخ سازی، شریعت اسلامی میں درجات احکام کی ترتیب کے تدریجی اصول، اجمال وتفصیل، حکیمانہ قوانین، اعلیٰ اخلاق پر مبنی وسیع قانونی نظام وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ بندہ نے طوالت کے خوف سے اور مضمون کی تبدیلی کے خطرہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، لیکن شعبۂ افتاء کے طلبہ کے لئے اصول قانون سے متعلق ان مضامین کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا۔

افتاء :

افتاء میں اسلام اور جدید معیشت، اسلامی معاشیات (مولانا سید مناظر حسن گیلانی)، اسلام کا اقتصادی نظام (مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی) اور بینکنگ کے نظام وغیرہ کی بینادی

معلوماتی کتابیں پڑھانی چاہئے، ہندوستانی قانون سے بھی افتاء کے طلبہ کو واقف کرایا جاوے اوراس کے کچھ اسباق پڑھائے جاوے۔اسی طرح افتاء میں شیخ ابوزہرہ مصریؒ کی اصول الفقہ یا الشیخ مصطفی الزرقاء کی المدخل الفقہی العام کے منتخبات اور اگر دوسالہ نصاب ہوتو اصول قانون میں مصادر الحق کے منتخبات (جو یورپی اور اسلامی اصول قانون کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں اصول سے طلبہ کو واقف کراتی ہے)اس کو بھی داخل نصاب کیا جاوے۔معاشیات کے لئے حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی اسلام اور جدید معیشت وتجارت اورعلی گڑھ سے معاشیات،سیاست اوراصول قانون وغیرہ موضوعات پر لکھی ہوئی اردو کی کتابیں بھی بہت مفید ہوگی۔افتاء کے طلبہ واساتذہ اس کو مطالعہ میں رکھیں تو بہت فائدہ ہوگا اورجدید مسائل کی تفہیم میں بہت معین ثابت ہوں گے۔

حدیث:

حدیث کی کتابوں میں تبدیلی کا سوال ہی نہیں ہے،لیکن ان کے ابواب کی ترتیب قائم کرنا ضروری ہے؛ تاکہ طالب علم کو تمام اہم ابواب کی روایات کا علم ہو، دورۂ حدیث کی کتابوں کے ابواب کی تقسیم کی باتیں کئی سالوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر اب تک عمل نہیں ہوا ہے، اکابرین سے گزارش ہے کہ وہ کتاب کے انداز کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کی تقسیم فرمائیں تاکہ ہراستاذ اتنے حصے کو درایۃً پڑھاوے،باقی حصہ روایۃً ہو؛ تاکہ کتاب بھی مکمل ہواور طلبہ تکرار مباحث سے اکتا نہ جاوے۔احادیث میں فقہی مباحث کی رفتار کم کر کے اخلاقیات ،عقائد، معاملات، معاشرت اور رقاق کے مباحث کی طرف توجہ دی جائے۔حدیث شریف کے طریقۂ درس کے سلسلہ میں اعتدال سے کام لیا جاوے،فقہیات کی مقدار اور طریقۂ استدلال کے متعلق بھی سوچا جاوے۔

مہاجر مدنی حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ نے اس سلسلہ میں جو بصیرت افروز کلام ترجمان السنۃ کے مقدمہ میں لکھا ہے وہ ہم لوگوں کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے حضرت فرماتے ہیں ''بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو فقہاء و محدثین کے ساتھ مرتبط تھا اپنے ضیق ماحول، قصور فہم اور کوتاہیٔ نظر کی وجہ سے ان تصانیف میں وہی کچھ دیکھتا رہا جو اس کے آئینۂ قلب میں نظر آرہا تھا، اس لئے جب عبادات کا باب شروع ہوتا اس میں بھی خصوصیت سے وہ حصہ جو مختلف فیہ مسائل سے متعلق ہے تو اس طبقے کے علوم و معارف اور تدقیق و تحقیق کے سمندر میں تلاطم برپا ہوجاتا، تقریروں میں طول، طبیعت میں روانی اور مزاج میں جولانی پیدا ہوجاتی لیکن جب ان ہی کتب میں اجتماعیات و اخلاقیات، سیاستِ مدنیہ اور تدبیر منزل وغیرہ کے باب آتے تو اس بحرِ متلاطم میں یک قلم جمود طاری ہوجاتا، لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی، زبان پر خاموشی کے قفل چڑھ جاتے اور طبیعت کا وہ تمام جوش و خروش ایسا ٹھنڈا پڑ جاتا گویا اس میں حرارت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔

ادھر مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو مذہب کو روزِ ازل ہی سے سامان دردسری یا زیادہ سے زیادہ ایک آئین تہذیب خیال کئے ہوئے تھا اس کو خود تو مطالعہ کی توفیق نہ ہوئی، ہماری اس غلط روش سے وہ ایک اور غلط فہمی میں مبتلاء ہوگیا یعنی ان کتابوں میں عبادات و رسوم یا چند مسائل کلامیہ و فقہیہ کے علاوہ اجتماعیات و معاشیات کا کوئی باب ہی نہیں ہے اور ہے تو بہت سطحی بلکہ غیر ضروری اور ان چند در چند وجوہ کی بناء پر وہ اپنی معاشیات و اقتصادیات کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کرنے پر مجبور ہوگیا۔

ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ان کتب میں جو ابواب و تراجم ایک خاص فضا اور خاص ماحول میں اہم سمجھ لئے گئے تھے آج بھی ان کو اسی نظر سے دیکھے چلے جانا، وہی

جہمیت کی تردید، معتزلہ وخوارج کے ساتھ وہی جھگڑے، صفات کے عین وغیر ہونے کے متعلق وہی فلسفیانہ کاوشیں، پھر قرآن کریم کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی وہی قدیم بحثیں زیر تحقیق لائے چلے جانا اور ایک ایسی زمین پر مالکیت وشافعیت کے لئے صف آرائی کرنا جہاں نہ کوئی شافعی ہے نہ مالکی، علم وفکر کے ان مظاہروں کو ہرگز اقتضاء علم نہیں کہا جا سکتا، نہ تو اس کا نام احساس ضرورت ہے اور نہ اس کو صحیح معنی میں اتباع سلف کا نام دیا جا سکتا ہے، اتباع سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے وقت کے فنون کے مقابلہ کے لئے کتاب الرد علی الجھمیۃ، حجیت اخبار آحاد، صفات باری اور شئون باری پر مناسب مناسب عنوانات قائم کئے تھے، ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لئے مناسب عنوانات قائم کریں، ہمیں اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں ہے کہ اگر امام بخاریؒ اس زمانے میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان، دقّت رسی، دقیقہ سنجی اور امت کی ضرورتوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے اپنے بابوں، ترجموں اور عنوانوں کا رخ جہمیت واعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے الجھے ہوئے مسائل کہلاتے ہیں''۔ (ترجمان السنۃ: ص: ۱۰، ۱۱)

حدیث شریف کے درس میں رجال کی جرح وتعدیل، احادیث کی اقسام، ان کے احکام، علوم الحدیث، علل حدیث، قواعد الحدیث اور احادیث پر مستشرقین کی طرف سے ہونے والے اعتراضات کے جوابات، تاریخ حدیث ومحدثین کے مختلف ادوار اور حدیثی خدمات کا تنوع وغیرہ مباحث سے طلبہ کو واقف کرایا جاوے۔

تخصص فی الحدیث تاریخ، اہمیت وضرورت:

حدیث شریف کی درایت پر تو مدارس میں کافی طویل بحثیں ہوتی ہیں، لیکن روایت

حدیث، اصول جرح وتعدیل، مصطلحات، مشکلات الحدیث، وجوہ ترجیح وغیرہ اہم امور سے صرف نظر کیا جاتا ہے، ہماری طرف سے اسماء رجال کی تحقیق اور روات حدیث کی حیات مبارکہ وغیرہ امور سے صرف نظر نے علمی اعتبار سے ہمیں یہ نقصان پہونچایا کہ ہمارے فارغین مصطلحات، اسماء رجال اور اصول حدیث سے بالکل بے پرواہ ہو گئے، دوسری طرف اس میدان میں کچھ ایسے لوگ داخل ہو گئے جو اس کے اہل نہیں تھے، یا جن کے مقاصد صحیح نہیں تھے، اور انہوں نے ائمہ مجتہدین کے اجتہادات، استنباطات پر نقد حدیث کے عنوان سے معرکہ شروع کر دیا۔ اور احادیث مبارکہ پر ضعیف بلکہ موضوع ہونے کے الزامات بھی لگائے، اور محدثین عظام واصحاب جرح وتعدیل کی محنتوں پر پانی پھیر دیا۔

حضرت مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

علم حدیث جس کے بارے میں علم بھی دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے اور لوگوں کی دلچسپی بھی روز بروز گھٹ رہی ہے، اس میں مہارتیں دن بدن محدود ہوتی چلی جارہی ہیں، اس علم سے دلچسپی خود اسلامیات کے طلبہ کی محدود ہوتی چلی جارہی ہے، یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد اور بے مثال علمی کارنامہ ہے، یہ ایک ایسا بے نظیر علم ہے جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے، اس پر تھوڑی سی گفتگو تو آگے چل کر ہوگی، لیکن سر دست اختصار کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا علم موجود نہیں ہے جس کا مقصد کسی ایک شخصیت کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھنا اور اس کو ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک کر کے اس طرح منقح کر دینا ہو کہ پڑھنے والوں کو ایسا یقین آجائے جیسا کہ آج سورج نکلنے کا یقین ہے۔ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت سورج نکلا ہوا ہے اتنا ہی اس بات کو یقینی بنا دینا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہنِ مبارک سے نکلی کہ نہیں نکلی، یہ کاوش انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت

کی منفرد کاوش ہے۔

انسانی عبقریت، یعنی انسانی Genius کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے، یعنی کسی علم وفن میں انسان کی عبقریت کا اگر آپ جائزہ لیں تو دو انداز سے اس کا اظہار ہوتا ہے، ایک انداز تو وہ ہے جس کو آپ تخلیقی عبقریت کہہ سکتے ہیں یعنی Creative Genius. تخلیقی عبقریت سے مراد یہ ہے کہ ایسی عبقریت کہ جس میں انسان اپنی عقل سے کام لے کر علوم وفنون کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دے جو کسی اور انسان کی عقل میں نہ آئے ہوں اور انسانی عقل ان کو دیکھ کر حیران رہ جائے، مسلمانوں میں Creative Genius کا سب سے اعلیٰ نمونہ ''علم اصول الفقہ'' ہے، اصول فقہ سے بڑھ کر کریئیٹیو جینئس کی مثال مسلمانوں میں نہیں ملتی، جینئس یا عبقریت کی ایک دوسری قسم بھی ہوتی ہے جس کو ہم Accumulative Genius کہہ سکتے ہیں؛ یعنی معلومات اتنی کثرت سے اور اتنی وافر انداز سے فراہم کردی جائیں کہ انسانی عقل اس کی کثرت پر دنگ رہ جائے، علم حدیث مسلمانوں کی Accumulative Genius کا بے مثال نمونہ ہے، انسانی تاریخ میں کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں معلومات کے انبار، معلومات کے پہاڑ اور معلومات کے سمندر اس طرح جمع کئے گئے ہوں، جس طرح علم حدیث میں جمع کئے گئے ہیں۔

یہ وہ چیز ہے جس کا اعتراف ایک بڑے غیر مسلم مستشرق ڈاکٹر سپرینگر (Springer) نے کیا ہے، آپ نے اس شخص کا نام سنا ہوگا، یہ ایک جرمن مستشرق تھا، ہمارے برصغیر میں بھی کافی عرصہ رہا، اس نے علم حدیث پر کام کیا تھا، اور جب اس نے فن رجال کا مطالعہ کیا، (یعنی علم حدیث کے راویوں کا علم) تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ایک شخصیت کے احوال اور اقوال کو یقینی بنانے اور محفوظ رکھنے کے لئے چھ لاکھ انسانوں کے حالات جمع کئے گئے، چھ لاکھ

انسانوں کے حالات اس لئے جمع کئے گئے کہ وہ چھ لاکھ انسان بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات گرامی کو محفوظ رکھنے کے عمل میں شریک تھے، اس کی مثال مسیحیت کی تاریخ میں، یہودیت کی تاریخ میں یا کسی بھی مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ (محاضرات حدیث: پہلا خطبہ، ص: ۲۸-۲۹، ط: اریب پبلیکیشنز)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر محدثین کرام نے اشتغال بالحدیث اور حفاظتِ حدیث کی خاطر اتنی قربانیاں کیوں دیں؟ فقر و فاقہ کی مشقتیں کیوں برداشت کیں؟ دور دراز کے اسفار کیوں کیے؟ روایتِ حدیث اور اس کی اشاعت کے لیے اتنی تگ و دو اور محنت کیوں کی؟ حفاظت حدیث کے سلسلے میں کڑی شرائط، فنی باریکیاں اور احتیاطی تدابیر کیوں اختیار کیں؟ محض حصول ثواب کی خاطر؟ نہیں! اس کے لیے تو اور راہیں بھی بہت ہیں، خوامخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، دراصل وہ لوگ سمجھتے تھے کہ اگر علم حدیث ہی مسلمانوں سے اٹھ گیا تو یہ امت جہالت وظلمت کی وادی میں بھٹک کر رہ جائے گی اور پھر کوئی مسیحا نہ مل سکے گا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کی لاج رکھی اور امت مسلمہ میں علم حدیث کی عمومی فضا بنی اور اس امت کا سفینہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتا چلا آ رہا ہے، وضع حدیث اور فتنہ انکار حدیث کی تاریخ اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے ابلیسی طوفانوں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ہمیں محدثین کی کاوشوں، قربانیوں اور تکالیف کی قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے، تاریخ اسلامی میں جتنے بھی فتنے اٹھے، ان سب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے بغاوت کا عنصر مشترک ہے، یہی وجہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ قبل مستشرقین نے امتِ مسلمہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور علمِ حدیث کے راستے ایک سیلابی ریلا چھوڑا۔ آج کے ان تمام فتنوں سے نمٹنے کے لیے ایک چیز بے حد ضروری ہے کہ ہمیں بھی ان محدثین کے راستے

پر چل کر تمام طبقاتِ اسلامیہ میں اشتغال بالحدیث کی ایک عمومی فضا پیدا کرنا ہوگی۔

انکارِ حدیث کے نئے محرکات وعوامل:

مغربی نومسلم فاضل محمد اسد (Leopold Weiss) نے سنت سے دامن چھڑانے اور حدیث کا انکار کرنے کا حقیقی سبب (جس کے داعی اس دور میں پھر اُس کا بیڑا اٹھا رہے ہیں) نئی نسل کی نفسیات اور مغربی تہذیب کے غلبہ اور طاقت سے مکمل واقفیت کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ مغربی تہذیب کی قدروں اور پیمانوں، اس کے طرزِ زندگی اور فیشن اور سنت نبوی علی صاحبہا الف تحیۃ میں کبھی جوڑ نہیں ہوسکتا اور اس زندگی کو- جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت اور آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور سنت کے مراجع اور مآخذ پر پورے یقین اور اطمینان پر مبنی ہو- مغربی تہذیب کی تعظیم وتقدیس اور اس کو علم انسانی کی آخری دریافت سمجھنے کے تصور کے ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا، غالباً بعض اسلامی ممالک کے حکام اور سیاسی لیڈران کے سنت پر حملہ اور انکارِ حدیث کا یہی سبب ہے۔

فاضل مصنف محمد اسد نے اپنی کتاب میں جس کا عنوان ہے ''اسلام دوراہے پر'' اسلام دشمنی کے حقیقی اسباب اور اس سازش کی خطرناکی کی جو مسلم معاشرہ کو اس بے بدل قوت سے محروم، اور اس بے نظیر خزانہ سے خالی کردینا چاہتی ہے، بڑی اچھی تشخیص کی ہے، وہ کہتے ہیں:

''سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ آہنی ڈھانچہ ہے، جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے، اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹادیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ جائے، جس طرح کاغذ کا گھروندا''۔

انکارحدیث کا اثر اور اتباع سنت کی ضرورت اور اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''لیکن یہ اعلیٰ مقام جو اسلام کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ وہ ایک اخلاقی، عملی،

انفرادی، اوراجتماعی نظام ہے، اس طریقہ سے (یعنی حدیث اوراتباع سنت کی ضرورت کے انکارسے) ٹوٹ کراور بکھر کررہ جائے گا۔''

عصرِ حاضر میں اشتغال بالحدیث کیسے؟

اشتغال بالحدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر حدیثِ رسول کا عام ماحول پیدا ہو جائے، ہمارے خطباء سے لے کر سامعین تک، مصنفین سے لے کر قارئین تک، علماء سے لے کرعوام تک اور حکمرانوں سے لے کر رعایا تک، معاشرے کے تمام افراد بحیثیت مسلمان حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تعلق پیدا کریں، یہی تعلق سنت کی راہ دِکھلائے گا اور ہمیں تمام تر دینی فتنوں سے محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ ہماری دنیاوی ترقی کا بھی یہی سبب ہے، جس طرح تبلیغی جماعت میں فضائلِ اعمال کی تعلیم ضروری ہوتی ہے، بالکل اسی طرح ہمارے تمام طبقات میں ان کے منصوبوں اور شعبوں کے مطابق مستند اور منتخب احادیث کی تعلیم وترویج اور افہام وتفہیم کا ماحول پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔

اسی طرح اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جائے کہ لوگوں کے سامنے من گھڑت واقعات، بے سند قصے اور انتہائی ضعیف اور واہی احادیث کو بیان نہ کیا جائے، اس سے لوگوں کے عقائداوراعمال کا ستیاناس ہوجاتا ہے اور لوگ اسلامی تعلیمات سے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں؛ نیز یہ چیزیں صحیح العقیدہ، صاف وشفاف اور معتدل مزاج اسلامی معاشرے کی تشکیل میں بہت بڑی رکاوٹ بنتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ شریعت مطہرہ میں ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے نقل کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ایسے شخص کو جھوٹا کہا گیا ہے اور رہی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات کو منسوب کرنا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے (خواہ وہ بات بظاہر اچھی اور بھلی ہی کیوں نہ ہو) نہ صرف حرام، بلکہ اشد

الحرام ہے، اسی لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ”کفی بالمرء کذباً ان یحدّث بکلّ ما سمع“. (مقدمۃ صحیح مسلم، باب النھی عن الحدیث بکل ما سمع، رقم الحدیث:۷) (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کرے) ارشاد فرما کر اور کبھی ”من حدث عنی حدیثا وھو یُری أنہ کِذب فھو أحد الکاذبَین.“ (جامع الترمذی، باب ماجاء فی من روی حدیثا وھو یری أنہ کذب، رقم الحدیث: ۲۶۶۲) (جس نے مجھ سے ایسی بات بیان کی کہ اُس کا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹی ہے، تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے) اور ”من کذب عليّ متعمّدا فلیتبوأ مقعده من النار“. (صحیح البخاری، باب اثم من کذب علی النبی، رقم الحدیث:۱۱۰) (جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا اُسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) کی وعید سنا کر اخبار واحادیث میں تساہل برتنے پر سخت ڈرایا ہے۔

تخصص فی علوم الحدیث اُمید کی ایک کرن:

آج زمانہ آواز دے رہا ہے ان لوگوں کو جو آگے بڑھیں اور راہِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر چل کر دیوانہ وار اللہ کی رضا کی خاطر اس عظیم کام کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور مسلسل محنت، لگن، شوق، اخلاص اور جذبہ قربانی کے اعوان وانصار کے ذریعے عصرِ حاضر کے جدید اور مفید وسائل کمپیوٹر وغیرہ سے اساتذہ اور ماہرین کی زیرِ نگرانی صحیح استفادہ کرتے ہوئے دین کے تمام شعبوں میں روح پھونک دیں۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ، اُمید کی ایک کرن برصغیر میں دکھائی دے رہی ہے، تخصص فی علوم الحدیث کا ایک بہترین سلسلہ شروع ہو چکا ہے، کاش کہ اس سلسلے سے منسلک خوش قسمت افراد اپنی ذمہ داری کا احساس بھی بیدار رکھتے ہوں اور وہ بالکل وہی ذمہ داری کو نبھانے کا جذبہ لے کر اُٹھیں جو ذمہ داری حضراتِ سلف نے نبھائی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تخصص فی علوم الحدیث کے شعبے سے وابستہ ہونے کے بعد جب باحث پر علمِ حدیث کی متعدد راہیں اور اس کے متنوع علوم فنون کھلتے ہیں اور ان میں سلف نے جو سینکڑوں کتابیں تصنیف کی ہیں، ان سے وہ متعارف اور ان کے مناہج پر مطلع ہوتا ہے تو اُس وقت اس کے دل میں (درس نظامی کی تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود) علوم حدیث سے ناواقفیت اور ان سے اپنے تہی دامن ہونے کا احساس وشعور بیدار ہوتا ہے اور اس پر نصف نہار کی طرح یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ علم حدیث تو ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے، جو اپنے اندر لاتعداد قیمتی موتیوں اور جواہر کو سموئے ہوئے ہے اور ایک ایسا بحر بے کنار ہے جس سے بیسیوں نہریں نکلتی ہیں، جو بے شمار اسلامی علوم وفنون کو رونق وشادابی بخشتی ہیں اور شریعت مطہرہ کی حسین وادی کو سیراب کرتی ہیں۔ اے کاش! یہ احساس وشعور ہمارے تمام دینی، علمی اور تحقیقی اداروں سے منسلک افراد میں پیدا ہو جائے اور علومِ حدیث کی افادیت اور سلف کے اس عظیم خزانے سے محرومی کا ہم سب کو ادراک ہو جائے۔ "وما ذلك على الله بعزيز".

اصول حدیث:

اصول حدیث کے سلسلہ میں عرب ممالک میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر نخبۃ الفکر کے علاوہ اور کوئی کتاب بھی رکھی جاوے تاکہ مصطلحات، تخریج حدیث، قواعد حدیث اور رجال کے سلسلہ کی بنیادی معلومات یا کم از کم ان کے مراجع کا بھی علم ہو سکے۔

اصول حدیث میں شیخ الطحان کی تیسیر مصطلح الحدیث اور مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کی قواعد فی علوم الحدیث علمائے احناف پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب کے لئے بہت مفید ہے۔

حدیث کے اصول و مصطلحات- منہج حنفی کی روشنی میں:

مدارس اسلامیہ میں اصولِ حدیث کے نصاب میں عامۃً حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ’’نزهة النظر شرح نخبة الفكر‘‘ اور تخصص فی الحدیث الشریف کے نصاب میں ’’تدريب الراوی‘‘ یا ’’مقدمة ابن الصلاح‘‘ پڑھائی جاتی ہے، یہ کتابیں یقینا اصول حدیث میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں؛ لیکن اس کے مصنفین شوافع ہونے کی وجہ سے شوافع کے اصول استدلال سے ہی بحث کرتے ہیں، ائمہ احناف کے اصولی اختلاف کو ذکر نہیں کرتے ہیں، اس وجہ سے ہمارے علمائے کرام وطلبۂ عزیز حنفی اصول حدیث سے واقف ہی نہیں ہوتے۔

اس سے زیادہ افسوس تو تب ہوتا ہے جب ہم شوافع وغیرہ کے ساتھ استدلال کے موقع پر یا احادیث میں تطبیق دیتے وقت شوافع ہی کے اصول سے استدلال کرتے ہیں، حالاں کہ ائمہ احناف نے جو مسئلہ ذکر کیا ہے، وہ تو حنفی اصول کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے، اور ہم اصول احناف سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، یہ ائمہ احناف کے ساتھ ہماری طرف سے کتنی ناانصافی ہوگی کہ ان کے مستدلات کو تو ہم ذکر کریں؛ لیکن کن اصولی اختلاف کی وجہ سے انہوں نے اس مسئلہ کو ثابت کیا وہی نہ جاننے کی وجہ سے اصول میں ان کی مخالفت کریں؛ یہ اصول وفروع کے درمیان ہماری تضاد بیانی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

یہ بات کئی سال سے ذہن میں کھٹک رہی تھی، اور میں احناف کے اصول حدیث کے سلسلہ میں کافی پریشان تھا کہ وہ کسی جگہ پر مدلل محقق حوالوں کے ساتھ اور اس ترتیب کے مطابق مل جائیں جو نخبہ وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، تو اپنے عزیز طلبہ کے سامنے ہم اس کو پیش کرسکیں، یہ طلب اس وقت زیادہ شدت اختیار کرگئی جب دارالعلوم ماٹلی

والا میں شعبۂ تخصص فی الحدیث کا افتتاح ہوا، انہی دنوں میں دارالعلوم مظاہرالعلوم سہارن پور کے امین عام مولانا محمد شاہد صاحب کا ایک رسالہ نظر سے گذرا، جس میں آپ نے شعبۂ تخصص فی الحدیث کے اجراء سے پہلے اس کے نصاب کے سلسلہ میں مختلف اکابر محدثین کے نام خط ارسال فرمایا تھا، تو پاکستان سے محدث کبیر حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کے خط میں اصول حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا تھا:

> اور حنفی عالم کو محدثین کی مصطلح کے علاوہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو سنت کی بحث ہے اس کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے، خصوصاً جصاص کی اصول فقہ، سرخسی اور بزدوی رحمہم اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں جو سنت کی بحث ہے وہ پیش نظر رہے کہ ہمارے یہاں نقد حدیث کے وہی اصول ہیں جو ان کتابوں میں مذکور ہیں، وہ نہیں جو ابن صلاح اور بعد کے لوگوں نے بنائے ہیں، اس سلسلہ میں کشف بزدوی اور اصول سرخسی کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔
> نصاب کے لئے آپ چاہیں تو اصول حدیث میں مقدمۂ ابن صلاح، اصول فقہ میں سے سرخسی کی سنت کی بحث لازمی کر سکتے ہیں۔ (تخصص فی الحدیث الشریف نمبر، ص: ۲۵، شعبۂ نشر واشاعت جامعہ مظاہرالعلوم، سہارن پور)

ہمارے طلبۂ عزیز وعلمائے کرام کو یہ بھی معلوم ہو کہ یہ اصولی اختلاف کن کن فروعی مسائل میں اثر کرتا ہے، خاص کر کے حدیث شریف (اسانید کی تعداد کے لحاظ سے) کی بنیادی تقسیم کا اختلاف کتنا سنگین اور اثر انگیز ہے، اس کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) متقدمین ومتأخرین احناف بہ لحاظ تعداد اسانید، احادیث کو تین قسموں میں منقسم کرتے ہیں: متواتر، مشہور، آحاد، جب کہ محدثین اسانید کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں:

متواتر، آحاد، ان دونوں قسموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشہور احناف کے نزدیک آحاد کی قسیم ہے، اور محدثین کے نزدیک آحاد کی قسم ہے۔

(۲) متواتر کی تعریف وحکم میں احناف ومحدثین متفق ہیں، البتہ حنفیہ نے کچھ اضافہ کیا ہے، مثلاً متواتر کا انکار کفر ہے۔ اور مشہور کی تعریف اور حکم، اسی طرح، آحاد کی تعریف اور حکم میں احناف محدثین سے مختلف ہیں۔

متواتر، مشہور اور واحد کا اختلاف ہزاروں مسائل کی تفہیم میں احناف ودیگر ائمہ کے درمیان حد فاصل ہے، جیسے کہ شرعی احکام کی تقسیم میں احناف نے فرض اور سنت کے درمیان واجب کی اصطلاح متعین کر کے شرعی احکام میں سے ہر ایک کو افراط وتفریط سے پاک رکھا۔

ایک صاحب نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کیا کہ حدیث سے پانچ نمازیں فرض معلوم ہوتی ہے، آپ نے وتر کو واجب کا درجہ دے کر فرض کی تعداد چھ (٦) کر دی ہے، تو امام صاحب نے فرمایا کہ ''الفرق ما بين الفرض والواجب كما بين السماء والارض'' کیوں کہ فرض کے منکر کو کافر قرار دیا جائے گا، جب کہ واجب کا منکر کافر نہیں ہوگا، نصوص میں وتر نماز کی تاکید تھی، لہذا اس کو سنت نہیں کہہ سکتے تھے، اور فرض کے درجہ کی تاکید بھی نہیں تھی کہ فرض کا درجہ دیا جائے۔

حاصل یہ ہے کہ حدیث متواتر اور واحد کے درمیان حدیث مشہور کی تقسیم کر کے ائمہ احناف نے تمام احادیث کو ان کا حق دیا، خاص کر کے اخبار آحاد کو اعتدال بخشا، جب کہ دیگر ائمہ نے مشہور کو آحاد کی قسم قرار دے کر دونوں کے درمیان میں زیادہ فرق نہیں کیا۔

(۳) تعریف مشہور میں اختلاف کی بناء پر محدثین واحناف کے مابین دو جگہوں میں اختلاف:

(الف) محدثین کے نزدیک شہرت حدیث کے لیے ضروری ہے کہ عہد صحابہ میں بھی رواۃ کی تعداد تین سے کم نہ ہو، احناف کے نزدیک یہ شرط نہیں۔

(ب) احناف کے نزدیک شہرتِ حدیث اور اس کی قبولیت عہد صحابہ کے بعد ضروری ہے، محدثین کے نزدیک شہرت حدیث کے لیے یہ شرط کافی نہیں؛ بل کہ ضروری ہے کہ عہد صحابہ میں بھی رواۃ کی تعداد تین سے کم نہ ہو۔

اس فرق کی بناء پر احناف کے نزدیک بعض احکام کا ثبوت:

(الف) حدیث مشہور، موجب علم طمانینت ہے؛ نہ کہ علم یقینی۔

(ب) حدیث مشہور کے منکر کو گمراہ قرار دیا جائے گا؛ نہ کہ کافر۔

(ج) احادیث مشہورہ کے ذریعہ عموم کتاب کی تخصیص، مطلق کی تقیید اور اس پر زیادتی جائز ہے۔

(۴) قبولیت خبر کے لیے محدثین واحناف کے نزدیک وہ ہی شرائط ہیں، جو حدیث صحیح کے لیے ہیں؛ البتہ حنفیہ کے نزدیک ضبط کی ایک تقسیم خاص ہے۔

(۵) محدثین کے انقطاع اور احناف کے انقطاع میں فرق ہے، احناف انقطاع فی الحدیث کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں: انقطاع ظاہر، انقطاع باطن۔ پھر انقطاع ظاہر کی چار قسم ذکر کرتے ہیں: مرسل صحابی، مرسل اھل قرن ثانی وثالث، مرسل عادل فی کل عصر، تعارض وصل وارسال۔ اور انقطاع باطن کی دو قسمیں کرتے ہیں: انقطاع بالمعارضۃ، انقطاع نقصان وقصور فی الناقل، پھر انقطاع بالمعارضۃ کی متعدد قسمیں ہیں: عرض الحدیث علی القرآن، عرض الحدیث علی السنۃ المشھورۃ، عرض خبر الواحد علی ماتعم بہ البلوی، وغیرہ۔ اسی طرح انقطاع نقصان وقصور فی الناقل کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔

(۶) حنفیہ کے نزدیک انقطاع، اسناد و متن دونوں کو شامل ہے؛ جب کہ محدثین کے نزدیک انقطاع سند کے ساتھ خاص ہے۔

(۷) محدثین واحناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرسل منقطع کی اقسام میں سے ہے، اگرچہ اس کی تعریف وحکم کے سلسلہ میں دونوں کا نظریہ الگ الگ ہے۔

(۸) حنفیہ کے نزدیک یہ تقسیم انقطاع ظاہر و باطن سے معروف ہے اور محدثین کے نزدیک یہ تقسیم ظاہر و خفی سے مشہور ہے۔

(۹) انقطاع بالمعارضۃ اور اس کی اقسام بیان کرنے میں حنفیہ متفرد ہیں۔

(۱۰) محدثین نے انقطاع فی السند کی متعدد تقسیمات کی ہیں، اور ہر ایک کو الگ الگ نام سے موسوم کرتے ہیں، جب کہ حنفیہ کل تقسیمات پر منقطع یا مرسل کا اطلاق کرتے ہیں۔

(۱۱) محدثین کے نزدیک انقطاع اپنی تمام اقسام سمیت ضعیف ومردود کی قبیل سے ہے، اور حنفیہ کے نزدیک انقطاع ظاہر صحت حدیث کے لیے مانع نہیں بنے گی، بر خلاف انقطاع باطن کے۔

(۱۲) محدثین کے نزدیک مرسل، تابعی کے ساتھ خاص ہے یعنی تابعی کا ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کہنا ہی مرسل ہے، اگر کوئی اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہے، تو وہ مرسل نہیں؛ حدیث کی کوئی اور قسم ہوگی، جب کہ محققین حنفیہ کے نزدیک اہل قرون ثلاثہ میں سے کوئی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہے، اسے حدیث مرسل ہی کہا جائے گا، البتہ اس شرط کے ساتھ مرسل روایت مقبول ہوگی کہ مرسِل ثقہ ہو اور ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہو۔

(۱۳) محدثین کے نزدیک زیادتی ثقات فی المتن اس شرط کے ساتھ مقبول ہے کہ دوسرے ثقات کی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہو اور حنفیہ کے نزدیک زیادتیٔ ثقات فی

المتن مقبول ہے، چاہے مخرج حدیث متحد ہو یا مختلف، لیکن مخرج حدیث کے مختلف ہونے کی صورت میں عمل دونوں حدیثوں پر کیا جائے گا، یعنی عام اپنے عموم پر اور مطلق اپنے اطلاق پر باقی رہیں گے۔

(۱۴) احناف ومحدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص عام بول چال میں کذب بیانی سے توبہ کر چکا ہو، اس کی روایت مقبول ہے؛ لیکن حدیث نبوی میں کذب بیانی سے توبہ کر لینے والے راوی کے بارے میں اختلاف ہے، جمہور محدثین کے نزدیک اس کی روایت مقبول نہیں ہے، حنفیہ اور بعض محدثین فرماتے ہیں کہ صحت توبہ کے بعد اس کی روایت مقبول ہے۔

(۱۵) عادل کا ضبط وحفظ میں غیر معروف راوی سے روایت جمہور احناف کے نزدیک تعدیل کی دلیل ہوگی؛ لیکن قرون ثلاثہ کی قید کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

(۱۶) راوی مبہم کی حدیث محدثین کے نزدیک مردود ہے، اس کے ذات وحال کے مجہول ہونے کی وجہ سے اور حنفیہ کے نزدیک اس شرط کے ساتھ مقبول ہے کہ وہ قرون ثلاثہ میں سے ہو۔

(۱۷) فقہ حنفی میں آثار صحابہ کی بڑی اہمیت ہے، ایسے اقوالِ صحابہ، جن میں اجتہاد ورائے کا کوئی دخل نہ ہو اور اس سلسلہ میں ایک ہی صحابی کا قول منقول ہو، صحابہ کے درمیان اختلاف منقول نہ ہو، حنفیہ اور اکثر فقہاء کے نزدیک حدیث نبوی ہی کے حکم میں ہیں، اور ایسے اقوال، جن میں اجتہاد ورائے کی گنجائش ہو، اگر ایسے اقوال کتاب وسنت کی نص سے معارض ہوں، تو حجت نہیں، اگر صحابہ میں اس مسئلے پر اختلاف رہا ہو، تب بھی حجت نہیں، اگر نص سے متعارض بھی نہ ہو اور کسی اور صحابی سے اس کے خلاف منقول نہ ہو یا اس مسئلے میں کسی اور صحابی کی واضح رائے ہی مروی نہ ہو، تو یہ اقوال بھی حنفیہ کے نزدیک حجت ہوں گے۔

اگر امام اعظم نے کسی مسئلے میں قول صحابی پر عمل نہیں کیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی

دوسرا سبب ہے، یا اس میں صحابہ کی آراء ہیں، جن پر امام صاحب مطلع ہوئے، تو اس وقت امام اعظم ترجیح کی صورت اختیار فرماتے ہیں۔

اگر صحابہ کے کسی مسئلے میں متعدد اقوال ہیں، تو امام صاحب کا اسلوب یہ ہے کہ ایسے قول کو اختیار فرماتے ہیں، جو کتاب اللہ کی دلالت کے زیادہ قریب ہو، یا منہج شرع اور اس کی طبیعت کے موافق ہو۔

(۱۸) حنفیہ کے نزدیک تلقی بالقبول کو بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، نیز حنفیہ کے نزدیک حدیث ضعیف بھی قیاس پر مقدم ہے، نیز محدثین وحنفیہ کے نزدیک ضعیف حدیث کی مراد میں فرق ہے، حنفیہ کے نزدیک حدیث ضعیف سے مراد حسن لغیرہ ہے؛ نہ کہ متأخرین کی اصطلاحی ضعیف، نیز فقہ حنفی کے دراسے سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ بعض اوقات سند میں ضعف کے باوجود شریعت کے عمومی مزاج و مذاق سے مطابقت کی وجہ سے مقبول ہوتی ہے اور بعض روایتیں سند کے اعتبار سے قوی ہوتی ہیں؛ لیکن شریعت کے عام اور مسلم اصول وقواعد کے خلاف ہونے کی بناء پر مردود ہوتی ہے۔

(۱۹) جمہور محدثین فقہاء روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ روایت بالمعنی کرنے والا دلالت الفاظ اور اس کے مواقع کے اختلاف کو پہچانتا ہو؛ لیکن متأخرین حنفیہ نے مجملاً اس کی رخصت دی ہے، اور تفصیلاً بعض اقسام سنت میں اس کو جائز قرار نہیں دیتے، چناں چہ حنفیہ اس کی پانچ اقسام ذکر کرتے ہیں اور دو میں جائز قرار دیتے ہیں۔

(۲۰) جمہور فقہاء ومحدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ راوی کا عمل یا اس کا فتویٰ اس کی روایت کے خلاف ہونا حدیث میں موجب جرح نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک اس کی تین حالتیں ہیں: (۱) راوی کا عمل یا اس کا فتوی ان کی روایت کردہ حدیث سے پہلے ہوگا یا بلوغ

سے پہلے ہوگا۔(۲) ان دونوں کا علم نہ ہو سکے۔(۲) روایت بلوغ کے بعد ہو۔(۳) پہلی دوصورتوں میں جواز کے قائل ہیں اور اخیری صورت میں عدم جواز کے۔

(۲۱) حنفیہ کے نزدیک جرح قبول کرنے کے لیے تین شرائط ہیں:

(۱) جرح جرح مفسر ہو۔(۲) سبب جرح بالاتفاق جرح کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ (۳) جرح عصبیت اور عداوت کی بناء پر نہ ہو۔

تفسیر:

تفسیر میں جلالین کے علاوہ مختصر تفسیر ابن کثیر یا احناف کی تفاسیر میں سے مدارک التنزیل رکھی جاوے۔

اصول تفسیر میں صرف الفوز الکبیر کافی نہیں ہے، قواعد التفسیر، علوم القرآن اور دراسۃ القرآن کے عنوان سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، یا کم ازکم حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی علوم القرآن اور جزیرۃ العرب کے منتخبات یا خلاصہ ہی پڑھایا جاوے، تفسیر میں صرف جلالین کافی نہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں ترجمۂ کلام پاک کے گھنٹوں میں لغوی، نحوی، صرفی وبلاغتی تحقیقات کے بجائے صرف تفسیری کلام ہوتا ہے، جبکہ اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن کی روشنی میں طلبۂ عزیز کو یہ فنی معلومات فراہم کی جاسکتی ہے، ہمارے ترجمہ وتفسیر کے اسباق میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور عوامی درس قرآن کی مجلس کی طرح سادہ مضامین بیان کئے جاتے ہیں، اس کے بجائے ترجمہ کے اسباق میں فنی بحث اور صحیح ترجمہ وشان نزول بتادیا جاوے اور تفسیر میں سلف کے اقوال تفسیر ماثور سے نقل کئے جاوے، اور جدید اعتراضات کے جوابات دیئے جاوے یہ بہتر ہوگا، معقولات اور فنون آلیہ

کوتو معقولات کی روشنی میں سمجھایا جاوے لیکن منقولات کوتو منقولات سے ہی سمجھانا مناسب ہوگا، اس میں منطقی وفلسفی انداز کی تفسیریں مناسب نہیں ہوگی۔

نصاب کے علاوہ خارج میں کچھ کتابیں اساتذہ کی نگرانی میں رکھی جاوے یا ابتدائی درجات میں ان کو رکھا جاوے، اس میں جغرافیہ کی مختصر کتابیں، ہندوستان اور مسلمان، مسلم مما لک، اور جزیرۃ العرب وغیرہ شامل ہیں۔اسی طرح سیرت وتاریخ کی کتابیں بھی خارج میں رکھی جاوے۔

انگلش کے گھنٹے میں ایک دو دن جنرل نالج کو رکھا جاوے۔انگلش کا دارالعلوم ندوۃ العلماء والا کورس رکھا جاوے یا اقراء پبلی کیشنس شکاگو والا کورس جو ممبئی میں ملتا ہے وہ بہت شاندار اور مناسب ہے۔

ہمیں تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، اصول قانون، سیاست، انگلش اور معلومات عامہ وغیرہ کی بنیادی کتابیں ہمارے طلبۂ عزیز کو پڑھانی ہیں، لیکن اس کو ہمارے درس نظامی کے تابع رکھکر پڑھائی جاوے، کسی بورڈ سے منسلک ہونا یا تعلیم کی وحدت کے عنوان سے ہمارے طلبۂ عزیز کو سرکاری بورڈ کے امتحانات میں شریک کرنا یہ مناسب نہیں ہے، اس کو طلبۂ عزیز اپنی دینی ضرورت محسوس کریں، دنیوی ترقی کا زینہ نہ قرار دیں۔

اس کے لئے دعوت وتبلیغ سے منسلک انگلش کے اساتذہ ہمیں میسر آسکتے ہیں، جو یہ کام دینی ماحول میں حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ پھر حضرات اساتذۂ کرام کی جماعت بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہے۔

{نصاب تعلیم}

برائے دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات، الہند

{فارسی اول}

کتاب	ساعات
آمدن سی لفظی-کریما-ہماری بادشاہی	۱
آسان فارسی قواعد حصہ:۱-ہندوستانی جغرافیہ مع تاریخ وشہریت	۲
چہل سبق-اسلام کیا ہے؟	۳
دین کی باتیں از اول تا صفحہ ۱۸۹ تک (خلاصہ بہشتی زیور)	۴
دین کی باتیں ۱۹۰ تا ختم کتاب	۵
قرأت وتجوید (مفتاح التجوید)	۶
کتابت واملاء (سیرت خاتم الانبیاء)	۷
انگریزی (std:5)	۸

{فارسی دوم}

کتاب	ساعات
بوستاں، قصص النبیین:۱	۱
گلستاں-الدروس التصریفیہ: از اول تا صفحہ ۵۵	۲
بین الاقوامی جغرافیہ-الدروس التصریفیہ: از ۵۶ تا ختم کتاب	۳

۴ جدید عربی ایسے بولئے

۵ تمرین الصرف-الطریقۃ العصریہ حصہ ا

۶ قرأت وتجوید (جمال القرآن)

۷ کتابت واملاء (ہماری بادشاہی)

۸ انگریزی (std:6)

ہدایات:

گلستاں: مقدمہ: ۷، باب دوم: ۳۹ باب ہفتم: ۲۷ (کل ۷۲ صفحات)

بوستاں: مقدمہ: ۷، باب چہارم: ۳۰ باب ہفتم: ۱۹ (کل ۵۶ صفحات)

{عربی اول}

کتاب	ساعات
الدروس النحویہ مکمل-شرح مائۃ عامل مکمل	۱
معلم الانشاء: ا مکمل- قصص النبیین: ۲	۲
تدریب الصرف مکمل	۳
القرأۃ العربیہ: ۲	۴
الطریقۃ العصریہ: ۲ مکمل-مقرر السیرۃ النبویہ	۵
قرأت وتجوید (جامع الوقف)	۶
جنزل نالج	۷
انگریزی (std:7)	۸

{عربی دوم}

ساعات	کتاب
۱	ہدایۃ النحو مکمل
۲	تدریب النحو مکمل
۳	الفقہ المیسر مکمل-المختصر القدوری (باب النکاح والطلاق)
۴	علم الصیغہ (ڈابھیل والی)-دروس خاصیت مکمل
۵	القرأۃ العربیہ: ۳-تاریخ ہند مکمل
۶	تیسیر المنطق-مرقات از اول تا ۳۶ مکمل
۷	قرأت وتجوید (فوائد مکیہ)
۸	انگریزی (std:8)

{عربی سوم}

ساعات	کتاب
۱	الموجز فی اصول الفقہ مکمل
۲	المختصر القدوری (کتاب البیوع تا ختم کتاب)
۳	القرأۃ العربیہ: ۴
۴	صفوۃ البیان (ترجمۂ کلام پاک از سورۂ احقاف تا ختم قرآن کریم)
۵	شرح التہذیب، جمہوریۂ ہند کا دستور اساسی مکمل
۶	شرح قطر الندی وبل الصدی
۷	قرأت وتجوید (المقدمۃ الجزریہ)
۸	انگریزی (std:9)

{عربی چہارم}

ساعات	کتاب
۱	اصول السرخسی حصہ ۱ ص ۲۸۵
۲	ہدایہ اولین: (از باب الطہارت تا باب الحج) -شرح عقود رسم المفتی
۳	ہدایہ اولین: (از باب النکاح تا باب العدت) مؤطا امام مالکؒ: ۵۹ صفحہ
۴	صفوۃ البیان: (ترجمۂ کلام پاک از سورۂ فاتحہ تا سورۂ یوسف ختم)
۵	دروس البلاغہ مکمل -مؤطا امام محمدؒ
۶	دیوان متنبی (از صفحہ ۵۷ تا ۱۸۳) - جزیرۃ العرب،
۷	الادب العربی بین عرض ونقد
۸	قرأت وتجوید (خلاصۃ البیان)

ہدایات:

موطا امام محمد: کتاب الضحایا، الفرائض، الایمان والنذر، البیوع والرباء، واللقطة ـص ۲۶۹ تا ۲۸۹ وص ۳۱۷ تا ۳۶۸ (کل ۶۱ صفحات)

مؤطا امام مالک: کتاب النکاح والطلاق ، الایلاء، والخلع، العدۃ والرضانۃ، کتاب الجامع واهل القدر ـ ۱۸۹ تا ۲۲۴ و ۳۵۸ تا ۳۹۲ ـ (کل ۶۹ صفحات)

ہدایہ اولین: کتاب الطہارت تا کتاب الحج، ص ۱ تا ۲۳۱

ہدایہ اولین: کتاب الحج تا کتاب العدت، ص ۱ تا ۲۳۱

دیوان متنبی: ص ۵۷ تا ۱۸۳

{عربی پنجم}

ساعات کتاب

۱ اصول السرخسی حصہ ۲ ص ۲۵۴

۲ ہدایہ اولین: (از باب العدۃ تا باب الوقف)-اصول المسائل الخلافیہ

۳ ہدایہ آخرین: (از باب البیوع تا باب الصلح)-اسلام اور جدید معیشت وتجارت

۴ صفوۃ البیان: (ترجمۂ قرآن کریم از سورۂ رعد تا سورۂ احقاف) عقیدۃ الطحاوی

۵ معین الفرائض-سراجی-اسلامی مذاہب

۶ جدید فلسفہ اور علم الکلام-قادیانیت-تقابل ادیان

۷ تیسیر مصطلح الحدیث-مشکوۃ از اول تا صفحہ ۱۱۰

۸ الفوائد المشوق الی علوم القرآن وعلم البیان

ہدایات:

ہدایہ اولین: کتاب العدت تا کتاب الوقف، ص ۴۲۲ تا ۶۴۶

ہدایہ آخرین: کتاب البیوع تا کتاب الصلح، ص ۱ تا ۲۲۸

اصول المسائل الخلافیہ: ص ۲۲

مشکوۃ المصابیح: ص ۱ تا ۱۱۰

{عربی ششم}

ساعات کتاب

۱ مشکوۃ شریف (از باب الوتر تا باب الاقضیہ)

۲ مشکوۃ شریف (از کتاب الجہاد تا ختم کتاب)

۳ ہدایہ آخرین (از باب الصلح تا احیاء الاموات)

۴ ہدایہ آخرین (از باب احیاء الاموات تا باب الوصایا)

۵ مختصر تفسیر ابن کثیر حصہ ۱

۶ مختصر تفسیر ابن کثیر حصہ ۲

۷ مختصر تفسیر ابن کثیر حصہ ۳

۸ نفحات العبیر فی مہمات التفسیر

ہدایات:

ہدایہ آخرین : کتاب الصلح تا کتاب احیاء الاموات ص۲۲۹ تا ۴۶۱

ہدایہ آخرین: کتاب احیاء الاموات تا کتاب الوصایا ص۴۶۱ تا ۶۸۵

مشکوۃ المصابیح: ص۱۱۱ تا ۳۲۸

مشکوۃ المصابیح: ص۳۲۹ تا ۵۸۴

{عربی ہفتم}

ساعات	کتاب
۱	مختصر تفسیر ابن کثیر حصہ ۴
۲	بخاری شریف
۳	بخاری شریف
۴	مسلم شریف
۵	ترمذی شریف اول - ابن ماجہ
۶	ترمذی شریف ثانی - نسائی شریف

۷	ابوداود شریف
۸	طحاوی شریف

{تخصص فی الفقہ والافتاء}

ساعات	کتاب
۱	الاشباہ والنظائر-شرح القواعد الفقہیہ
۲	شرح عقود رسم المفتی
۳	معین الحکام-مشق قضاء
۴	ابواب الاجتہاد-قواعد المقاصد عند الامام الشاطبی، فقہی فیصلے-اسلام اور جدید معیشت وتجارت
۵	قواعد الفقہ -سراجی
۶	مشق فتاوی نویسی
۷	مشق فتاوی نویسی
۸	مشق فتاوی نویسی

{تخصص فی الحدیث الشریف}

ساعات	کتاب
۱	تخريج الحديث نشأته ومنهجيته
۲	قواعد فی علوم الحدیث
۳	شرح مشکل الآثار (احادیث کی تخریج)
۴	شرح علل الترمذی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

۵ مشق تخریج الحدیث

۶ مشق تخریج الحدیث

۷ مشق تخریج الحدیث

۸ مشق تخریج الحدیث

{تکمیل العلوم والفنون}

ساعات	کتاب
۱	دلائل الاعجاز، تلخیص المفتاح
۲	شافیہ
۳	شرح جامی
۴	ابواب الاجتہاد-قواعد المقاصد عند الامام الشاطبی، فقہی فیصلے- اسلام اور جدید معیشت وتجارت
۵	الباعث الحثیث
۶	قواعد الفقہ
۷	سلم العلوم
۸	مشق استفتاء

●●●●●

فارغین میں مطلوبہ صلاحیتوں اور استعداد کی کمی کے اسباب

اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صاحب فرماتے ہیں:

اگر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ موجودہ دور کے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا کیا معیار ہے؟ وہ علوم دینیہ پر کتنی دسترس رکھتے ہیں، مضامین کے مآخذ کا مطالعہ کس حد تک ہے؟ قدیم مصادر سے استفادہ کی صلاحیت کتنی پیدا ہوئی ہے؟ عربی دانی اور عربی خوانی میں وہ کس سطح پر ہیں؟ علوم حکمت وفلسفہ سے وہ کہاں تک آشنا ہیں؟ اور عصری مضامین سے ان کی کتنی واقفیت ہے؟ کیونکہ یہ وہ مضامین ہیں جو کم وبیش ہمارے تمام دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اور یہاں سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا جائزہ انہی مضامین کے تعلق سے لیا جانا مناسب ہے۔

اس حوالے سے اگر ہم دینی مدارس کے فارغین کی استعداد پر ایک گہری نظر ڈالیں تو اس بات سے انکار مشکل ہوگا کہ فارغین کی اکثریت میں مطلوبہ استعداد کی کمی پائی جاتی ہے، علوم دینیہ یعنی تفسیر وحدیث اور فقہ اسلامی، جو ان کی تعلیم کا مرکزی محور ہیں، اور آٹھ سے دس سال تک کی وسیع تعلیم کا بڑا حصہ ان ہی مضامین کی تدریس وتفہیم میں خرچ کیا جاتا ہے، ان علوم پر دسترس حاصل کر لینے والے فارغین کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق شاید دس فیصد سے زائد نہ ہو، بڑی اکثریت ان مضامین میں بھی افسوسناک حد تک کمزور صلاحیت کی حامل نکل رہی ہے اور اس افسوسناک صورت حال کا اندازہ اس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب وہ عربی زبان کی نصابی یا غیر نصابی کتابوں کی صحیح عبارت خوانی سے بھی قاصر ہوتے ہیں، عبارت فہمی تو اس سے آگے کا مرحلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسہ کی سند فراغت دراصل

علوم دینیہ کے کمرہ میں داخل ہونے کی کنجی ہے، یعنی ایک فارغ التحصیل گویا اب اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے طور پر شرعی مآخذ کا مطالعہ کرکے علم وتحقیق کے ناپیدا کنار سمندر سے لعل وگہر نکال سکے؛ لیکن جب فارغین کی اکثریت اپنے شرعی مضامین کی نصابی سطح پر کمزور ہو تو ان سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شرعی علوم کے اولین اوراہم مصادر ومراجع کا مطالعہ کرسکیں گے، عصری مضامین سے واقفیت توان کے لئے نا قابل ذکر ہی امر ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ان فارغین پر نظر ڈالیں گے جو آج کے دور انحطاط میں بھی قابل رشک صلاحیتوں اوراچھی استعداد سے آراستہ ہوکر نکل رہے ہیں، جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی کہی جاسکتی ہے۔ توہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک فاضلِ مدرسہ سے جو صلاحیت مطلوب ہے اس میں وہ کس معیار پر ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی توقع کی جانی چاہیئے کہ وہ شرعی علوم کی نصابی کتابوں پر اچھی نظر رکھتے ہوں گے، متداول شرعی مسائل کا انہیں علم ہوگا، ان کی عربی دانی بھی اس قدر ہوگی کہ وہ شرعی مآخذ ومصادر کا بطور خود مطالعہ کرلیں اورجس حدتک انہیں عصری مضامین سے واقفیت کا موقع میسر ہوسکا ہوگا، انہوں نے ان میں بھی محنت کی ہوگی۔ ہماری بجا توقع ہے کہ فضلاء مدارس کی کم تعداد ہی سہی؛ لیکن ممتاز سمجھے جانے والے طلباء اپنی فراغت کے وقت ان مذکورہ صلاحیتوں سے آراستہ ہوجاتے ہوں گے۔

اب ہم ان دونوں قسموں کے فضلاء کی صلاحیتوں اوران کے پس پشت کارفرما عوامل و اسباب پر ایک تنقیدی اورتجزیاتی نظر اس تمنائے ناپختہ کے ساتھ ڈالتے ہیں کہ یہ گفتگو کسی ذہن کو کریدا اورکسی قدم کو مہمیز کرسکے۔

جہاں تک فارغین کی اکثریت کا معاملہ ہے جو بہت زیادہ پختہ صلاحیتوں سے آراستہ نہیں ہو پارہے ہیں، ایسے فضلاء کی ایک بڑی کھیپ ہر سال بڑے مدارس سے فارغ ہورہی

ہے، انہوں نے یہاں اپنی عمر عزیز کا بڑا ہی قیمتی عرصہ گذارا ہوتا ہے، ایسا عرصہ جو نہ صرف ان کی سیرت وکردار کی پختگی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے؛ بلکہ ان کے مستقبل کی رخ بندی اور کارحیات کی تعیین وتشکیل میں بھی مؤثر عامل بنتا ہے، یہ درست ہے کہ یہ فارغین آٹھ دس سالہ تعلیم کے بعد دین کے مبادی سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں، حلال وحرام کے ضروری مسائل سے ان کے گوش آشنا ہو گئے ہوتے ہیں، دینی و مذہبی اصطلاحات اور قرآن وحدیث سے تعلق رکھنے والی ضروری باتوں، نیز سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہد صحابہؓ کی تاریخ سے وہ کسی قدر شناسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یہ معلومات یقیناً بیش قیمت اثاثہ ہیں، یہ مطلوبِ زندگی اور سرمایۂ حیات ہیں، یہ بلاشبہ وہ روشنی ہے جس کے بغیر زندگی تاریک اور منزل روپوش رہتی ہے، اس لئے ہم اس سرمایہ کو دل وجان سے عزیز رکھتے ہیں، اور اس سے آراستگی کو اپنی ایسی متاع سمجھتے ہیں جس سے دستبرداری زندگی کی معنوی موت ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سوال ہمارے ذہنوں میں بار بار ابھرتا ہے، وہ یہ کہ کیا اس سرمایہ سے آراستگی کے لئے کم وبیش دس برس کا طویل عرصہ درکار ہے؟ اگر اس طولانی دورانیہ کے بعد فارغ التحصیل طالب علم علوم شرعیہ کے میدان میں داد تحقیق نہیں دے سکتا، عربی دانی اور عبارت فہمی کی ایسی قابلیت اس کے اندر نہیں پیدا ہوتی کہ وہ اسلامی کتب خانہ کے لالہ زار چمن کی سیر کر سکے اور خوش رنگ وخوش ذائقہ علمی پھلوں سے شادکام ہو سکے، اور نہ ہی وہ علم و فضل کے اس مقام بلند پر فائز ہو سکتا ہے جو انسانیت کی راہ حیات کے لئے منارہ نور قرار پا سکے، تو ایسے سینکڑوں فارغین کے لئے یہ طویل عرصہ اپنے جواز کے لئے ہم سے ضرور جواب طلب کرتا رہے گا اور اپنے مقصد کی شناخت کا ایک بڑا سوال پیدا کرتا رہے گا۔

صورت حال اس وقت مزید محتاج توجہ ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیس تا

پچیس برس کی ابھرتی عمر کے ان فارغین کے لئے اس وقت نہ تو مزید تعلیم کے لئے کوئی متعین راہ سامنے ہوتی ہے، نہ وہ معاش کے فریضہ کی سمت میں کسی واضح نقشہ سے واقف ہوتے ہیں، ان کی اصل شناخت تو دینی تعلیم کے فارغ التحصیل کی ہوتی ہے، اور اس شناخت کے تقاضوں کی ادائیگی ان کی استعداد سے بالا بنی ہوتی ہے۔ پس نہ تو دینی مدارس میں تدریس کے دروازے ان کے استقبال کے لئے کھلے ہوتے ہیں، نہ مذہبی وملی اداروں میں ان کے لئے موزوں خدمت موجود ہوتی ہے، اور نہ دیگر مذہبی ضروریات کے محدود مواقع اتنی بڑی تعداد کے لئے سال بہ سال کفایت کر پاتے ہیں، نتیجہ سامنے ہوتا ہے کہ وہ کسی منصوبہ بندی اور مزاج ومناسبت سے صرف نظر کرتے ہوئے اور حالات کی تند وتیز موجوں کے حوالہ ہوکر کارگہہ حیات کی جد وجہد میں افتاں وخیزاں مصروف ہوجاتے ہیں۔

اس صورت حال کی بنیادی وجہ راقم کی نظر میں ہمارا موجودہ تعلیمی نظام ہے جو پانچ سات برسوں کی غیر منظم ابتدائی تعلیم کے بعد جب اصل دینی تعلیم یا عربی تعلیم کے درجہ اول میں طالب علم کو داخل کرتا ہے تو آٹھ دس برسوں تک مصروف رکھ کر ''عالم'' کے سندی درجہ تک پہنچنے کے بعد ہی تعلیم کی تکمیل کا پہلا موقع فراہم کرتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کوئی طالب علم اپنی تعلیم نامکمل تو چھوڑ سکتا ہے؛ لیکن کسی سند کے ساتھ مختصر تعلیمی مرحلہ مکمل کرنا چاہے تو ایسا کوئی نظم اس کے سامنے نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف آٹھ دس برسوں کی عالمیت یا فضیلت ہی پہلا مرحلہ ہوتا ہے، پس ایسے وہ تمام طلبہ جو اپنے سرپرستوں، والدین یا کسی خیر خواہ کی تحریک کے تحت دینی تعلیم کا رخ کرتے ہیں، ان سب کے لئے- اس بات سے قطع نظر کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے، وہ اس تعلیم میں کس قدر دلچسپی دکھا پا رہے ہیں، اور ان کی تعلیمی کارکردگی کیسی رہ رہی ہے- تعلیم کی پہلی منزل ہی آٹھ دس برسوں پر محیط عالمیت یا فضیلت مقرر ہوجاتی ہے۔

اب اگر طلبہ عمر کی دو دہائی مکمل کرتے ہوئے ''عالم'' کی باوقار دستار فضیلت سر پر رکھ کر فارغ التحصیل ہوتے ہیں؛ لیکن اس کے تعلیمی تقاضوں کی تکمیل کے لئے وہ ذہنی طور پر آمادہ اور مطلوبہ قابلیت سے آراستہ نہیں ہیں، تو اس کی وجہ نہ تو وہ خود ہیں، نہ ان کے اساتذہ اور نہ نصاب درس، کیونکہ اسی نصاب و استاذ کے زیر عمل اچھی صلاحیتوں والے فضلاء بھی فراغت حاصل کر رہے ہیں؛ بلکہ نظام تعلیم ہے کیونکہ یہ فارغین دس سالہ نظام کی تکمیل کے بعد جس سرمایہ سے آراستہ ہو کر نکل رہے ہیں وہ سرمایہ محض دو تین سالہ تعلیم میں فراہم ہو سکتا ہے۔ اگر اس نظام تعلیم نے انہیں ضروری شرعی علوم اور سیرت نبوی و تاریخ اسلامی پر مشتمل تین سالہ تعلیم کے بعد اس طور پر ایک مرحلہ مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا ہوتا؛ کہ اس کے بعد وہ اپنے ذوق کے مطابق مزید تعلیم کی کوئی راہ منتخب کرتے یا اپنے معاش کی کسی تیاری سے وابستہ ہو جاتے، تو اس صورت حال سے جڑے کئی مسائل جنم ہی نہ لیتے، نہ تو خود یہ فضلاء اس احساس کے بوجھ میں دبے ہوتے کہ وہ عالم دین ہیں؛ لیکن مطلوبہ علمی قابلیتوں سے عاری ہیں، اور نہ یہ سوال اٹھتا کہ وہ اب کیا کریں؟ کیونکہ اس ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ لازما کسی تعلیم یا تیاری کی جانب متوجہ ہو جاتے؛ بلکہ یہ فارغین مزید دوہرے فائدے سے مستفید ہوتے، ایک طرف وہ اپنی عمر کے ان اہم برسوں کو اپنے ذوق و رجحان کے مطابق مستقبل کی رخ بندی میں صرف کرتے اور دوسری جانب ابتدائی دینی تعلیم کا یہ مرحلہ ان کی زندگی کو ہمیشہ دین و اخلاق کے نور سے منور رکھتا، اور ایک باعمل مسلمان بن کر وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں مصروف عمل ہوتے۔

یہ گفتگو ان فارغین مدارس کی اکثریت کے تعلق سے تھی جو متوسط درجہ کی یا اس سے کمتر صلاحیت لے کر فارغ ہو رہی ہے، سب سے افسوسناک صورت حال اسی گروہ کی ہے، جن کی نہ تو مدارس کے علمی و تحقیقی حلقہ میں پذیرائی ہے اور نہ وہ عصری علوم کی راہ کے اچھے رہرو سمجھے

جاتے ہیں اور نہ معاشی جد وجہد کی کسی راہ سے وہ آشنا ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان فضلاء مدارس کا تعلق ہے جو اچھی صلاحیت کے حامل کہے جاتے ہیں، تو وہ روایتی طرز تعلیم اور معیار تعلیم کے مطابق اپنی قابل قدر محنت اور قابلیت کی شناخت بنا لیتے ہیں، اسی گروہ سے دینی مدارس کو قابل اساتذہ فراہم ہوتے ہیں، اور تحقیق وتحریر کے میدانوں میں بھی ان کی جولانیوں سے اچھی توقعات وابستہ رہتی ہیں، ان کی صلاحیتوں اور استعداد کا اندازہ اگر ان کے رائج نصاب درس اور موجود تعلیمی ماحول سے لگایا جائے تو ان کی استعداد وقابلیت اطمینان بخش قرار دی جائے گی۔

لیکن ان کی بابت بھی ایک گمبھیر سوال ہنوز برقرار رہتا ہے اور یہی ہماری گفتگو کے بالکل آغاز میں اٹھائے گئے پہلے سوال کی تفصیل بھی ہے کہ دینی مدارس کے فارغین سے کس قسم کی صلاحتیں مطلوب ہیں؟ اور کس استعداد کی ان سے توقع کی جانی چاہئے؟ ان فارغین کی بابت سوال یہ ہے کہ کیا زمانے کے تقاضوں اور ان کے متوقع رول کی نسبت سے بھی ان کی قابلیت اطمینان بخش کہی جاسکے گی؟ یہاں اثبات میں جواب مشکل ہے، موضوع کے اس پہلو پر گفتگو سے پہلے یہاں کچھ سوالات رکھے جاتے ہیں، جن سے بات زیادہ واضح ہو سکے گی، کیا یہ فاضلین عصر حاضر کی مشکلات ومسائل کا اندازہ رکھتے ہیں؟ کیا انہیں اس بات کا علم رہتا ہے کہ اسلامی شریعت اور نظام زندگی پر کیا اعتراضات وارد کئے جارہے ہیں؟ کیا مذہبی تقاریب کے علاوہ مواقع پر وہ اہل علم ودانش سے خطاب کرنے اور ان کے اشکالات دور کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ بلکہ چند سوالات براہ راست ان کے مضمون ونصاب کی بابت پیدا ہوتے ہیں، مثلاً کیا یہ فاضلین اپنے موضوعات یعنی تفسیر وحدیث اور فقہ اسلامی کے میدانوں کی جدید پیش رفت اور نئے رجحانات سے واقف ہوتے ہیں؟ کیا علوم حکمت و

فلسفہ کی ان کی تعلیم عصر حاضر کے متعلقہ مسائل سے انہیں آشنا کرتی ہے؟ اور کیا وہ اپنے بنیادی مضامین کی تعلیم کے ساتھ ان کا تاریخی، تقابلی اور معروضی مطالعہ بھی رکھتے ہیں؟ جواب یہاں بھی نفی کی جانب مائل ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا تعلیم کی کوئی انتہاء ہے؟ اگر نہیں تو ہمارے یہ ذہین طبقہ فضلاء میں سے محدود تعداد ہی کے لئے سہی؛ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے دینی پیغام اور دعوتی کردار کے ساتھ عصری علوم میں سے کسی بھی مضمون میں امتیاز پیدا کر کے اس موضوع پر شریعت اسلامی کی بالا دستی ثابت کریں۔ مثلا پولیٹکل سائنس، سوشیالوجی، اکونومی یا قانون کی تعلیم حاصل کر کے دنیا کو ان کی زبان میں بتا سکیں کہ اسلام کا نظام حکمرانی کیسا شفاف اور عادلانہ ہے، اسلام کا پیش کردہ سماجی نظام کس طرح فطری خوبیوں سے آراستہ اور انسانی رشتوں کو امن وراحت سے آراستہ کرتا ہے، اسلامی معاشیات کیونکر دنیا میں معاشی عدل پیدا کر کے انسانیت کو ان بے شمار معاشی مسائل سے نجات دلاتا ہے، جن کے خطرناک نتائج نے انسانی زندگی کو جہنم زار بنا رکھا ہے، اسی طرح اسلامی قانون کس طور پر حقیقی عدل وانصاف فراہم کرتا ہے، یہ بطور مثال چند مضامین ذکر کئے گئے، ورنہ ماحولیاتی مطالعہ، سماجی عمل اور طب و سائنس وغیرہ کے متعدد مضامین ہیں جہاں ہمارے فضلاء مدارس اگر اپنے دینی پیغام و کردار سے وابستہ رہ کر کچھ کر دکھانے کے جذبہ سے ممتاز مقام حاصل کرتے ہیں، تو وہ نہ صرف ایسی خدمت دین کر سکیں گے جن کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے، بلکہ دین و دنیا کی مصنوعی دوئی کو ختم کر کے نئی مثال قائم کر سکیں گے۔

واضح رہے کہ یہ سوالات ان ہی فضلاء کی بابت ہیں جو نہ صرف ذہین و ذکر اور ممتاز ہیں؛ بلکہ جنہوں نے دینی مدارس کے مروجہ نصاب کو رائج نظام کے تحت اچھی طرح پڑھا ہوتا

ہے، پھر اگر یہ فاضلین اپنے سامنے ایسے بنیادی سوالات رکھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان فضلاء نے محنت سے جی چرایا ہے، یا مقررہ نصاب کو ٹھیک سے نہیں پڑھا ہے، پھر اگر انہیں زمانہ میں ایک مؤثر رول ادا کرنے میں رکاوٹیں درپیش ہیں، تو اس کی وجہ چند سنجیدہ اور غور کے قابل امور ہیں:

اول تو یہ کہ ہمارے یہ ذہین فضلاء اپنی حتی الوسع محنت کر کے بھی اسی نصاب کے دائرہ میں بڑی حد تک محدود رہیں گے، جو ان کے لئے مقرر شدہ ہے، یہ بات کیونکر ممکن ہوگی کہ فقہ اسلامی کی تعلیم میں تو ہم ان مثالوں کی مدد سے تفہیم کا کام لیں جو آج دنیا سے ہی ناپید ہیں اور یہ توقع کریں کہ ہمارے فضلاء جدید مسائل پر رائے دے سکیں گے۔ جب زندگی کا سفر جاری ہے اور مسائل نئے پیدا ہوتے جا رہے ہیں تو ہمارے نصاب میں بھی اس کی شمولیت یا نمائندگی ہونی چاہئے۔

دوسرے یہ کہ علم وتحقیق کا سفر رواں دواں ہے، ہمارے فضلاء کو بھی اسی رفتار کے ہمدوش بن کر سفر جاری رکھنا ہوگا، ورنہ یا تو ہم ان راہوں پر دوبارہ چل رہے ہوں گے جن سے علم وتحقیق کا کارواں گذر چکا ہے، یا ہم ایک انجام پا چکی علمی محنت کا بے ضرورت اعادہ کر رہے ہوں گے، جب کہ بہتیرے نئے کام اور نئی محنتیں ہماری پیش روی کی منتظر ہوں گی، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہمارے نصاب تعلیم کا دائرہ اتنی کشادگی رکھتا ہو کہ وہ اپنے دامن میں جدید پیش رفت اور نئی تحقیقات وخدمات کو سمو لے؛ تاکہ فقہ اسلامی کا فاضل جدید فقہی مباحث اور تحقیقات سے، علم حدیث کا فاضل فن حدیث کے میدان کی بیش قیمت تحقیقات وخدمات سے اور علم تفسیر کا فاضل میدان تفسیر کی پیش رفت اور ضروریات جدیدہ سے کماحقہ واقف ہو۔

تیسرے یہ کہ کسی بھی نصاب کی تدریس میں ایک مؤثر کردار معلمین اور اساتذہ کا ہوتا

ہے،سوال یہ ہے کہ اساتذہ اپنے موضوع کے میدان میں کس حد تک قدیم وجدید معلومات سے آراستہ ہیں؟ طلبہ کی استعداد کے دائرہ اور وسعت سے اس کا گہرا تعلق ہے، ہمارے تعلیمی نظام میں اساتذہ اور معلمین کو ان کے متعلقہ موضوعات پر واقف (Update) رکھنے کا کوئی نظم نہیں ہے؛ حالانکہ تدریسی عمل کے لئے یہ انتہائی ضروری اقدام ہے،ضرورت ہوگی کہ (Refresher Course) کے طرز پر اساتذہ و معلمین کو جدید ترین معلومات سے آراستہ رکھنے کے لئے نظم بنایا جائے۔

چوتھے یہ کہ ہمارے طلبہ ایسے مواقع سے محروم رہتے ہیں جہاں وہ دیگر تعلیمی اداروں اور نظام کا مطالعہ کرسکیں اور دیگر اداروں کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیال کرسکیں، ایسے اسٹڈی ٹورس (Study Tours) ان کے لئے منظم کئے جائیں جہاں وہ ملک کے دیگر مدارس کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیالات اور مباحثوں میں شریک ہوں اور اداروں کا مطالعہ کرسکیں، اس سے نہ صرف ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوگی، بلکہ وہ معاصر مسائل کو سمجھنے اور جواب دینے کی سمت عملی قدم اٹھاسکیں گے۔

فارغین مدارس کی استعداد کے حوالے سے ان کے کردار سے متعلق دو اور باتیں قابل توجہ ہیں:

پہلی یہ کہ مدارس کی تعلیم کا اصل پیغام کردار سازی ہے، اپنی بھی اور دوسروں کی بھی، تعلیم کا سلسلہ خواہ مدرسہ سے فراغت کے ساتھ ختم ہوجائے، یا مزید تعلیم جاری رکھی جائے، یا عمل کے کسی بھی میدان میں مصروفیت اختیار کی جائے، یہ پیغام ان کی زندگی کا لازمی عنصر ہونا چاہئے،اس کے بغیر ان کی عملی استعداد کچھ بھی کارگر نہیں ہوسکتی،اس حوالے سے صورت حال بہت اطمینان بخش نہیں ہے، اس جانب بہت جرأت مندانہ توجہ دینے کی ضرورت ہے،

موجودہ زمانے میں اس پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس رویہ نے نقصان کو بڑھاوادیا ہے کہ اپنے حلقوں میں اس سے چشم پوشی ہو، جب کہ غیروں کی نگاہیں اعتماد کو مجروح کررہی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ دینی تعلیم کی ایک اہم اورنمایاں شناخت یہ رہی ہے کہ یہاں اساتذہ صرف زبانی معلم نہیں ہوتے؛ بلکہ وہ پیکر تعلیم ہوتے ہیں، وہ نئ نسل کی کردار سازی میں زبان سے زیادہ عمل سے کام لیتے ہیں، کہیں ایسا تونہیں کہ دینی تعلیم کی یہ منفرد ''شناخت'' متنوع قسم کے مسائل کے گردوغبار میں دھندلانے لگ گئی ہو، اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ معاصر دینی تعلیم کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ (معاصر دینی تعلیم مشکلات واحوال:۸۶-۹۴)

شرح جامی کے سلسلے میں ایک جائزہ

متحرم مولانا ابراہیم موسی پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز: نوٹرے ڈیم یونی ورسٹی، امریکہ) تحریر فرماتے ہیں:

الفوائد الضیائیۃ یا شرح جامی حالیہ عرصے تک مدارس کے نصاب کا حصہ تھی، اس کتاب میں عربی قواعد کے فلسفے کو موضوع بنایا گیا ہے اوراس کی عالمانہ تشریح وتوضیح کی گئی ہے، اس بنا پر یہ کتاب عربی زبان کے فلسفے سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنی، البتہ دوسرے وہ لوگ جو فلسفہ لسانیات عربی سے خاص شغف نہیں رکھتے، وہ اس کتاب پر نقد کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ کتاب عربی قواعد کے تعلق سے تشریح واظہار سے زیادہ اخفاوابہام پر مشتمل ہے، طلبہ واساتذہ کو یہ شکایت رہی ہے کہ اس کی عبارات ومطالب کو سمجھنا مشقت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ بے مطلب اور محض ضیاع وقت ہے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں بھی اس کتاب کی تدریس کو محض لغو اور فضول ولایعنی تصور کرتا تھا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں اس وقت اس کی نکتہ سنجیوں اور دقائق اور باریک

بینیوں کو سمجھنے سے قاصر تھا، بہت سے اساتذہ صرف اس کتاب کے بعض صفحات کو پڑھا دینے پر اکتفا کر لیتے تھے، بعض اساتذہ اس کی الحاصل اور المحصول کی بحث میں کئی دن صرف کر دیتے تھے، طلبہ کے لیے یہ ساری بحثیں دماغ سوز اور نہایت اُکتا دینے والی ہوتی تھیں۔

ان دنوں میری فہم میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ آخر ان بحثوں کا حاصل کیا ہے؟ اس لیے میں اس کتاب کی کما حقہ قدر شناسی سے بھی بے بہرہ رہا؛ لیکن گزشتہ صدی کی نویں دہائی میں ایک فلسفہ کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے سوئٹزرلینڈ کے ماہر لسانیات فرڈی نانڈ ودسوسیر Ferdinand de Saussure اور فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا (Jacques Derrida) کو پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس سے فلسفہ لسانیات میں میری دلچسپی بڑھ گئی، اب پھر سے شرح جامی کی ثقیل و غامض عبارات کو پڑھنے کے بعد میں حیران رہ گیا کہ یہ تو ''علم دلالت''، علم علامات و اشارات (Semiotics) سے تعلق رکھنے والے مباحث ہیں، یعنی الفاظ- جو حقیقت میں علامات ہیں-کس طرح اپنا کام کرتے ہیں، علامتوں کا عمل دراصل معانی کا عمل ہے، چنانچہ سوال یہ ہے کہ یہ جملہ کہ لڑکا کھڑا ہے (The boy is standing) میں لڑکا (boy) اور ''کھڑا ہے'' (is standing) میں کیا ربط ہے؟ اس جملے کا مطلب ہے کہ یہ زیر تذکرہ ''لڑکا'' لا تعداد لڑکوں میں سے ایک لڑکا ہے۔ Semiotics میں اس عمل کو ''دلالت'' (denoting) اور اس دلالت کا تعلق جس سے ہوتا ہے، اس کو معنی (meaning) کہا جاتا ہے، لیکن لفظ لڑکا (boy) کے مزید معانی بھی ہیں، وہ اس کی ان خصوصیات پر بھی دلالت کرتا ہے جیسے اس کی جسمانی حیوانی زندگی، صاحب عقل ہونا اور اس کے علاوہ اس کی بعض ظاہری خصوصیات جو لڑکا کے معنی مراد کے اظہار کو مزید اضافی معنیٰ عطا کرتے ہوئے تہہ در تہہ معنی کا حامل بنا دیتے ہیں۔

اپنے نہایت دقیق اور فلسفیانہ اسلوب میں ملا جامی نے ابن الحاجب کے اٹھائے گئے ایک نکتے کی تفصیل کی ہے، ابن الحاجب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ فلسفۂ لسانیات میں ایک اسم حرف سے کیوں مختلف ہوتا ہے؟ ابن الحاجب کہتے ہیں کہ اسم ایک بذاتِ خود موجود معنی یا ارادہ پر دلالت کرتا ہے، لفظ کے باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، جبکہ حرف اپنے معنی کے اظہار کے لیے دوسرے الفاظ کا محتاج ہوتا ہے اور اپنا کوئی منفرد معنی نہیں دیتا، اسی بات کی توضیح کے لیے جامی نہایت فلسفیانہ زبان استعمال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسم معنی کی موجودگی کا پتا دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ الفاظ کو متضمن بعض صفات کے معنی کا بھی اظہار کرتا ہے۔ چونکہ عہد وسطیٰ میں پیدا ہونے والی اس نوع کی لسانیاتی بحثوں کو مدارس کے علماء وافاضل آگے نہیں بڑھا سکے، اس لیے اس قبیل کے عمیق و پُرمغز مباحث طلبہ کی کثیر تعداد کے لیے غموض سے پُر اور بے معنی ہوکر رہ گئے، موجودہ فلسفے کو پڑھنے کا یہ فیض ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس بحث کو کافی حد تک سمجھتا ہوں۔

معاصر دور کے جنوبی ایشیا کے مدارس قدیم تعلیمی روایت کی بعض خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں، یہ روایت ایک معلم و مربی کے کردار کو اہمیت دیتی ہے، اس روایت میں کتاب کی مرکزی تدریس پر زور دیا جاتا ہے، مذہبی نصوص کی تشریح وتوضیح کی صلاحیت واستعداد طلبہ کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مزید براں نصاب میں شامل ہر مضمون کے بنیادی اور مرکزی پہلو کو طلبہ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم قدیم نصاب تعلیم سے طلبہ کو بہت کم فائدہ حاصل ہو پاتا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جس اسلوب و انداز میں یہ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں وہ آج کے طلبہ کے ذہن واستعداد سے ہم آہنگ نہیں ہیں، دونوں کے درمیان زبردست خلا کی کیفیت پائی جاتی ہے، نصاب میں شامل کتابوں کے مصنفین اور

اُن کی کتابوں کا تاریخی سطح پر مطالعہ، ان کا سماجی تناظر میں جائزہ، نیز ان کے متون کا تجزیہ طلبہ کے لیے زیادہ مفید اور دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے، علم وتحقیق کے میدان میں باہمی مسابقے کو فروغ دینا اور متنوع علوم کی تعلیم وتدریس طلبہ کے اندر مختلف النوع مضامین کا گہرا شعور پیدا کردیتی ہے، تصویریں، متون کا خاکہ اور کتابوں کے مصنفین ومؤلفین کا جوش وجذبہ اور اُن کے اندر پائی جانے والی غیر معمولی استعداد وصلاحیت جس پر میں نے اس کتاب میں روشنی ڈالی ہے، اس سے ان کتابوں، ان کے مصنفین اور اُن کے موضوعات سے متعلق ایک وسیع اور گہری بحث وگفتگو کا دروازہ کھلتا ہے، یہ چیزیں نہایت اہم ہیں؛ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج مدارس میں اس کو قابل اعتنا تصور نہیں کیا جاتا۔

درس نظامی پر ایک طائرانہ نظر:

درس نظامی کی ایک بڑی اور بنیادی خصوصیت اس کی حرکیت ہے، وہ کسی خاص شخصیت اور زبان ومکان سے بندھا ہوا اور اسی کے دائرے میں بند نہیں ہے، وہ نہ صرف یہ کہ ہندوستانی اصحابِ علم ودانش کے درمیان افکار ونظریات کے تبادلے کی زمین ہموار کرتا ہے؛ بلکہ وہ ان علماء واصحاب فکر ودانش کو ماضی کی مختلف نظریاتی جہات کی حامل اور مختلف تاریخی ادوار اور بلاد وامصار سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے مربوط کردیتا ہے، اجتماعی سطح پر پیدا ہونے والی اضطراب وآشوبنا کی کی صورت حال میں اس نظام ونصاب سے تعلق رکھنے والے علماء ودانش مند علم وقلم کی بستی کو اجڑنے سے بچانے میں غیر معمولی کردار ادا کرتے رہے ہیں، اس طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درسِ نظامی ان مسلمانوں کے اندر جو جدیدیت کے مسائل سے دوچار ہیں، اپنی اصلیت اور انتساب کا شعور بیدار رکھتا ہے، بدقسمتی سے درسِ نظامی کی تشکیل اور اس کی عملی نشوونما ایسے ماحول اور عہد میں ہوئی جبکہ ہندوستان میں مغل

حکومت کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا، ایک سیاسی عدم اطمینان کی کیفیت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، مغل حکومت کے زوال وسقوط کے بعد برطانوی استعمار کا دور آیا اور پھر اس سے گلوخلاصی کی فکری وعملی کش مکش میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور ہند و پاکستان دونوں ممالک دو حریف اور متحارب فریقوں میں تبدیل ہو گئے، یہ حقیقت ہے کہ سیاسی اضطراب اور بے چینی کے ماحول میں مذہبی تصورات وافکار کو مزید جلا اور قوت حاصل ہو جاتی ہے، اس دور میں بھی مذہبی علماء کی جماعت کی صفوں سے بعض نادر روزگار اور مثالی شخصیات فکر و عمل کے میدان میں آئیں، درس نظامی برصغیر کے علمی وتدریسی افق پر دو صدیوں سے زائد عرصے تک چھایا رہا، یہاں تک کہ جدید تعلیم کا دور شروع ہوا اور درس نظامی تعلیم کے عمومی دھارے سے کٹتا اور حاشیہ نشیں ہوتا چلا گیا۔

درسِ نظامی کے نصاب میں جو تنوع اور توسع تھا اس کا مقصد بہت سادہ تھا، طلبہ کو اس صلاحیت واستعداد کا حامل بنانا کہ وہ مختلف موضوعات کی نمائندہ کتابوں کے متون کو بخوبی سمجھ سکیں، اگرچہ درسِ نظامی کی فضا میں مناظرے کی روایت پروان چڑھی اور درسِ نظامی کے حلقوں میں یہ رجحان موجود ہے، تاہم یہ سمجھنا چاہیے کہ درسِ نظامی کا نصاب صرف مطالعہ کی چیز کبھی نہیں رہی؛ بلکہ اُسے علم ومعلومات کے ایک ماخذ کی حیثیت حاصل رہی، جو اس نصاب سے استفادہ کرنے والوں کو ماضی کے مقتدر علماء ومحققین کے سلسلے سے مربوط کر دیتا ہے۔

غیر متعصّبانہ اور غیر جانب دارانہ ماحول میں سقراطی یا مناظرانہ اسلوب میں باہم دو متصادم ومتخالف نقطۂ نظر کے درمیان مناقشوں کی تربیت دی جاتی ہے، مختلف مکاتب فقہ کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں، طلبہ کے اندر ان کا شعور پیدا کیا جاتا ہے، طلبہ اپنے اندر اس احساس واعتماد کی بازیافت کرتے ہیں کہ وہ علمائے اسلاف کے وارث وجانشین ہیں، درسِ نظامی کے مطابق، آغاز تعلیم میں ہی منطق وفلسفے کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں

؛ تاکہ ان کے ذریعے طلبہ کے اندر قوت فکر واستدلال پیدا ہو۔

مدارس کی داخلی دنیا کی مشاہداتی حقیقت

ہندوستان کے کم از کم تین مدارس کو میں نے قریب سے دیکھا اور برتا ہے، یہاں سے حاصل ہونے والے تجربات کی بنیاد پر میں خود ذاتی طور پر مدارس کی نصابیات کی تکمیل وتدوین پر اپنی رائے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرسکتا ہوں، کئی دہائیوں کے بعد یہ حقیقت میری سمجھ میں آسکی کہ دراصل درسِ نظامی کا نصاب انڈر گریجویٹ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر تشکیل نہیں دیا گیا ہے، یہ نصاب ایسے طلبہ کے لیے ہے جو عربی کی اچھی مہارت رکھتے ہوں اور اسی کے ساتھ نصاب میں شامل ہر مضمون کی واجبی واقفیت سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوں، انتہائی دقیق عربی اسلوب میں مختلف موضوعات پر لکھی گئی مشکل ترین کتابوں سے طلبہ کی اکثریت صحیح معنوں میں فیض یاب نہیں ہو پاتی، وہ اس کی عبارتوں میں کھو کر اور اس کی بھول بھولیوں میں بھٹک کر رہ جاتی ہے۔

اگرچہ اپنے مدارس کی تعلیم کے زمانے میں میں نے ان کلاسیکی عربی کتابوں کو ہضم کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، تاہم حقیقت میں مجھے اس کی اہمیت اور اس کی قدر وعظمت کا احساس مدارس کی چہار دیواریوں سے باہر نکلنے کے بعد ہوا، جب ایک گریجویٹ اور پوسٹ ڈاکٹورل طالب علم کی حیثیت سے میرا تاریخ، جدید فلسفہ، مذہبی مطالعات کی بحثوں، جدید علم الکلام کے مباحث اور فقہ واخلاقیات کے مضامین سے سابقہ ہوا، اُس وقت درسِ نظامی کی خوبی وخوبصورتی میری نگاہوں کے سامنے آئی۔

اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں درسِ نظامی کے نصاب کو پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر رکھنے کی تجویز پیش کروں گا، اس سے قبل طلبہ کو تین سے چار سال تک ایک intensive

program سے گزارا جائے، جس میں انہیں دینی اور عصری دونوں طرح کے ضروری مضامین لازمی طور پر پڑھائے جائیں، قابلِ ذکر اور نمایاں استعداد و صلاحیت رکھنے والے طلبہ کی تیاری کے طور پر طلبہ کو اسلامی فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تفسیر، حدیث، اسلامی تاریخ اور فلسفہ کو لازمی اور آگے کی تعلیم کے مقدمے کے طور پر پڑھایا جائے، ان کی تدریس پر مامور اساتذہ اس معیار کے ہونے چاہئے کہ وہ آسان اور قابل فہم کتب اور طریقہ تدریس کو اختیار کرنے والے ہوں، اس طریقے میں لکچر اور چھوٹی سطح کے سمینار شامل ہیں، زبان کی سطح پر عربی وفارسی نیز اردو کے ساتھ انگلش میں گفتگو کی مہارت کا حصول ان کے لیے ناگزیر ہو، اس مرحلے میں طلبہ کو ماڈرن ہیومانیٹیز یا علوم انسانی اور سماجیات کی تعلیم دی جائے اور انہیں ان سے واقف کرایا جائے؛ تا کہ وہ موجودہ دور کی سماجی زندگی کے چیلنجوں کا جواب دے سکیں، اس تین یا چار سالہ نصاب کو پڑھنے کے بعد ان کے اندر یہ اہلیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ مساجد کے ائمہ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں یا بچوں کو ابتدائی سطح پر تعلیم دیں، عوامی حلقوں میں کام کریں، اسی طرح مذہبی صحافت سے وابستہ تنظیموں اور اداروں کو چلانے اور ان میں کام کرنے والے ہوں، مدارس کے طلبہ اسلامی تربیت کے پیکر ہوں، جو دراصل ان کی شناخت کا بنیادی پہلو ہے، اس نوع کی تربیت یا ٹریننگ کے بعد طلبہ اس لائق ہو سکیں گے کہ وہ اسلامی زندگی اور سماج کی رہنمائی اور قیادت کا فریضہ صحیح طور پر انجام دے سکیں، اچھی قابلیت رکھنے والے طلبہ جو سنجیدگی کے ساتھ تعلیمی تربیت کے خواہاں ہوں انہیں اس نصاب کو گریجویٹ کی سطح پر پڑھنا چاہئے، اس دوران متعدد مضامین میں وہ خصوصی مہارت پیدا کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے وسط میں ایک عظیم القدر دیوبندی عالم دین نے اس قسم کے نصاب

کی تجویز پیش کی تھی، یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، وہ مدارس کے نصاب میں اصلاح و نظر ثانی کا نظریہ رکھتے تھے، ان کی تجویز یہ تھی کہ آزاد ہندوستان میں مدارس کے نظام میں شامل چار کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرا کے ہائی اسکول اور کالج کے نصاب میں شامل کر دیا جائے، مولانا گیلانی کا منشا یہ تھا کہ کثیر مذہبی، کثیر تہذیبی ہندوستان میں تعلیم کے ذریعہ ہندو اکثریت کے درمیان تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے، کالج میں پڑھنے والے مسلم طلبہ دوسرے مضامین کے ساتھ قرآن، حدیث، اسلامی فقہ، علم کلام اور عربی زبان بھی پڑھ سکیں۔

مولانا گیلانی کی تجویز کے جس پہلو پر کم سے کم توجہ دی جاسکی؛ وہ یہ تھی کہ اکثر مدارس کو مڈل اور ہائی اسکول کے متوازی درسگاہ میں تبدیل کر دیا جائے، اعلی تعلیم کے مدارس ملک میں چند ہی ہوں، لیکن ان کی یہ تجویز مدارس کے حلقوں میں بار نہ پاسکی، مدارس کے اہل حل وعقد رواں تعلیمی نظام ونصاب کی معتبریت کے احساس میں کھوئے رہے، بات یہ ہے کہ بحران اور اضطراب کے ماحول میں روایت سے چپکے رہنا ایک حد تک ذہنی سکون فراہم کرتا ہے اور وہ وقتی طور پر درد کا درماں بن جاتا ہے۔

درس نظامی سے مولانا گیلانی کے خیالات اور میرے خیالات میں اتفاقیہ مناسبت پائی جاتی ہے، درسِ نظامی کے مقاصد کے کما حقہ ادراک کے لیے دہنی وفکری پختگی اور اس سے مناسبت ضروری ہے، گریجویٹ کی سطح پر ہی اس سے مکمل طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے، اور اس کو پڑھنے کے بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں، اس لحاظ سے یہ نصاب اسلام پر مطالعہ اور اعلی علمی قابلیت کو آگے بڑھا سکتا ہے، جو راسخ العقیدہ مسلم معاشرے کی ضرورت کے مطابق اور ان کے لیے افادیت کا حامل ہو، لیکن صد حیرت وافسوس کہ نہایت معقول تجاویز بھی بہ مشکل ہی توجہات کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔

روحانیت کی جمہوریت:

درسِ نظامی کے نصاب میں تبدیلی کے ساتھ بالتدریج تعلیم و تدریس کے نظام اور ان کی سرگرمیوں اور جنوبی ایشیا میں مدارس کے قیام کے مقاصد میں بھی فرق آ گیا، پہلے مدرسہ اکیڈمک اور مذہبی دونوں طرح کی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا؛ لیکن اب وہ محض مذہبی ادارے میں تبدیل ہوکر رہ گیا، اب حدیث و فقہ اور روایتی علم کلام نے فلسفہ اور تصوف کی روایات کو- جو فلسفیانہ موشگافیوں سے پُر رہی ہیں- در کنار کر دیا ہے، نیز جدید مضامین کو قطعی طور پر نظر انداز کیا جا رہا ہے، اب مدارس ایک بالکل نئے کردار کے ساتھ سامنے آئے ہیں، یعنی ان کا کردار روحانیت اور افراد کے اندر کردار کی پاکیزگی کے مظاہر کو فروغ دینا ہے، ظاہر ہے یہ ایک عوامی لیکن چھوٹے درجے کا مقصد اور ہدف ہے، مدارس کا اصل زور ثقافتی تشخصات کا تحفظ اور روایتی تعلیم کے ذریعہ اسلامی شناخت کی تشکیل پر ہے۔

معاصر مدارس اسلامی تعلیم کی انسانیت پسندانہ روایات کے صرف ایک پہلو کے حصول کو پیش نگاہ رکھتے ہیں، درحقیقت مدارس کے ارباب بست و کشاد کی ایک بڑی تعداد پُر فخر طور پر یہ کہتی نظر آتی ہے کہ مدارس کے قیام و وجود کا مقصد عبقریت صفت اصحاب علم و دانش کے بجائے تقوی کی صفت سے متصف اور اعلی کردار کے حاملین پیدا کرنا ہے، فضلائے مدارس کی اکثریت اب تعلیم و تبلیغ، امامت و خطابت اور دینی رسائل ومجلّات کی اشاعت میں مصروف نظر آتی ہے، ان فضلاء میں محققین و مفکرین کی تعداد نفی میں ہے، ان روایات کو دوبارہ زندہ کرنا جو زندگی اور سماج کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور وہ ان کے اندر اس حوالے سے قوت و حرارت پیدا کرنے والا ہو، بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔

مدارس کے فضلاء اور مدارس کے ارباب بست و کشاد خارجی چیلنجوں سے مدارس کے

تحفظ کی بات کرتے ہیں، تو وہ اس کے لیے ایک مذہبی حقیقت یا دلیل کو استعمال کرتے ہیں، نہ کہ منطقی اور فلسفیانہ حقیقت کو، جو تمام عقلوں کو اپیل کرنے اور قائل کرنے والی ہو، اس وقت مدارس کی فکر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کسی طرح اپنی دینی تعلیمی روایات کو سیکولر تعلیمی نظریات کے عمل دخل سے محفوظ رکھ سکیں؛ لیکن اسی کے ساتھ مدارس کے حلقے کے ہی بہت سے علماء واہل دانش یہ سوال اٹھاتے رہے ہیں کہ کیا موجودہ تعلیمی نظام کے تحت پرورش پانے والی صلاحیتیں معاصر دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں؟ اس صورت حال نے جنوبی ایشیا کے مدارس کو معنویت کے بحران میں مبتلا کردیا ہے، یعنی یہ بحران کہ وہ کس طرح خود کو موجودہ دور سے ہم آہنگ رکھ سکیں، اس حقیقت کے باوجود کہ مدارس سے نکلنے والی فوج ظفر موج میدان عمل میں ڈٹی ہوئی ہے؛ لیکن وہ شترمرغ کی طرح مسائل اور چیلنجوں کے گولہ بارود سے اپنا سر بچانے والی ہے، وہ ان مسائل سے آنکھیں نہیں ملاسکتی، وہ مغرب، سیکولرسٹ، تجدد پسند مسلمان اہل دانش کو نشانہ بناتی اور اس کی آڑ میں اصل مسائل سے نظریں بچالیتی ہے۔ (دینی مدارس عصری معنویت اور جدید تقاضے: ۱۴۴-۱۷۶)

شعبہائے اختصاص میں علمی وتحقیقی کمی کی شکلیں

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی صاحب اس موضوع پر تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

بلاشبہ ''تخصصات'' کا مقصد طالب علم میں کسی فن کے تئیں علمی تبحر، تصنیف وتالیف کی لیاقت، بحث وتحقیق کی صلاحیت، رائے قائم کرنے کی اہلیت اور خود اس فن کے مصادر و مراجع سے گہری واقفیت پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح قدیم علمی ورثہ کو نئے رنگ و آہنگ میں پیش کرنے کا سلیقہ اور جدید علمی انکشافات کو پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اگر تخصصات کے ان مقالوں میں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی ہے تو انہیں علمی وتحقیقی رسائل کا نام

نہیں دیا جا سکتا ہے، تصنیف وتالیف کے دائرے میں ان کا شمار تو کیا جا سکتا ہے؛ مگر بحث و تحقیق کے زمرہ میں نہیں۔

ہندوستان میں شعبہائے اختصاص کے تحت جو علمی و تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے، اوراس کی حوصلہ افزائی بھی کی جانی چاہیے، کیونکہ یہ اس تحریک کا آغاز ہے اور ایک نئی طرح کی ابتداء ہے۔

مگراس کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالوں میں معیار اور ''منہج'' دونوں پر خوب توجہ دی جائے، اور بحث وتحقیق کے جو عصری اور عالمی اصول ہیں ان پر عمل کیا جائے۔

راقم الحروف نے اس مقالہ کی ترتیب کے دوران، ہندوستان کے مختلف اداروں کے شعبہائے تخصص کے تحت ترتیب شدہ مقالات کا جائزہ لیا ہے اور جن اہم علمی و منہجی غلطیوں پر نگاہ پڑی ہے، وہ ذیل میں ذکر کی جا رہی ہیں:

(۱) عربی بلکہ خود اردو مقالوں میں بھی زبان و بیان کی غلطیوں کا پایا جانا۔

(۲) احادیث کی تخریج اور مسائل فقہیہ کی توثیق میں اصل مصادر کے بجائے ثانوی مصادر سے استفادہ اور بسا اوقات غیر معلق کتابوں پر اعتماد۔

(۳) موضوعیت کا فقدان۔

(۴) علمی وتحقیقی رنگ کا فقدان۔

(۵) خطۃ البحث کے بغیر ہی مقالے تحریر کرنے کا رجحان۔

(۶) محدثین وفقہاء کی بعض خاص مصطلحات کو سمجھے بغیر ہی ان کی تعبیر وتشریح کرنا۔

(۷) عربی عبارتوں کے ترجمہ میں حد درجہ تساہل اور فحش غلطیوں کا ارتکاب۔

(۸) احادیث سے استدلال میں ان کی صحت وضعف کو نظر انداز کیا جانا۔

(۹) غیر علمی وتحقیقی موضوعات کو بحث وتحقیق کا موضوع بنانا۔

(۱۰) موضوع سے متعلق تمام جہتوں کا مقالہ میں شامل نہیں کیا جانا۔

اگر باتوں کو بغور دیکھا جائے اوران کوتاہیوں کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور پر ان کے چار اسباب نظر آتے ہیں:

(۱) ہمارے ان اداروں میں عام طور پر مناہج البحث والتحقیق کے موضوع کو نہیں پڑھایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے طلبہ سے اس طرح کی غلطیوں کا ارتکاب فطری ہے، راقم الحروف کی سفارش پر المعہ العالی الاسلامی حیدرآباد میں سال دوم کے طلبہ کے لیے لازمی مضمون کی حیثیت سے، ایک سال قبل اس مادہ کا اضافہ کیا گیا ہے اوراس کی تدریس بھی مجھ ہی سے وابستہ کی گئی ہے، تجربہ یہ ہے کہ طلبہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اس مضمون کو پڑھتے بھی ہیں اوراس سے مقالہ نویسی میں فائدہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

(۲) ایسے علمی نگراں اور مشرفین کی کمی یا فقدان؛ جو ان مقررہ مضامین کے متخصص ہوں، اوراگر کہیں مشرفین موجود بھی ہوتے ہیں تو وہ محض رسمی اشراف انجام دیتے ہیں، مکمل علمی اشراف کا فقدان ہوتا ہے، جب کہ ''علمی رسائل'' دراصل مشترکہ طور پر باحث اور مشرف کے علمی وتحقیقی ذوق کا مظہر اور مشترک محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(۳) ہمارے تعلیمی نظام میں تخصصات سے پہلے عام طور پر علمی موضوعات پر لکھنے کی مشق نہیں کرائی جاتی ہے، تخصصات میں آکر ہی طالب علم پہلی مرتبہ ان موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے، جس کا راست اثر اس مقالہ کی علمی حیثیت وکیفیت پر پڑتا ہے۔

(۴) اسی طرح بسا اوقات نااہل طلباء کو تخصصات میں داخلہ دینے کی وجہ سے بھی ان مسائل ومشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تجاویز واقتراحات:

(۱) منہج البحث والتحقیق کو بحیثیت مضمون خصوصی شعبہائے اختصاص میں داخل کیا جائے۔

(۲) متخصص مشرفین کے تحت مقالے لکھوائے جائیں۔

(۳) مشرف کی تدریسی مصروفیات اور علمی انہماک کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنے ہی طلبہ کا اشراف سپرد کیا جائے جن کی واقعی نگرانی ممکن ہو۔

(۴) مشرفین کے لیے ''بدل اشراف'' مقرر کیا جائے؛ تاکہ دلجمعی اور توجہ کے ساتھ یہ ذمہ داری انجام دی جاسکے۔

(۵) باصلاحیت طلبہ ہی سے مقالے تحریر کروائے جائیں اور جو طلبہ لکھنے پڑھنے میں کمزور ہوں ان سے تخصص کے مقالوں کے بجائے بحث تکمیلی لکھوا کر ڈپلوما وغیرہ کی سند دے دی جائے۔

(۶) موضوعات کے انتخاب سے پہلے مختلف جامعات سے رابطہ کیا جائے؛ تاکہ کام کا تکرار اور محنت کا ضیاع نہ ہو۔

(۷) مقالوں کا علمی مناقشہ بھی ہونا چاہئے اور اس میں جو مقالے علمی و تحقیقی معیار پر اترتے ہوں، ان کی طباعت کا نظم خود ادارہ کرے؛ تاکہ طلبہ و باحثین کی حوصلہ افزائی ہو۔

(۸) مخطوطات کی تحقیق کا کام نہایت نازک ہے، اس کے لیے نو تربیت یافتہ طلبہ کے بجائے باصلاحیت اور علمی تجربہ رکھنے والے افراد ہی سے کام لیا جائے۔

(معاصر دینی تعلیم مشکلات واحوال: ۲۵۴-۲۵۶)

دینی مدارس اور تربیت اساتذہ:

دینی مدارس سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ سند فضیلت حاصل کر کے مختلف عملی

میدان کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کے مشغلہ کو اپناتے ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یقیناً ان کے اندر عربی زبان کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے، عربی عبارتوں کا وہ ترجمہ بھی کر سکتے ہیں، آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کی تشریح بھی کر سکتے ہیں، کتب فقہ سے مراجعت کے بعد وہ لوگوں کو دینی وشرعی مسائل سے آگاہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اصول حدیث اور اصول فقہ کے بنیادی مباحث بھی ان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں، مگر کیا درس و تدریس کے لئے ان کے اندر ان علمی صلاحیتوں کا پایا جانا کافی ہے، کیا یہ صلاحیتیں انہیں ان کی درس وتدریس والی زندگی کے لئے مکمل طور پر رہنمائی کر سکتی ہے؟

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو جواب نفی میں ملے گا؛ کیونکہ ایسا شخص تو باصلاحیت مفسر، باکمال محدث، ممتاز فقیہ بن سکتا ہے، مگر ایک کامیاب مدرس بننے میں انہیں کچھ دیر لگے گی، درس و تدریس کے جو ارکان ہیں جن میں خاص طور پر استاد کے اندر اس فن پر دسترس، طلبہ کی نفسیات سے واقفیت، موضوع کو سہل اور عام فہم انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنا اور اسے طلبہ کے ذہن میں بیٹھا دینا، مشکل موضوعات کو آسان سے آسان تر بنا کر پیش کرنا، تعلیمی ماحول اور درسگاہ کی رعایت، وسائل تعلیم سے استفادہ وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ایک باکمال استاد کا متصف ہونا ضروری ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے فارغین اور فضلاء ان امور سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں، ایک باکمال استاد کے لئے ماہرین فن کے مطابق کن صفات سے مزین ہونا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں بعض ماہرین تعلیم نے اساتذہ کے مطلوبہ صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، بعض صفات کا تعلق خود استاد کی ذات سے ہے، اور بعض کا تعلق مشغلہ تدریس سے ہے، استاد کی ذات سے متعلق چند اہم صفات ہیں، جس کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) مشغلہ درس وتدریس سے اسے غیر معمولی محبت ہو اور وہ اسے نہایت دلچسپی اور

شوق و لگن سے ادا کرتا ہو۔

(۲) اس کی شخصیت متوازن ہو، کب نرمی کا مظاہرہ کرنا ہے اور کب سختی سے طلبہ سے پیش آنا ہے، ان مواقع سے خوب واقف ہو، جیسا کہ آیت کا اشارہ ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران)

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ کا خصوصی انعام یہی ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

(۳) جسمانی لحاظ سے صحت مند ہو۔

(۴) نفسانی لحاظ سے انفعالی صورت حال سے دو چار نہ ہو۔

(۵) ظاہری نظافت کا اہتمام، خاص طور پر علم کتاب وسنت کے اساتذہ کرام کے لئے اس کا اہتمام اور بھی ضروری ہے۔

(۶) فصاحت بیانی، صاف گفتگو، واضح آواز، انداز بیان کی شگفتگی، لہجہ کی خوبصورتی کی صفات سے متصف ہونا بھی ایک اہم صفت ہے۔

(۷) ذہانت وتیقظ کے ساتھ تدریسی مشکلات کو اپنے مطالعہ سے بخوبی حل کرنے کی استعداد ہو۔

(۸) فن پر مکمل عبور ہو، اس لئے کہ اساتذہ کی غلطی طلبہ میں ان کے بارے میں عقیدت کی کمی کو پیدا کرتی ہے، اور دھیرے دھیرے ایسے کلاس میں طلبہ کی حاضری کم ہونے لگتی ہے۔

(۹) ''کلم الناس علی قدر عقولھم'' کی روشنی میں موضوع کے اہم اور اساسی مواد کو نوٹ کرانا، غیر ضروری مباحث سے احتراز اور تمام وہ اقوال جو شروحات میں ہوں سبھوں کے بیان سے اجتناب، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہم اور ضروری مواد ذہن سے نکل جاتے

ہیں اور صرف ضمنی نکات اور اقوال یاد رہتے ہیں اور اس طرح موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔

(۱۰) وسعت مطالعہ، خاص طور پر دورِ جدید کے حالات سے واقفیت۔

(۱۱) اوقات درس کی پوری پابندی اور مدرسہ کے قوانین کا پورا احترام۔

عمل تدریس سے متعلق حضرات کے لئے کچھ ضروری امور کی رعایت:

(۱) طلبہ کے عزت نفس کا پاس ولحاظ، اس کے حقوق کی ادائیگی، نیز اس کی ضروریات کی رعایت کرنا۔

(۲) درسگاہوں کو منظم کرنا اور اس کے لئے ضروری آلات و وسائل تعلیم سے اسے مزین کرنا۔

(۳) طلبہ کو آپس میں گفتگو کا موقع فراہم کرنا؛ تاکہ وہ اپنی غلطیوں کی آپسی گفتگو سے اصلاح کرسکیں، درسگاہ میں طلبہ کو سوالات کرنے پر ابھارنا، معقول سوال کی تحسین کرتے ہوئے اس کا جواب اسی وقت یا دوسرے وقت دینا۔

(۴) مدرسہ کی مختلف انجمنوں اور پروگراموں میں شرکت کے لئے طلبہ کو متوجہ کرنا اور اس کے لئے مختلف عنوانات بتانا اور اس موضوع کے لئے رہنما مستند کتابوں کی نشاندہی کرنا۔

(۵) نامناسب امور کے بارے میں طلبہ کو اچھے تعامل کا مظاہرہ کرکے سمجھانا۔

(٦) صرف نظری تعلیم پر اکتفانہ کرنا؛ بلکہ اس کے ساتھ عصری تقاضا کے مطابق اسے عملی انداز میں پیش کرنا۔

(۷) طلبہ میں دوران درس نشاط اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے حکیمانہ پاکیزہ لطائف بیان کرنا۔

(۸) طلبہ کے کاموں اور ان کی صلاحیتوں کی قدر کرکے ان کے اندر ترقی اور آگے

بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا، اس کے لئے اچھے جوائز علمیہ اور تشجیعی انعامات دے کر حوصلہ افزائی کرنا، ظاہر ہے کہ ان صفات سے مزین ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ استاد خود ان صفات سے واقف ہوں، ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح پڑھنا ایک فن ہے، اور بغیر سیکھے کوئی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا ہے، اسی طرح پڑھانا بھی ایک فن ہے، اس کی تربیت حاصل کئے بغیر اس راہ میں قدم بڑھانا مشکل امر ہے، درس وتدریس کے تربیت یافتہ اساتذہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کرام اپنی بات کو کم وقت اور سہل الفاظ میں طالب علموں تک پہونچا سکتے ہیں، اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کرام کے مقابلہ میں بہت جلد ایسے اساتذہ طلبہ کے لئے زیادہ فائدہ منداور کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں تربیت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، انسان پیدائش سے لے کر وفات تک زندگی کے مختلف مرحلوں اور شعبہ جات میں تربیت کا محتاج ہوتا ہے، دنیاوی امور کے ساتھ ساتھ دینی امور میں بھی تربیت حاصل کئے بغیر انسان خدا اور رسول کو نہیں پہچان سکتا، نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی اہم حیثیت مربی اعظم کی ہے، قرآن کریم نے منصب نبوت کا ایک اہم فریضہ تربیت سازی کا بتایا ہے، ''**ویز کیھم**'' (الجمعہ)، امام بخاریؒ نے کتاب العلم کے باب نمبر ۱۲ر کے ذیل میں ''**کونوا ربانیین**'' کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل فرمایا ہے کہ ''**کونوا حلماء فقھاء علماء الربانی الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ**'' آیت قرآنی ''**کونوا ربانیین**'' کی تفسیر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ ربانیین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو لوگوں کو ابتدائی تعلیم وتربیت دیتے ہیں ''**الذی یعلم الناس صغار العلم قبل کبارہ**'' تاریخ وسیر آپ ﷺ کی صحابہ کرام کی تربیت کے واقعات سے پُر ہیں، آپ نے حضرت موسی اشعریؓ کو اور حضرت معاذ

بن جبل ؓ کو جب قاضی اور عامل (زکوٰۃ کی وصولی کے لئے) روانہ فرمایا تو آپ نے پہلے ان صحابہ کرام کی تربیت فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت ہی کا ایک پہلو وہ ہے جس میں آپ نے تعلیم کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہوئے طالب علم کی فضیلت ارشاد فرمائی کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے راستہ میں نکلے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیں گے۔ (مسلم شریف) اسی طرح تربیت کی ضرورت پر حدیث شریف کے اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے افعال نماز کی تربیت ایک شخص کو دی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو سوالات کرنے کی تربیت دی اور اس پر ابھارا، اور فرمایا کہ علمی پیاس کی سیرابی تو سوال کرنے سے ہوتی ہے، اسی طرح آپ نے صحابہ کرام کو اخذ واستنباط کی تربیت دی، جیسا کہ حضرت ابن عمر ؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام سے ایک ایسے درخت کے بارے میں دریافت فرمایا کہ جس کا پتہ نہیں گرتا، اور اس کی مثال ایک مومن کی طرح ہے، آپ نے صحابہ کرام کو علمی مناقشہ اور اصل مرجع کی طرف رجوع ہونے کی تربیت فرمائی، حضرت عائشہ ؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہیں کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی یا کوئی اشکال ہوتا تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع ہوتیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں اجتماعی تربیت سازی فرمائی ہے وہیں انفرادی طور پر آپ نے صحابہ کرام کی تربیت کی ہے؛ اس لئے ہمیں احادیث کی کتابوں میں بہت سے واقعات واحد کے صیغہ سے ملتے ہیں جیسے: ''علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' تعلیم وتربیت کے باب میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کسی اہم موضوع کے بارے میں بتانا ہو تو اس سے پہلے موضوع سے متعلق کچھ ایسے کلمات کہے جائیں جس سے مخاطب اور سامعین کے دل میں شوق ورغبت

پیدا ہونے لگے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیبت کی شناعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اتدرون ما الغیبة".

درس وتدریس میں اپنی بات کو طلبہ کے ذہن سے قریب کرنے کے لئے عصری آلات و وسائل تعلیم کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوتا ہے، اس کی مثال خود سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملتی ہے، بعض دفعہ آپ نے انگلی کے اشارے سے بہت سی باتوں کو سمجھایا ہے، مثلاً آپ نے یتیم کی کفالت کرنے والے شخص کے بارے میں دو انگلیوں کے اشاروں سے سمجھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں آپس میں قریب ہیں، اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں قریب ہوں گے۔(یتیم کے بارے میں ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا) ان سب کے ساتھ تربیت سے متعلق ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر وقت بچوں کے ذہن پر تعلیم کا بوجھ نہ جائے؛ بلکہ انہیں آرام، کھیل کود اور ذہنی تفریح کا بھی کچھ موقع دینا چاہیے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری سستی و کاہلی کے خوف سے ہمیں وقفہ وقفہ سے نصیحت فرماتے تھے۔ "عن ابن مسعود قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتخولنا بالموعظة فی الایام کراهیة السآمة علینا." (کتاب العلم: ص:۶۸)

یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں صحابہ کرامؓ کی تربیت کے چند نمونے ذکر کئے گئے ہیں، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرض منصبی ہی ایک ایسے گروہ کی تربیت تھی، جو اسلامی علوم اور اسلامی اخلاق میں ایک مثالی قیادت کا کردار ادا کرسکیں، آج اگر ہم اس پہلو سے دینی مدارس کے اساتذہ پر غور کریں تو بہت حد تک مایوسی نظر آتی ہے، بہت سے اساتذہ طلبہ کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر دینی مدارس میں پڑھائی جانے والی کتابیں اور مختلف فنون خاص طور پر اس کی حاجت رکھتے ہیں کہ ان کی تدریس سے پہلے اس فن کے طریقۂ تدریس اور عمومی

اصول وقواعد تدریس سے ضروری واقفیت حاصل کی جائے اور طلبہ کو مانوس بنایا جائے۔

قرآن وحدیث کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ پہلے عربی کے قواعد واصول سے آدمی پوری طرح باخبر ہو، اس لئے دینی مدارس میں عربی گرامر (قواعد) نحو وصرف پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے، مگر اس فن کے طریقۂ تدریس میں حیرت انگیز طور پر وہی اختیار کیا جاتا ہے جو عربی ادب کی تدریس میں برتا جاتا ہے، جب کہ کسی فن کے قواعد کی تدریس کا طریقہ بالکل جداگانہ ہوتا ہے، نحو وصرف کی تدریس میں عملی مشق اور اس کی تفہیم کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال نہایت ضروری امر ہے، اس فن کی تدریس میں مختلف قواعد کو زیادہ سے زیادہ مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے صرف زبان سے بیان کر دینے سے بات نہ ہی طلبہ کے سامنے واضح ہو پاتی ہے اور نہ ہی ان کے ذہن تک پہونچ پاتی ہے، اس لئے اساتذہ بورڈ کا استعمال کریں تو یہ مثالیں طلبہ کی نگاہوں سے گزرتے ہوئے ان کے دماغ تک پہونچیں گی، جس سے طلبہ ان مثالوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتے ہیں، یہی حال اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر کی تدریس کا ہے کہ صرف ان قواعد کا ترجمہ پڑھا دینا کافی نہیں؛ بلکہ مختلف مثالوں پر اس کی تطبیق ضروری ہے۔

عام طور پر ہمارے مدارس میں کتب حدیث کو کتب فقہ سمجھ کر پڑھا دیا جاتا ہے، احادیث احکام کی تشریح میں فقہاء کے اختلاف، ان کے دلائل، وجہ ترجیح وغیرہ پر اتنی لمبی بحث کی جاتی ہے کہ اصل فن حدیث کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہو جاتی ہے، حالانکہ اگر کتب حدیث کی تدریس میں علم حدیث سے متعلق مباحث کو بیان کیا جاتا ہے تو طلبہ میں علم حدیث کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور وہ اس فن کے عمق سے بھی واقف ہوں گے، اسی طرح میراث کے فن کی تدریس میں کتاب میں مذکورہ مثالوں پر اکتفاء کرنا ناکافی ہوتا ہے، جب کہ بلیک

بورڈ پر مختلف مثالوں سے ورثاء کے حصوں کی تفصیل نہ ذکر کردی جائے۔

ظاہر ہے کہ طریقہ تدریس کے اس نہج سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اساتذہ کو ان امور کی تربیت نہ دی جائے، اس پس منظر میں تربیت اساتذہ کے سلسلہ میں چند اہم باتوں کا ذکر کردینا مناسب ہے۔

(۱) جو اساتذہ کرام چند سالوں سے درس و تدریس کے مشغلہ سے جڑے ہیں، ان کے لئے مختلف فنون کے ماہرین تدریس سے محاضرات اور خطابات اور لکچر کی خواہش کی جائے۔

(۲) نئے فضلاء کرام میں جو حضرات درس و تدریس کو اپنا میدان عمل بنانا چاہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عملی میدان میں قدم رکھنے سے قبل درس و تدریس کی کم از کم ایک سالہ یا اس سے بھی قلیل المدۃ کورس کریں۔

(۳) ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں دینی مدارس کے فضلاء کے لئے تربیت المعلمین کے کورس کے لئے ایک ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے؛ اس لئے ملک بھر کے ممتاز علماء کرام کی میٹنگ رکھی جائے؛ تاکہ تربیت سازی کے لئے ایک متفقہ اصول وقواعد تیار کئے جائیں اور پورے ملک میں اس تربیت کے نظام کو جاری کیا جائے، اس ادارہ میں خاص طور پر ہر فن کے لئے طریقہ تدریس کی عملی مشق اساتذہ کو دی جائے، ساتھ میں تدریس کے عمومی اصول وقواعد سے بھی اساتذہ کو واقف کرایا جائے۔

(۴) تربیت سازی کے لئے مختلف فنون کے ماہرین علماء کرام سے خاص طور پر استفادہ کیا جائے۔

(۵) جدید علوم کے ماہرین سے بھی اس سلسلہ میں مدد لی جائے؛ کیونکہ تدریس کے باب میں جو مسائل عصری اور دینی مدارس کے مشترکہ ہیں، ان چیزوں کے بارے میں عصری

درسگاہوں سے مربوط حضرات یقیناً مفید مشورے دے سکتے ہیں۔

(۶) ہندوستان کے وہ بڑے مدارس جہاں تخصصات کے شعبے قائم ہیں وہاں ایک شعبہ تربیت اساتذہ کا بھی قائم کیا جائے۔

(۷) اساتذہ کی تربیت سے مراد صرف انہیں مختلف فنون کے طریقہ تدریس سے واقف کرانا ہی نہیں ہے؛ بلکہ تربیت کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے،جس میں ان کی علمی تربیت، فکری تربیت، اخلاقی تربیت، دعوتی وتحریری تربیت بھی شامل ہے، ظاہر ہے تربیت کے ان مختلف امور میں اسی فن کے ماہرین سے استفادہ کرکے بھی صحیح سمت میں تربیت سازی کا کام جاری رہ سکتا ہے۔(معاصر دینی تعلیم مشکلات واحوال:۱۲۸-۱۳۶)

وفاق المدارس الاسلامیہ پاکستان

دنیائے اسلام کے دینی مدارس کے سب سے بڑے تعلیمی بورڈ کی ساٹھ سالہ خدمات کی فکرانگیز تاریخ،اس کے رجال کار کی انتھک مساعی کی ایمان افروز روداد،نصاب اورنظام تعلیم وتربیت سے متعلق اکابر علماء کی رہنما تحریروں اور بورڈ کے ترجمان رسالہ کے سوسالہ مضامین کی تلخیص پر مشتمل ایک تاریخ ساز مجموعہ جس کا مطالعہ نہ صرف پاکستان؛ بلکہ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی علوم کی درس گاہوں سے شناسائی فراہم کرتا ہے۔

یہ حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کی مسلسل کاوشوں اورمحنتوں کا ثمرہ ہے، میں اس کے چنداہم مضامین واقتباسات نقل کرنے کواپنی سعادت مندی سمجھتا ہوں۔

مکاتب کی اہمیت

یہ حقیقت نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں رہنی چاہئے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملک کی کسی یونیورسٹی میں اسلام کے موضوع پر لیکچر دینا، مستشرقین کے شبہات کے جوابات دینا یا جدید تعلیم یافتہ

طبقے کے ذہنوں کو ان کے اسلوب اور زبان میں مطمئن کرنا ایک اہم کام اور دینی خدمت ہے، ٹھیک اسی طرح کسی دیہات میں بیٹھ کر مسلمان بچوں کو قرآن اور دین کی بنیادی باتیں سکھانا بھی اہم ہے، ایک اسلامی اسکالر، پروفیسر، مقالہ نگار کی اہمیت اپنی جگہ ہزار درجہ تسلیم؛ لیکن اس سے دولت کی فراوانی اور بسا اوقات زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم اس بندۂ خدا کی اہمیت کیونکر کم کی جاسکتی ہے، جو موسم کی گرمی اور نرمی کی پروا کیے بغیر، پانچ وقت، مسجد کے میناروں سے اللہ کی کبریائی کی صدائیں بلند کر کے کائنات کی ہستی کو لرزا دیتا ہے، اگر کسی ادارے کا مقصد پہلی قسم کی خدمت کے لئے لوگوں کو تیار کرنا ہے تو اس کی افادیت، اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ دوسری قسم کی خدمت کے لئے افراد تیار کرنے والے اداروں کے کام کو بھی اہمیت کی نگاہ سے دیکھے۔

دو تین سال قبل ایک عالم دین تشریف لائے تھے، وہ ایک جدید نصاب کا تجربہ کر رہے ہیں، ان کا ہدف یہ ہے کہ عربی زبان پر مکمل قادر، اسلامی علوم میں ممتاز صلاحیت کے حامل افراد تیار کئے جائیں، شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور دیگر اساتذہ کے سامنے انہوں نے اپنے نصاب کے امتیازات بیان کیے اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اچھی اور اعلی استعداد کے ممتاز علماء تیار ہوں، حضرت شیخ نے جواب میں فرمایا:

> ممتاز اور اچھی استعداد کے حامل علماء کی تیاری اس وقت، امت مسلمہ کی ضرورت ہے، اور کچھ ادارے یہ ذمہ داری سنبھال لیں تو اچھی بات ہے؛ لیکن ہمارے معاشرے کو نچلی سطح اور کم استعداد والے افراد بھی چاہئے، معاشرے کو جہاں زمانے کے حالات سے باخبر ایک فقیہ کی ضرورت ہے، وہاں بچوں کو قرآن سکھانے والے قاری، مسجد میں اذان دینے والے

مؤذن اور دیہاتوں اور گوٹھوں میں نماز پڑھانے والے امام کی بھی ضرورت ہے، معاشرے کی یہ دینی ضرورتیں صرف ممتاز افراد سے پوری نہیں ہوسکتی اور ایک مکمل فیض رساں ادارہ وہی ہوسکتا ہے جس سے معاشرے کی تمام دینی ضرورتوں کے لئے افراد تیار ہوں۔

اس سلسلے میں چوتھی گزارش یہ ہے کہ جدید عصری تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے، اسے بچوں اور طلبہ پر اس طرح مسلط نہ کیا جائے کہ محسوس ہو کہ دنیا اور آخرت کی کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں اور اس میں مہارت ہی دونوں جہاں کی سعادت کی علامت ہے، ایک عالم دین کے لیے اس کی جس قدر اہمیت ہے، اسی قدر وہ بتلائی جائے، اس کی اہمیت میں مبالغہ آرائی سے بچوں کا ذہن مرعوبیت کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ دینی مدارس میں جدید تعلیم کی طرف پیش رفت کرتے ہوئے مدارس کا اصل ہدف اور مقصد نظروں سے اوجھل نہیں رہنا چاہئے، جیسا کہ لکھا گیا کہ مدرسہ کا اصل مقصد اسلامی علوم کی حفاظت ہے، جدید فنون کو داخل کرتے ہوئے اگر اسلام کے علوم آلیہ اور علوم عالیہ کی طرف سے توجہ ہٹتی ہے یا اس میں استعداد کمزور رہتی ہے اور فکر ونظر پر جدید فنون (سائنس، ریاضی، انگریزی اور کمپیوٹر وغیرہ) کا غلبہ اور رجحان رہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدرسہ اپنے اصل مقصد سے ہٹ گیا ہے اور صرف یہی کہا جاسکے گا کہ ۔

ایں رہ کہ تو می روی بترکستان است

ہماری ان گذارشات کا حاصل یہ ہے کہ بلا شبہ دینی مدارس میں جدید عصری علوم اور موضوعات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلے میں پیش رفت بھی ہورہی ہے، لیکن اس پیش رفت میں ذکر کردہ پانچ باتوں کا خیال رکھا جائے:

اول: یہ کہ طلبہ کے دل و دماغ کو مرعوبیت سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو۔

دوم: اسلام کی دائمی حقیقتوں سے متعلق فکر و نظر میں تبدیلی نہ آنے پائے۔

سوم: اکابر اور اسلاف کے کام اور طریقے کی عظمت اور اہمیت برقرار رہے۔

چہارم: جدیدیت میں یہ دلچسپی بقدر ضرورت رکھی جائے، اور

پنجم: مدرسہ کی محنتوں کا اصل مقصد اور ہدف نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ تب تو یہ پیش رفت مفید اور بارآور بنے گی اور امت کے سامنے اس کے اچھے ثمرات آئیں گے، بصورت دیگر یہ ناکام تجربات کی فہرست طویل کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

(ابن الحسن عباسی: وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص:۲۱۸)

تعلیم و تربیت سے متعلق ۱۳ر اصول وضوابط

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم صاحبؒ کی درخواست پر نمائندہ اجتماع میں شریک حضرات اساتذہ اور ارباب اہتمام نے غور وخوض کے بعد ایک ۱۳ر نکاتی نظام تعلیم وضع کیا، موجودہ دارالعلوم اور اکثر ملحقہ مدارس میں اسی نظام کی پابندی کی جارہی ہے۔

(۱) دوران تدریس اختصار کے ساتھ کتاب حل کرنے کی کوشش کی جائے، کتاب کے مشکل مقامات حل کرنے میں پوری توجہ سے کام لیا جائے، مشکل مقام کی تحقیق میں حل پیش کرنے والے مصنفین اور اسلاف کا حوالہ دیا جائے، طلبہ کو مآخذ سے روشناس کرانے کا اہتمام کیا جائے اور غیر ضروری بحثوں سے احتراز کیا جائے۔

(۲) نصاب کی تکمیل کرائی جائے، تدریس میں یکسانیت ہو، ماہانہ، سہ ماہی، اور ششماہی مقدار خواندگی مقرر کی جائے۔

(۳) جس استاذ کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو؛ تدریس کے لیے اسی فن کی کتاب

اس کے حوالہ کی جائے۔

(۴) امتحانات پوری احتیاط سے لئے جائیں، درجۂ چہارم تک کے امتحانات میں بالخصوص پوری احتیاط برتی جائے اوران جماعتوں میں طلبہ کا اوسط حاضری دوسرے درجات سے بڑھا دیا جائے۔

(۵) ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کی جائے۔

(۶) اول، دوم اور سوم عربی کے طلبہ کا ماہانہ امتحان لیا جائے۔

(۷) سال چہارم عربی تک عربی تمرین وانشاء پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔

(۸) مدرسین کو اسباق اتنے دئے جائیں کہ وہ تدریس کی ذمہ داریوں سے صحیح طریقہ سے عہدہ برآ ہوسکیں۔

(۹) مدرسین کے انتخاب میں صلاح وتقویٰ، علمی استعداد، بلند اخلاقی معیار، سلامتیٔ طبع، تدریس اور طلبہ کی تربیت سے دلچسپی کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۱۰) اساتذہ اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کر کے طلبہ میں اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کی جدوجہد کریں۔

(۱۱) سال ششم عربی سے دورۂ حدیث شریف تک امتحانات کے دو پرچوں کا حل عربی میں کرنا لازم قرار دیا جائے۔

(۱۲) طلبہ میں عربی ذوق پیدا کرنے کے لیے عربی مجلّات وصحف منگائے جائیں، اور دارالمطالعہ قائم کیا جائے۔

(۱۳) طلبہ مین تقریر وخطابت کا ذوق پیدا کرنے کے لیے جمعہ کی رات میں خطابت کی مجلسیں منعقد کرنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔

(مولانا ندیم الواجدی صاحب: وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص:۲۷۱)

تدریس کو بہتر بنانے کے طریقے

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ

(۱) ہر سبق کے لیے متعلقہ استاذ پہلے سے مضبوط مطالعہ کرے اور ہر کتاب کے روزہ مرہ سبق کے لیے ابتدا ہی سے اندازہ لگا کر ایک مناسب مقدار مقرر کی جائے، پھر اس ہر روز کے سبق کو درسگاہ میں جانے سے پہلے استاذ خود پوری طرح سمجھ کر اسے اپنے دماغ میں محفوظ کرے اور پھر ایک آدھ دفعہ طلبہ کو اپنے سامنے بیٹھا متصور کر کے اسے بہ آواز دہرائے، اس عمل کے بعد استاذ کی ایک تو اپنے سبق پر گرفت انتہائی مضبوط ہو جاتی ہے اور وہ بلا جھجک اپنے تلامذہ کو سمجھانے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے، اور ساتھ ہی اپنے سبق کی صحت و سقم کا بھی اسے کافی اندازہ ہو جاتا ہے، جس کے بعد وہ اسے مزید مہذب اور مفید بنا سکتا ہے۔

(۲) استاذ اپنے سبق کی تقطیع کرے، یعنی اسے قطعات اور اجزا میں تقسیم کرے، مثلاً یہ کہ آج کے سبق میں چار باتیں بتائی جا رہی ہیں، پھر پہلی دوسری تیسری اور چوتھی بالترتیب سمجھائے۔

(۳) تقریر کو عبارت پر منطبق کیا جائے، یعنی استاذ جو باتیں طلبہ کو اوپر اوپر بتاتا ہے، نیچے کتاب کی عبارت پر بھی وہ اسے منطبق کرے اور طلبہ کو بتائے کہ صاحب کتاب نے یہاں سے لے کر یہاں تک یہ بات یوں بتائی ہے اور یہاں سے یہاں تک یہ بتایا ہے، اس طریقے کی ایک تو اس واسطے ضرورت ہے کہ بعض لوگ جو تدریس اور تفہیم کی فطری صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں، خواہ مخواہ کی باتیں رٹ کر طلبہ کو سناتے ہیں، جن کی کتاب کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہوتی، یا پھر وہ حل عبارت کے لیے ناکافی ہوتی ہیں، اس سے طلبہ کی حق تلفی ہوتی ہے، اور ان کا وقت ضائع ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ عمل اس وبا کی روک تھام میں معاون ثابت ہوگا اور پھر اگر خارجی تقریر کی داخل (اندرون) کتاب سے مطابقت بھی ہو تو بھی اس کی تطبیق کے

بغیر طلبہ میں فہم کتاب اور حل عبارت کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو مقصود ہے۔

(۴) تمام فنون کی ابتدائی کتب (جو تقریباً درجہ رابعہ اور اس سے نچلے درجات میں پڑھائی جاتی ہیں) میں بالخصوص اور دیگر کتب میں بالعموم کتاب کی عبارت سے باہر جانے کی بالکل کوشش نہ کی جائے بلکہ صرف حل عبارت پر توجہ دی جائے؛ بہ طور خاص نحو میر، میزان (یا درجہ اولیٰ میں نحو و صرف کی جو بھی کتاب پڑھائی جائے) ہدایۃ النحو اور علم الصیغہ، قدوری، کافیہ، اصول الشاشی وغیرہ، لمبے چوڑے خارجی مباحث سے طلبہ کے ذہنوں کو مشوش کرنے سے لازمی طور پر اجتناب کیا جائے۔

(۵) درج بالا ابتدائی کتابوں میں مذکورہ قواعد اور مسائل سہل اور بے غبار انداز میں طلبہ کو پڑھائے جائیں اور پھر عام فہم داخلی و خارجی امثلہ (خارجی مثالوں اور خارجی مباحث میں فرق ملحوظ رکھا جائے) سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی جائے۔

(۶) ترجمہ اور تفسیر قرآن پڑھانے والے اساتذہ، طلبہ کو لفظی ترجمہ سمجھانے کا اہتمام کریں اور ساتھ ہی مقصود قرآن اور حق تعالیٰ شانہ کی مراد کو بیان کرنے کا التزام ہو، یعنی یہ بتایا جائے کہ قرآن کس جگہ کیا کہنا چاہ رہا ہے اور اس کا مقصود و مدعیٰ کیا ہے۔

(۷) طلبہ سے عبارت پڑھوائیں اور ان کی عبارت صحیح کرانے کی طرف توجہ دیں؛ کیونکہ عبارت سمجھے بغیر تقریریں یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۸) قدوری میں طلبہ کو صرف صورت مسئلہ، اس کا حکم اور مختصر دلیل بتایا کریں اور کنز میں ذرا آگے بڑھ کر اس کی علت بیان کریں، اور تعارض ادلہ، تطبیق اقوال، اسباب ترجیح اور اس طرح کی دیگر تفصیل طلب گتھیاں سلجھانے سے انہیں بالکل پریشان نہ کریں کہ ابھی اس کی فہم و ضبط کی حد تک نہیں پہنچے ہیں۔

(۹) استاذ اپنے مقررہ وقت پر درسگاہ جایا کرے اور مقررہ وقت پر ہی درسگاہ سے اٹھے، وقت کی پابندی نہ کرنا دیانت داری کے خلاف اور موجب گناہ بھی ہے، اس سے استاذ کا وقار بھی متاثر ہوتا ہے، طلبہ کے ذہنی انتشار، تکاسل اور بے توجہی کا بھی باعث ہے اور عموماً وقت کم رہ جانے کے سبب سبق بھی شایان شان نہیں ہو پاتا، لہٰذا پورا پیریڈ درس گاہ میں گزارا جائے اور فاضل ٹائم میں طلبہ سے آموختہ سنا جائے یا انہیں کوئی مفید نصیحت کی جائے۔

(وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص:۳۰۷)

تدریس کے چار بنیادی اصول

از: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب

(۱) مضمون درس اور نفس سبق پر قدرت:

جو سبق آپ کو پڑھانا ہے، ضروری ہے کہ پہلے آپ خود اسے اچھی طرح سمجھے ہوں، اس کے لیے ضروری معلومات آپ کے پاس ہوں، اس کے متعلق جو شبہات اور سوالات ایک طالب علم کے ذہن میں آسکتے ہیں، ان کی اور ان کے حل اور جوابات کی تفصیل آپ کے ذہن میں ہو اور ظاہر ہے یہ چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی نے متعلقہ سبق کے لئے بھر پور مطالعہ اور تیاری کی ہو، مطالعہ کو مختلف تدریجی مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ہر آدمی اپنے ذوق اور وقت کے اعتبار سے ان میں طوالت اور اختصار سے کام لے سکتا ہے؛ لیکن اس قدر تیاری ہر استاذ کے لئے لازمی ہے کہ اولاً نفس عبارت کا حل ہو، درس نظامی کی کتابیں اکثر مغلق اور پیچیدہ ہیں، ان کی عبارتوں کو حل کرنے اور سمجھنے میں کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، نفس سبق کے حل میں عبارت کا درست تلفظ، اعرابی حالت کی درستگی، مشکل الفاظ کے معانی،

عبارت کا مفہوم اور مقصد کو سمجھنا داخل ہے، بسا اوقات کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے، یا عبارت کسی شبہے کا جواب ہوتی ہے، کسی خاص بات سے احتراز کے لئے کوئی قید بڑھادی جاتی ہے، حل عبارت میں ان تمام متعلقہ چیزوں سے واقف ہونا ضروری ہے، عموماً بین السطور اور حواشی نے حل عبارت سے متعلق ان تمام یا اکثر باتوں کی وضاحت کی ہوتی ہے، ثانیاً حل عبارت کے ساتھ مضمون درس سے بھی واقفیت اور اس فن میں ضروری مطالعہ ہونا چاہئے۔

(۲) تعبیر

اچھی تدریس کی دوسری بنیاد "تعبیر اور اظہار مافی الضمیر" پر قدرت ہے، یعنی جس سبق کا آپ نے مطالعہ کیا ہے، تیاری کی ہے، آپ خوبصورت اسلوب اور دلنشیں انداز میں وہ طلبہ کے سامنے بیان کرسکیں، صحیح، واضح اور دلنشیں تعبیر اور انداز بیان کے بغیر عمدہ تدریس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، ایک مدرس اور استاذ وسیع مطالعہ رکھتا ہے، سبق کے مضمون اور متعلقہ بحثوں پر عبور اور گہری نظر رکھتا ہے؛ لیکن اپنے مافی الضمیر کے اظہار اور طلبہ کے سامنے اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرنے کے لیے اس کے پاس لفظوں کی مناسب زبان نہیں، ایسے استاذ کے سبق اور علم سے طلبہ زیادہ استفادہ نہیں کرسکتے، اور وہ ایک اچھا مدرس نہیں کہلاسکتا۔

وہ فضلاء جو نئے نئے فارغ ہوکر میدان تدریس میں آتے ہیں، ماشاء اللہ ان کے جذبات تازہ، خون گرم اور شوق جوان ہوتا ہے، زیر تدریس کتاب کے لئے اکثر وہ خوب مطالعہ کرتے ہیں؛ لیکن عموماً تعبیر اور اسلوب بیان کی طرف توجہ نہیں دیتے، ایسے حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر وہ تعبیر میں کمزور ہیں تو بجائے اس کے کہ ایک کتاب کے لئے پانچ چھ شروح کا مطالعہ کرنے اور غیر متعلقہ مباحث کو ذہن میں محفوظ کرنے کی مشقت برداشت کریں، وہ تدریس کے لئے اپنی تعبیر کی درستگی اور اظہار مافی الضمیر کی عمدہ صلاحیت

حاصل کرنے کی طرف توجہ مبذول فرمائیں۔"اظہار مافی الضمیر کی صلاحیت" سے مراد، وہ خطیبانہ صلاحیت نہیں ہے جو وعظ وارشاد، جلسوں اور جمعہ کے خطبوں میں کام آتی ہے، وہ ایک مختلف چیز ہے اور اس کے اصول اور تقاضے بھی الگ ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مدرسانہ صلاحیت ہے جس کا اظہار مسند درس پر بیٹھ کر ہوتا ہے، یعنی جس سبق کی آپ نے رات کو تیاری کی ہے، اس کو عام فہم اسلوب، آسان الفاظ اور دلنشیں انداز میں طلبہ کے سامنے آپ میں بیان کرنے کی ایسی صلاحیت ہو کہ درس میں وہ سبق بھی طلبہ کی سمجھ میں آجائے اور اسلوب کی شیرینی اور کلام کی مٹھاس سے بھی سامعین محفوظ ہوں، تعبیر کی حلاوت وشیرینی مشکل اور طویل سبق میں بھی انہیں اکتانے اور بور ہونے نہ دے۔

اس طرح کی عمدہ تعبیر پر قدرت پانا کوئی ایسا آسان نہیں کہ وہ مشق وریاض کے بغیر حاصل ہوجائے گی، بلکہ اگر کہا جائے کہ سبق سمجھنے اور اس کے لئے متعلقہ امور کی تیاری سے یہ کام زیادہ مشکل ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا، چنانچہ اس کے لئے ٹھیک طرح کی ریاض اور محنت کی ضرورت ہے، اس مشق اور محنت کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو سبق آپ کو اگلے دن پڑھانا ہے، آپ پہلے تنہائی میں اسے اس تصور کے ساتھ دہرائیں کہ آپ درس گاہ میں طلبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا رہے ہیں، تنہائی کے اس تجرباتی عمل میں آپ ایک مفہوم کی مختلف تعبیرات میں ترجمانی کی مشق کریں، اس مشق میں آپ کے سامنے ایک مفہوم کے لئے مختلف تعبیرات آئیں گی، آپ کا ذہن متنوع اسالیب اور اظہار کی متعدد شکلیں بنائے گا، جس سے رفتہ رفتہ سبق پڑھانے کی عمدہ تعبیر کی صلاحیت اور مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں سمجھانے کا ملکہ آپ میں ان شاء اللہ پیدا ہوجائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر تنہائی کی اس تجرباتی تدریس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس اصول کی طرف اہتمام کے ساتھ توجہ اس لئے مبذول کرائی گئی ہے کہ بعض نو واردانِ بساط تدریس، علمی دھاک بٹھانے یا آتش شوق بجھانے کے لئے رات رات بھر مطالعہ کرتے ہیں، نوادرات حفظ کرتے ہیں، نکات یاد کرتے ہیں؛ لیکن اگلے دن درس میں اس مطالعہ، ان نوادرات اور ان نکات کو طلبہ کے سامنے بیان کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی مناسب ترجمان نہیں ہوتا، ٹوٹی پھوٹی تعبیر میں اگر رات بھر کی محنت کو لفظوں کی زبان مل بھی گئی تو طلبہ پر اس کا اثر اس مہمان کے تاثر سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا جس کی خدمت میں عسل مصفی ٹوٹے جام یا میلے پیالے میں پیش کیا گیا ہو۔

(۳) نظم و ترتیب:

عمدہ تدریس کے لئے تیسرا بنیادی اصول ''نظم و ترتیب'' ہے، یعنی آپ نے درس کے لئے جو مطالعہ کیا ہے اور سبق کے متعلق جو کچھ آپ طلبہ کے سامنے کہنا چاہتے ہیں، ضروری ہے کہ اس میں آپ نے ذہنی خاکہ بنا کر ایک ترتیب اور نظم قائم کر لیا ہو کہ کون سی بات کہاں کہنی ہے اور کون سی بحث کس بحث سے پہلے یا بعد میں کرنی ہے، اگر آپ کو نفس درس اور اس کے اظہار دونوں پر تو عبور ہے لیکن اس میں بے ترتیبی کا نقص موجود ہے تو آپ کا سبق طلبہ کو ذہن نشیں نہیں ہو سکے گا، پہلے سے ذہن میں نظم و ترتیب قائم نہ کرنے کی وجہ سے اکثر ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ درس میں مطالعہ کی ہوئی مختلف باتوں کا ذہن پر یک دم ہجوم ہونے سے آدمی تشویش کا شکار ہو جاتا ہے، جو بات آخر میں کہنے کی ہوتی ہے، وہ اول میں کہہ دی جاتی ہے اور جو اول میں کہنے کی تھی، وہ سرے سے یاد ہی نہیں رہتی، یا وہاں کہنا پڑتی ہے جہاں اس کا موقع نہیں ہوتا، بد نظمی اور بے ترتیبی کا شاخسانہ اسی طرح ہوتا ہے، اس لئے عمدہ تدریس کے لئے ذہن میں عمدہ نظم اور ترتیب بہر حال ضروری ہے۔

(۴) طلبہ کے معیار و مستویٰ کی رعایت:

تدریس میں طلبہ کے معیار اور مستوی کا خیال رکھنا بھی ایک ضروری امر ہے، ابتدائی طلبہ کے لئے سبق میں آسان اسلوب، عام فہم الفاظ اور علمی اصطلاحات کے بجائے عمومی زبان اختیار کرنی چاہئے، ایک بات کو بار بار دہرانا بھی ان کے لئے مفید ہوتا ہے، جب کہ اگلے درجوں میں علمی زبان اور فنی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے، اگر کوئی مدرس نحو میر کے طلبہ کے سامنے شرح جامی کی تحقیقات بیان کرنا شروع کر دے یا شرح جامی کے طلبہ کی خدمت میں اسم کی تعریف بار بار دہرانے اور سمجھانے پر زور صرف کرنے لگ جائے، ظاہر ہے کہ اس کی یہ محنت نہ صرف یہ کہ بے فائدہ ہے؛ بلکہ مضر ہے، اس کے لئے بھی اور طلبہ کے لئے بھی، اسی طرح درجہ سابعہ اور دورۂ حدیث کے منتہی طلبہ کے سامنے اگر آپ ''قال'' اور ''حدثنا'' کا ترجمہ بار بار دہرائیں گے، یقیناً یہ آپ ایک ایسے عمل کا ارتکاب کریں گے جس کا نہ کوئی فائدہ مرتب ہوگا، نہ کوئی خوشگوار اثر، یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا جو علامہ دینوریؒ نے اپنی مشہور کتاب ''عیون الاخبار'' میں لکھا ہے کہ مشہور عالم ابن سماک تقریر کر رہے تھے، ان کی باندی گھر بیٹھی سن رہی تھی، وہ تقریر سے فارغ ہو کر گھر آئے اور باندی سے پوچھا ''میری تقریر کیسی رہی؟'' اس نے جواب دیا ''تقریر تو بہت اچھی تھی مگر ایک بات کو بار بار دہرانا پسند نہیں آیا'' ابن سماک نے کہا ''میں بار بار اس لئے دہرا رہا تھا؛ تا کہ جو نہیں سمجھا وہ سمجھ جائے'' باندی نے کہا ''جب تک نہ سمجھنے والوں کو آپ سمجھاتے رہے، اس وقت تک سمجھنے والے اکتاتے رہے''۔ بہر حال طلبہ کی علمی صلاحیت، ان کے درجے کے معیار اور مستوی کو درس میں پیش نظر رکھنا عمدہ تدریس کا ایک بنیادی اصول ہے اور اس اصول کی رعایت ایک مدرس کو ضرور رکھنی چاہیے،

آخر میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ریکارڈ میں محفوظ اکابر علماء کے مرتب کردہ ضوابط میں سے وہ ضابطہ نقل کیا جاتا ہے جو طریقۂ تدریس وتعلیم سے متعلق ہے، اس میں مرقوم ہے:

''عام طور پر مدرسین ابتداء سال میں لمبی لمبی تقریریں کیا کرتے ہیں اور نفس کتاب کی عبارت حل کرنے اور اصل مسائل فن طلبہ کو ذہن نشیں کرانے کے بجائے نہ صرف حواشی وشروح کے مفید مضامین، بلکہ لایعنی قیل وقال کی الجھنوں میں طلبہ کے ذہنوں کو ماؤف کر دیتے ہیں، اگر کوئی طالب علم کچھ بولتا ہے تو الزامی جوابات دے کر اسے خاموش کر دیتے ہیں اور اسی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مہینوں میں کتاب کے چند ورق سے زیادہ نہیں ہوتے اور آخر میں جب سال ختم ہونے لگتا ہے تو ایسی تیز رفتاری اختیار کرتے ہیں کہ کتاب کی بس تلاوت ہی باقی رہ جاتی ہے، اس لئے کہ اگر ایسا نہ کریں تو کتاب ختم نہ ہو، اگر شہرۂ آفاق صاحب فن استاد ہوتے ہیں تو وہ داد تحقیق دینے اور فن کا حق ادا کرنے کے سامنے کتاب ختم کرانے کی پرواہ ہی نہیں کرتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے اہم ترین مسائل ومباحث اس بے اعتدالی کی بنا پر بے پڑھے رہ جاتے ہیں جو بسا اوقات فن کی دوسری کتابوں میں یا آتے ہی نہیں یا اس تفصیل کے ساتھ نہیں آتے جیسے زیر درس کتاب میں ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نقص ہے کہ اگر اس کا ازالہ نہ کیا جائے تو تعلیم کا ادھورا اور طلبہ کی استعداد کا ناقص رہ جانا یقینی ہے، اصولاً مدرس کا اصلی مطمح نظر ہر کتاب کو پڑھاتے وقت، نہایت سادہ اور

سہل انداز میں جلی عبارت اور تفہیم معانی و مطالب ہونا چاہئے، اگر فن کی ابتدائی کتاب ہے تو صرف مبادی و مسائل فن کو ذہن نشین کرانے پر اکتفا کرنا چاہئے، اور اگر اوسط درجے کی کتاب ہے تو بقدر ضرورت دلائل و براہین سے مسائل فن کا اثبات و تفہیم پیش نظر ہونا چاہئے، اور اگر فن کی آخری درسی کتاب ہے تو نہ صرف دلائل و براہین کے بیان پر اکتفا کیا جائے بلکہ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں مسئلۂ زیر درس سے متعلق ضروری مباحث و تحقیقات کو بھی ضرور بیان کرنا چاہئے۔ ہر کتاب کی خصوصیات پر متنبہ کرنا بھی از بس ضروری ہے۔ بہر صورت طول لا طائل اور خارج از کتاب مباحث سے اجتناب ضروری ہے، تدریجی طور پر فن اور مسائل فن سے آگاہ کرنا مفید ہوتا ہے، نیز ہر شریک درس طالب علم کی حالت سے واقف ہونا بھی مدرس کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ کس حد تک سبق کو سمجھ رہا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہر طالب علم سے ایسے سوالات کرے جن سے سبق کے سمجھنے کا حل معلوم ہو سکے، اسی طرح بلا تعیین مختلف طلبہ سے سوالات کرے؛ تاکہ ہر ہر طالب علم کتاب کو سمجھنے، سبق کو یاد کرنے اور مطالعہ کرنے پر مجبور ہو، عموماً مدرسین، جماعت کے ذہین طلبہ کو پیش نظر رکھ کر درس دیتے ہیں، ان ہی سے سوالات کرتے ہیں، یہ طریقہ سخت مضر ہے، اس سے کمزور طلبہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور استفادہ سے محروم رہ جاتے ہیں؛ بلکہ وہ خود کو بالکل ہی مرفوع القلم سمجھ لیتے ہیں اور پھر سننے اور سمجھنے کی جانب توجہ ہی نہیں کرتے اور کورے کے کورے رہ جاتے ہیں، اس

لئے مدرس کا فرض ہے کہ وہ اپنے معیار علم کے مطابق درس نہ دے؛ بلکہ طلبہ کے ذہنوں کی سطح پر اتر کر درس دے اور ''اقتد بأضعفهم'' کے اصول پر عمل کرے تاکہ تعلیم کا فرض ادا کر سکے۔

روحانی اور معنوی اثر:

تدریس میں معنوی اور روحانی تاثیر کے لئے یہاں دو چھوٹے چھوٹے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے ایک مرتبہ کسی نے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے متعلق سوال کیا، انہوں نے جواب میں فرمایا:

> ''جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے، یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، البتہ طریقہ تعلیم تھوڑا سا بدل گیا...... وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضرات اساتذہ ایجاز و اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشیں ہو جاتی تھی، اب لوگ اس کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، جو کچھ رات کو دیکھا، صبح کو بیان کیا، وہ نقل اور سرِ دِروایت ہوتا ہے اور وہ جو قلبی کیفیت ہے، وہ شامل نہیں ہوتی''

عالم عرب کے مشہور مفکر علامہ یوسف قرضاوی اس موضوع پر اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''کئی مدارس و جامعات میں آپ بہتر نصاب تو ضرور پائیں گے لیکن اچھا استاذ آپ کو نہیں ملے گا، اگر کوئی علمی نقطۂ نظر سے بہتر بھی؛ ہوتا ہم ایمانی قوت کے لحاظ سے وہ مردہ دل ہوگا، یہاں قطر میں ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ ہم

نے اسلامی علوم میں موضوع کے لحاظ سے بڑی عمدہ کتابیں لکھیں، لیکن ان کتابوں کو ایسا استاذ میسر نہیں آیا جو انہیں تر وتازگی کے ساتھ زندہ جاوید طلبہ تک منتقل کر سکے، بلکہ مردہ دل اساتذہ نے زندہ موضوعات کو مردہ بنا دیا اور جمود سے اس کی حرارت پر افسردگی طاری کردی۔'' (قیمۃ الأمۃ الاسلامیۃ ص:۴۷)

اس لیے یہ بات ملحوظ رہے کہ تدریس کے ذکر کردہ یہ طریقے، یہ اصول اور یہ مبادی ایک طرف، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن ان طریقوں سے آپ صرف خشک بحث، نرا مضمون اور صرف فنی موضوع طلبہ تک منتقل کر سکتے ہیں جو ایک مدرس کا بہر حال فرض منصبی ہے؛ لیکن علم کی اصل روح، علم کی نورانیت اور علم کی وجد آفرین تاثیر منتقل کرنے کے لئے صرف ان اصولوں کی رعایت کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے دل کے اس درد، جگر کے اس سوز اور ایمان کی اس کیفیت سے متصف ہونا بھی ضروری ہے جو ایمانی زندگی اختیار کرنے کے بعد اللہ جل شانہ کی توفیق سے انسان کو حاصل ہوتی ہے، عمل صالح کی خوشبو سے معطر ایمان والی زندگی، جس میں دعا وابتہال ہو، رجوع الی اللہ ہو، ندامت کے اشکوں سے روح وقلب کی کثافتوں کی تطہیر کا اہتمام ہو، جس کے اپنانے کے بعد دل کی مردگی وافسردگی، نشاط وتازگی میں بدلے گی، اور دل کی سرد انگیٹھی میں حرارت آئے گی؛ ایمان کی حرارت، اخلاص کی حرارت، شوق وجذبے کی حرارت، جگر کے سوز وگداز اور روح کی سیمابی کی حرارت، پھر جو بات زبان سے نکلے گی، وہ جا کے دل پر لگے گی اور طلبہ کی زندگیوں میں خوش گوار دینی انقلاب کا ذریعہ بنے گی، اللہ جل شانہ ہمیں اس طرح کی ایمانی زندگی نصیب فرمائیں، ہمارا مرنا اور جینا، پڑھنا اور پڑھانا صرف اسی کی رضا کے لئے ہو، صرف اسی کے لئے ہو۔ (آمین)

(وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص:۳۲۹)

بہترین استاذ کی خوبیاں اور ذمہ داریاں

از: حضرت مولانا انوار الحق صاحب

(۱) ایک مدرس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دینے اور ان کی صحیح تربیت کرنے اور ان کی اصلاح کرنے میں بھی خیر خواہی سے کام لے، اس لئے ہر مدرس اور استاذ اپنے شاگردوں کی صحیح تربیت کرے، ان کی تعلیم اور اصلاح پر پوری توجہ دے، ان کے اسباق کا پورا پورا خیال رکھے۔

(۲) خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ ایک استاذ میں رحمت کی صفت بھی ہونی چاہئے کہ اس کے دل میں اپنے شاگردوں کے لئے رحمت اور شفقت کا جذبہ ہو، قرآن پاک کی آیت: ﴿الرحمٰن علم القرآن﴾ میں اسی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے، اس لئے استاذ کو اپنے طلباء کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہئے اور نہ ان کی تحقیر کرنا مناسب ہے اور نہ خواہ مخواہ ان پر سختی کرنا درست ہے، معلم کا کام اپنے طلباء اور شاگردوں کو نفع پہنچانا ہے اور بے جا سختی، بے پروائی اور بے وقعتی میں نفع ختم ہو جاتا ہے، یا کم از کم ناقص رہ جاتا ہے اور تشدد سے بچہ میں بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۳) **تعلیم المتعلم** میں علامہ برہان الدین زرنوجیؒ طالب علم کو استاذ کے انتخاب کے وقت چند امور کا پابند بناتے ہوئے فرماتے ہیں: طالب علم کو ایسے شخص کی شاگردی کرنی چاہئے جو اچھا عالم، پرہیزگار اور سن رسیدہ ہو، استاذ کے تعین سے پہلے ماہرین سے مشورہ کرنا چاہئے، جب انتخاب ہو جائے پھر صبر و استقامت سے اس کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہے، کلاس میں شریک سبق کا انتخاب بھی سوچ سمجھ سے کرے، سبق کا ساتھی ایسا ہو جو محنتی، پرہیزگار، سمجھ دار ہو، لا ابالی، مہمل اور آوارہ جیسی مذموم صفات کا حامل نہ ہو۔

(۴) خیر خواہی یہ بھی ہے کہ اپنے طلباء کے لئے دعائیں بھی کی جائیں، اس لئے کہ دعاء سے طالب علموں کے علوم میں برکت آتی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاگرد تھے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سینے سے لگایا اور فرمایا،" اللھم علمه الکتاب "یعنی:" اے اللہ! اس کو قرآن کا علم عطا فرمادے"۔ (صحیح بخاری)

(۵) اسی طرح ایک مدرس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علموں کے اچھے اسباق اور اچھے اخلاق پر دل جوئی کرے، اس سے طالب علم کے شوق اور جذبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا تو میں نے خوب سیر ہو کر پیا، پھر بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا، لوگوں نے عرض کیا کہ حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی؟ فرمایا: دودھ سے مراد علم ہے۔ (صحیح بخاری) اس روایت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچا ہوا دودھ حضرت عمر کو دینا اس کی دل جوئی کی واضح دلیل ہے۔

(۶) اسی طرح ایک مدرس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ طلباء کو اسباق میں ناغہ نہ کرنے دے اور اگر کسی مجبوری کے تحت ناغہ ہو بھی جائے تو پھر دوسرے اوقات میں اس کی تلافی کا انتظام کرے اور جتنی ان میں صلاحیت اور استعداد ہے اس کے اعتبار سے اسباق کی مقدار مقرر کرنی چاہئے، صحیح بخاری شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:" حدثوا الناس بما یعرفون أتحبون ان یکذب اللّٰہ ورسوله "، یعنی" لوگوں سے ایسی بات کرو، جو وہ سمجھیں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے"۔ ان کے فہم اور استعداد کے مطابق عبارات کی تشریح کریں اور اسلاف کا طریقہ تدریس ہمارے سامنے ہونا

چاہئے، امام شافعیؒ کے شاگرد ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں کہ مجھے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تجھے علم گھول کر پلاسکتا تو ضرور پلا دیتا۔

(۷) اور جب تک ان کو گزشتہ سبق یاد نہ ہو تو محض ''آگے دوڑ اور پیچھے چھوڑ'' پر عمل نہ کیا جائے؛ بلکہ ان کو سبق یاد کرانے کی کوشش کی جائے اور جو سبق آج پڑھایا تو دوسرے دن وہ سبق ان سے سنا جائے یا گزشتہ سبق کے متعلق چند سوالات کی صورت میں جوابات طلباء سے پوچھے جائیں۔

(۸) ہفتہ میں ایک دن ضرور مقرر کیا جائے، جس میں طلباء سے ہفتہ بھر کے گزشتہ اسباق کے متعلق سوالات کئے جائیں؛ تاکہ ان کو اسباق یاد رہیں۔

(۹) اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شاگردوں کو پیار اور محبت سے سمجھائیں؛ لیکن اگر حسب موقع مثلاً اگر کسی طالب علم سے کوئی نامناسب امر سرزد ہوا تو اس کو مناسب سزا دی جائے، جس میں اس کی تربیت اور اصلاح کا زیادہ فائدہ ہو، غیر مناسب سزا سے نہ صرف شاگرد کی تربیت و تعلیم متأثر ہوتی ہے؛ بلکہ اس کی شخصیت کے متأثر ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے، بعض اوقات آپ حضرات نے محسوس کیا ہوگا کہ بدترین سزائیں دینے کی صورت میں بعض متعلمین مستقل طور پر ناکارہ بن کر ان کی جسمانی، ذہنی، جذباتی قوتیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جدید دور کے ماہرین تعلیم و نفسیات علامہ ابن عبد البرؒ اور امام غزالیؒ کے اصولوں پر چل کر سزا کی مخالفت کرتے ہیں، آج جدید دور کے اصلاحی تصورات پر عمل کرتے ہوئے اکثر ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی اداروں میں سزا پر قانونی پابندی لگوادی گئی ہے، امام غزالیؒ نے بداخلاقی، بے راہ روی، کجی کی عادتوں سے منع کرنے کے لئے سزا تجویز کی ہے؛ لیکن یہ تب جب ترغیب کے سارے راستے نتیجہ خیز ثابت نہ ہوں۔

(۱۰) اگر کوئی طالب علم سبق سمجھنے کے لئے کوئی سوال کرے تو اس پر استاذ کو ناراض نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ خندہ پیشانی اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دے، تاکہ طالب علم اپنا سبق سمجھ سکے، تدریس میں شاگرد کے سوالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد شاگرد کی ذہنی نشوونما کرنا ہے اور اس کا مؤثر ذریعہ سوالات ہیں، طلباء میں اس کے ذریعہ مزید معلومات کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس سے طلباء و استاذ کا اشتراک پیدا ہونا، طلباء کے تعلیمی مشاکل کو حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، یہاں یہ یاد رہے کہ سوالات اگر اساتذہ کی طرف سے ہوں یا تلامذہ کی جانب سے، ان سے غور وفکر اور تجسس کا مادہ طلباء میں بڑھ جاتا ہے۔

(۱۱) ایک مدرس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ طالب علم کے کسی اشکال پر ناراض نہیں ہونا چاہیے، ہاں اگر کوئی فضول سوال ہو تو اس پر ناراض ہونا بھی جائز ہے۔

(۱۲) اسی طرح ایک کامیاب مدرس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اول تا آخر تعلیم میں یکسانیت پیدا کرے اور کتاب کو اس طرح پڑھائے کہ کتاب میں کوئی اہم بحث رہ نہ جائے، یہ بہت ہی غلط طریقہ ہے کہ ابتداء میں دو ماہ بڑی بڑی تقریریں ہوں اور بعد میں صرف عبارت پر اکتفاء ہو، کتاب کے پڑھانے کے لئے عمدہ اور دل نشیں طریقہ اختیار کریں اور کتاب کے حل کرنے میں قطعاً تسامح سے کام نہ لیا جائے اور حل کتاب میں فن کی مہمات کی طرف طلباء کی توجہ دلائیں۔

(۱۳) اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلباء میں علمی ذوق پیدا کریں، ان کو مطالعہ و تکرار کی طرف توجہ دلائیں اور ان پر مطالعہ کی اہمیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو انہماک کے ساتھ مطالعہ کی تلقین کریں، محمد بن سماعہؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے خاص شاگرد

ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے مطالعہ کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی آپ کو سلام کرتا تو انہماک کی وجہ سے جواب میں اس کو دعا کرنے لگتے۔

(۱۴) طلباء میں استعداد پیدا کرنے کے لئے ان چند باتوں کا التزام کیا جائے تو طالب علم کو سبق یاد ہو یا نہ ہو، استعداد ضرور پیدا ہوگی:

(۱) طالب علم سے آیندہ پڑھنے والے سبق کا مطالعہ کرایا جائے۔(۲) اس کے سامنے یہ بات رکھی جائے کہ وہ حاضر دماغ ہوکر استاد کے درس کو سنے۔(۳) سبق پڑھنے کے بعد اس سبق کو ایک مرتبہ زبان سے دوبارہ پڑھنے کی عادت طالب علم میں ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۱۵) مدرس کی ذمہ داری ہے کہ وہ کلاس میں جانے سے پہلے سبق کی تیاری کرے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ بغیر تیاری کے معلم (مدرس) اپنے طلباء کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا ۔علامہ کے اصول پر آج مغربی دنیا میں ماہرین تعلیم سو فیصد عمل کرتے ہیں اور تمام تربیتی اداروں میں ان اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

(۱۶) ایک مدرس میں یہ صفت انتہائی ضروری ہے کہ وہ بےغرض انسان ہو، تعلیم دینے میں اس کے مدنظر صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی ہو، دل میں شہرت، دولت وغیرہ کی خواہش نہ ہو، اور خوب دل جمعی کے ساتھ طلباء کو تعلیم دے، طلباء کو ٹرخانے کی کوشش نہ کرے۔

(۱۷) استاد میں یہ خوبی بھی ضروری ہے کہ اگر درس میں کوئی غلطی ہوجائے تو فوراً اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے اور اپنی غلط بات سے رجوع کرے، اس طرح کرنے سے طلباء کو اپنے استاد پر اعتماد رہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے استاد سے جو کچھ سنتا ہوں صحیح اور درست سنتا ہوں اور اپنی غلط بات سے باوجود مطلع ہونے کے رجوع نہ کیا گیا تو ایک تو گناہ کا ارتکاب ہوگا اور دوسرا جب طالب علم کو استاد کی غلطی کا پتہ چل جائے گا تو اس کے دل میں

استاد کے خلاف نفرت پیدا ہوگی۔ تیسرا چونکہ استاد کا اپنے شاگرد پر اثر ہوتا ہے تو اس ہٹ دھرمی کا اثر اس کے شاگرد پر ہوگا اور استاد" سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها (الحدیث) کا مصداق ہوگا۔ چہارم اس طرح کرنے سے شاگردوں کے حقوق کی بھی حق تلفی ہوگی۔

لہٰذا جب کوئی استاد ان ذمہ داریوں کے ساتھ طلباء کو سبق پڑھائے گا تو اس کے شاگرد مایہ ناز طالب علم ہوں گے اور ان میں یقینی طور پر استعداد پیدا ہوگی۔

(وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص: ۳۳۴)

مدارس کے قیام کا مقصد

از: مولانا الیاس بھٹکلی صاحب

ہمارے مدارس کا قیام شریعت کے ماہرین اور دین کے متخصصین پیدا کرنے کے لئے ہوا ہے، دینی مدارس تو دراصل ملت اسلامیہ کی اس ضرورت کی تکمیل کا سامان فراہم کرتے ہیں، جس کا حکم اللہ رب العزت نے سورہ توبہ کے اخیر میں پوری امت کو مخاطب کر کے دیا ہے کہ "تم میں سے ہر قوم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دین کی گہری سمجھ حاصل کرے اور دعوت کا فریضہ انجام دے،" ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾ قرآن کے حکم کے مطابق ہر زمانے میں علماء کی اس جماعت کی ضرورت رہے گی اور قیامت تک اسلام پر بقاء کے لئے ایسے علماء کا وجود ملت کے لئے ناگزیر ہوگا، ہمارے دینی مدارس الحمدللہ اپنے اسی فریضہ کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور ہزارہا اپنی انتظامی و تربیتی کمزوریوں کے باوجود-جس کا خود انہیں احساس ہے-اس کی اصلاح کی بھی کوشش کر رہے ہیں، الحمدللہ ذمہ داران مدارس بھی اپنی بصیرت و فراست کے ذریعے دشمنوں کی ان چالوں کو سمجھنے کے باوجود عالمی سطح پر

رونما ہونے والے واقعات وحالات کے پس منظر میں دینی تعلیم کی روح کو باقی رکھتے ہوئے اس دینی تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی بھی کوشش کررہے ہیں، جس سے فارغین مدارس دعوتی میدان میں اور بہتر طریقہ پر اپنے فرائض کو انجام دے سکیں؛ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ قرآن مجید میں بیان کئے گئے ایسے علماء جوملت کی ناگزیر ضرورت ہیں، دینی مدارس کے بجائے کیا مسلم اسکولوں و اسلامی کالجز یا یونیورسٹیوں سے پیدا ہونے کی ہم امید رکھیں، یا پھر ایسے مدارس سے جو حد سے زیادہ عصری علوم کی شمولیت کے ساتھ ''نہ گھر کے نہ گھاٹ کے'' مصداق بن کر سامنے آرہے ہیں، یاد رکھئے کہ ایسے علماء خالص دینی تعلیم کے ان مدارس ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور پیدا ہوں گے، غرض یہ کہ ہمارے یہ دینی مدارس ہی ہیں جو آج ہندوستان کو اندلس بننے سے اور یہاں اس کی تاریخ دہرانے کی دشمنوں کی شاطرانہ چالوں کو کامیاب ہونے سے روکے ہوئے ہیں، اس لئے ان مدارس کی حفاظت و وکالت ہم سب کا ملی فریضہ ہے۔

(وفاق المدارس العربیہ پاکستان، ص:۸۱۸)

رموز تدریس

اردو شروحات کا فتنہ:

از: حضرت مولانا نظام الدین شامزائیؒ

ایک تجربے کی بات عرض کرتا ہوں میری اتنی عمر گزر گئی کہ آپ میں سے اکثر کی عمر اتنی نہیں ہوگی، مجھے ۳۱، ۳۲ سال پڑھاتے ہوئے ہوگئے، آج کل جو ایک آفت آئی ہوئی ہے کہ ہر کتاب کی اردو شرح ہے، اردو کی شرح استاد بھی پڑھتا ہے اور طلباء بھی پڑھتے ہیں، استاد بھی محنت نہیں کرتا، بس جانے سے ۱۰ منٹ پہلے ایک نگاہ دوڑائی اور جا کر وہاں اگل دیتا

ہے، یہ نہایت مضر ہے اس فن کے ساتھ، جس کو آپ اس طرح اس کیفیت کے ساتھ پڑھائیں گے تو میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ آپ کو اس سے مناسبت پیدا نہیں ہوگی، مناسبت دو باتوں سے پیدا ہوگی:

(۱) اس کتاب کے محققین علماء نے جو شروح لکھی ہیں، ان سے مطالعہ کرے۔

(۲) اس فن کے متقدمین کی کتابوں پر نظر ڈالے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں، ہمارے متاخرین نے ہر علم کو ایک پہیلی بنایا ہے جسے بوجھنا پڑتا ہے۔ متقدمین کے ہاں بہت سہولت ہے، آپ متقدمین کی کتب پڑھیں گے بالکل سیدھی سادھی آسان عبارت ہے، مثلاً اصول الفقہ ہے، آپ ملا بہاری کی **مسلم الثبوت** اٹھا کر دیکھیں آپ جصاص رازی کی کتاب **اصول الجصاص** اٹھا کر دیکھیں۔

(رموز تدریس وتربیت: ۴۲-۴۳)

حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ رقمطراز ہیں:

* جو طلبہ مدارس کے اندر علم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا اہتمام بے حد ضروری ہے۔

* اچھے معلم اور مدرس کی پہچان یہ ہے کہ طلبہ اس کے سبق کو اتنی اہمیت دیں کہ وہ کسی قیمت پر اس سبق کو ناغہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور اس استاذ کے سبق کو یاد کرنے میں وہ مبالغہ کی حد تک کام لیں۔

* استاذ سبق کی ایسی تیاری کر کے آئے کہ وہ سبق اس کو زبانی یاد ہو، مختلف عنوانات سے وہ طلبہ کو سمجھانے پر قادر ہو۔

* استاذ کو اس بات کی بہت رعایت کرنی چاہئے کہ جو طلبہ جماعت میں کمزور ہیں، ان

کو پیش نظر رکھ کر سبق پڑھایا جائے۔

* طلبہ کو سبق میں سوال کی اجازت بھی ہونی چاہئے۔

* طالب علم اور استاذ کے درمیان مرتبے کا فرق برقرار رہے۔

* جو طلبہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان کی ذہن سازی اس نقطۂ نظر سے بھی بے حد ضروری ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔

* ان مولویوں نے علم حاصل کرنے کے بعد اپنی اولاد کو دوسرے شعبہ سے متعلق کر دیا اور علم دین کے لئے اپنی اولاد کا انتخاب نہیں کیا، وہ اپنے عمل سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ہم تو بدقسمت تھے جو ہم نے علم دین حاصل کیا، ہم اپنی اولاد کو بدقسمت نہیں بنائیں گے۔

(رموز تدریس و تربیت: ٦٢)

حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر صاحب فرماتے ہیں:

* سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنے مقام کو پہچانیں، آپ کا مقام کیا ہے، یہ اتنا اونچا مقام ہے کہ جس کے مقابلے میں دنیا کے بڑے سے بڑے منصب ہیچ ہیں، اس سے بڑھ کر ایک عالم کی سعادت کیا ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں: العلماء ورثة الانبیاء.

* ہر مدرس اور مدرسہ کی کوشش یہ ہو کہ حتی الامکان اپنے اندر کمال پیدا کرے۔

* کمال پیدا کرنے کے لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ جو آپ کو کتاب ملی ہے اور جس فن کی ہے اس کا آپ خوب مطالعہ کریں، اس کے مطولات اور شروح بھی دیکھیں۔

* آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرام اور اپنے طلبہ پر جو اصحاب صفہ تھے نہایت ہی شفیق تھے۔

* تربیت کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ خود مجسم اخلاق بن جائیں۔

* عربی زبان ہو یا کوئی زبان بھی ہو؛ اس کے پڑھانے کے دو طریقے ہیں: ایک ہے

الطریقۃ المباشرۃ، ڈائرکٹ میتھڈ، اور دوسرا ہے طریقۃ الترجمہ، ٹرانسلیٹڈ میتھڈ، تو یہ دونوں طریقے آج بھی دنیا میں استعمال ہوتے ہیں۔ (رموز تدریس و تربیت: ۶۷)

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب لکھتے ہیں:

* ہم اپنے مدارس میں دین پڑھا تو رہے ہیں، سکھا نہیں رہے، یہ بہت اہم لمحہ فکریہ ہے۔ ہم دین پڑھا رہے ہیں، سکھا نہیں رہے، اور یہ بہت بڑا المیہ ہے۔

* دارالعلوم دیوبند دن میں درس گاہ ہوتا تھا اور رات کو خانقاہ بن جاتا تھا۔

* تعلیم انبیائے کرام علیہم السلام کی میراث ہے جو علماء کو ملی ہے، تربیت بھی میراث ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، تو ہمارا فرض منصبی جس طرح تعلیم ہے، اسی طرح تربیت بھی ہے۔

* تربیت تو عملی طور پر مشق کرانے سے ہوتی ہے، مشق کرنے سے ہوتی ہے۔

* علامہ اور مولانا بننے سے پہلے مولوی بننے کی کوشش کی جائے، اور اپنے طلبہ کو مولوی بنانے کی کوشش کی جائے۔ (رموز تدریس و تربیت: ۹۱)

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

* سب سے پہلی بات جو ہر مدرس اور ہر معلم کو ذہن میں رکھنی چاہئے وہ یہ کہ یہ طلبہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔

* دوسری بات یہ کہ یہ نعمت ایک امانت ہے استاذ کے پاس، اور اس امانت کا حق یہ ہے کہ جس کام کے لئے وہ آیا ہے اور جس کام کے لئے آپ اس کو پڑھانے بیٹھے ہیں، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾

اگر بالفرض اس امانت میں کوتاہی ہو تو اس کوتاہی کا مطلب یہ ہے کہ یہ خیانت ہے اس

طالب علم کے ساتھ بھی، اس کے والدین کے ساتھ بھی، اس کے سرپرستوں کے ساتھ بھی، مدرسہ کے ساتھ بھی، اور مدرسہ کے معاونین کے ساتھ بھی، جو چندہ دے کر یہ چاہتے ہیں کہ یہاں پر دین کی صحیح تعلیم ہو۔

* تیسری بات یہ کہ تعلیم کے دو معنیٰ ہوتے ہیں، ایک معنی تو یہ ہے کہ جو سبق ہمارے سپرد ہے وہ سبق پڑھا دیا جائے، اور دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ جو ہمارے پاس پڑھ رہا ہے اس کو اس علم پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے جو اس کو دیا جارہا ہے، اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ضروری ہیں، فرمایا:

العلم بلا عمل وبال، والعمل بغیر علم ضلال.

* مطالعہ اور تیاری میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو کس طرح میں آسان کر کے سمجھا سکتا ہوں، یعنی سمجھانے کا طریقہ بھی مطالعہ کے دوران سوچنا ہے۔

* میرے شیخ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ، ہم نے ان سے ابتدائی کتابوں سے پڑھا تھا، میزان اور نحو میر سے لے کر چوتھے درجہ تک ساری کتابیں تقریباً ان سے پڑھیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

میں اپنے مطالعہ میں بہت کافی وقت اس پر صرف کرتا ہوں کہ جو مضمون پڑھانے جارہا ہوں اس کو کس طرح آسان کر کے سمجھاؤں، باقاعدہ اہتمام کرتا ہوں، اس کو سوچنے کے لئے پورا وقت دیتا ہوں، بعض اوقات اس کا خاکہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کا خاکہ لکھ کر بورڈ پر سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے، تو یہ سوچ کر جاتا ہوں کہ بورڈ پر کس طرح سمجھاؤں۔

جب آدمی یہ سوچ کر جاتا ہے تو پھر دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بحث طلبہ کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔

* استاذ کا کام یہ ہے کہ علم ایک توصیح دے اور ایسے طریقے سے دے جو دل میں اتر جائے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: کلموا الناس علی قدر عقولھم.

* پھر علم کا جو دوسرا شعبہ ہے یعنی عمل، اس کی عملی تربیت طلبہ کو دینے کا اہتمام ہو، طلبہ کی زندگیوں میں مدرس داخل ہو، ان کے دکھ درد میں شریک ہو، یہ دیکھے کہ آیا اس علم کے اثرات ان کی زندگی کے اندر آرہے ہیں یا نہیں آرہے ہیں۔

* دارالعلوم دیوبند کو اور دارالعلوم دیوبند کا جو ہم پلہ ''مظاہر علوم'' تھا ان مدارس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو امتیاز بخشا وہ درحقیقت اس وجہ سے تھا کہ عمل کی تربیت تھی اور تربیت اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب اساتذہ خود عمل پیرا ہوں۔

* میرے شیخؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم سبق پڑھانے جاؤ تو راستے میں دعا مانگتے ہوئے جاؤ کہ یا اللہ! پڑھانے جا رہا ہوں، شرح صدر کے ساتھ پڑھانے کی توفیق عطا فرمایئے، اور طلبہ کو اس سے فائدہ پہنچا دیجئے، اور اس کو میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنا دیجئے، جتنا جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اتنا ہی اس کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا، اتنا ہی طلبہ کو فائدہ ہوگا۔ (رموز تدریس وتربیت: ۱۰۳)

حضرت مولانا عزیز الرحمان صاحب رقمطراز ہیں:

* تعلیم کا کام بڑا کام ہے یعنی معلم ہونے کی نسبت خود رب ذوالجلال نے اپنی طرف کی ہے۔

* ہر مدرسہ میں بیس، تیس، چالیس، پچاس، سو، دوسو، چارسو اساتذہ ہوتے ہیں؛ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہوگا کہ کبھی وہ اس غرض کے لئے باہمی مشاورت کرتے ہوں کہ ہم اپنے طرز عمل میں وہ کیا تبدیلی لاسکتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں ہماری اس محنت کے ثمرات اور اس کے

نتائج زیادہ واضح اور روشن طریقہ سے ہمارے سامنے آجائیں۔

* مقصد کا استحضار اور اپنے طرز عمل کا محاسبہ کرنا ہے۔

* اچھی تعلیم اور نتیجہ خیز تربیت کے لئے دل جمعی اور یکسوئی ناگزیر بنیاد ہے۔

* اچھے معلم، اچھی معلمہ، کامیاب مدرس، کامیاب مدرسہ کے لئے یکسوئی، مسئولیت کا احساس، لگن، شوق، جستجو کامیابی کی اساس ہے۔

* ایک استاذ کو اگر صرف کے بارے میں اتنا عبور حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی صیغے کی تحلیل کر سکے، تحلیل سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو ہیئت کذائیہ ہے اور اس کے جو حروف اصلیہ ہیں اور صحت وسقم کے اعتبار سے جو اس کی حالت ہے، اگر اس کو سمجھنے اور پہچاننے کی صلاحیت نہیں ہے تو ایسا مدرس سوائے طلبہ کو مشوش کرنے کے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا، نحو وصرف یہ دو چیزیں اگر طالب علم کی صحیح ہو جائیں تو آگے اس کے لئے راستہ کھل جاتا ہے۔

* اب استعداد کو بہتر بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ ایک تو بہتر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علمی کے دور سے اولیٰ سے پوری توجہ ہو استاذ کی بھی اور طالب علم کی بھی۔

* اگر قواعد رٹ لئے لیکن اجراء ممارست اور تمرین کا انداز نہیں ہے تو اس کا کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوگا۔

* درس گاہ میں جانے سے پہلے مضمون پر پوری طرح عبور حاصل ہو۔

* ایسے اسباب سے اپنے آپ کو نکالنا چاہئے جو یکسوئی اور دل جمعی میں مزاحم بنیں۔

* مضمون پر حاوی ہونا ضروری ہے۔

* یہ جو ناقص تیاری ہوتی ہے، اس کے بڑے منفی اثرات ہوتے ہیں، مضمون اچھا خاصا آسان ہوتا ہے؛ لیکن ناقص تیاری سے طالب علم کی نظر میں وہ پہاڑ بن جاتا ہے۔

* یکسوئی، دل جمعی، جستجو، طلب، لگن، احساس ذمہ داری ہی تمام اسباب کی ماں ہے، یہ سب اگراُجاگر ہوجائے تو حالات بدل جائیں گے۔

* علم کا معاملہ، تعلیم کا معاملہ، تربیت کا معاملہ، قوم کو بنانے کا معاملہ، مسلمانوں کی اولاد کو سنوارنے کا معاملہ، اوران کو دین وعمل سے آراستہ کرنے کا معاملہ بڑی اہمیت کا معاملہ ہے۔

* ہم اپنی دعاؤں میں اس بات کو بہت زیادہ نمایاں حیثیت دیں کہ جولوگ ہم سے استفادہ کررہے ہیں، وہ ہماری وجہ سے کسی ابتلاء کا شکار نہ ہوں اور ہمیں بہتر انداز میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق میسر ہو۔

جب ہم درسگاہ میں جائیں تو جوادعیہ ماثورہ ہیں، وہ پڑھتے ہوئے جائیں۔

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری، اللهم الطف بی فی تیسیر کل عسیر ، حسبنا الله ونعم الوکیل ، وغیرہ یہ دعائیں پڑھتے ہوئے جائیں، ان ادعیہ ماثورہ کے بڑے اثرات ہیں۔

* آپ جتنی بھی کوشش کریں، ساری ذمہ داری استاذ کی طرف آتی ہے، استاذ سے کتاب حل ہوتی ہے، استاذ سے مضمون ذہن نشیں ہوتا ہے، استاذ سے طالب علم، طالب علم بنتا ہے، استاذ سے طالب علم بااخلاق بنتا ہے، استاذ سے اچھا ماحول پروان چڑھتا ہے، استاذ سے مدرسہ کی علمی فضاء بنتی ہے، کوئی طالب علم خود فرشتہ بن کرنہیں آتا، وہ اپنے استاذ کی شخصیت میں فرشتہ دریافت کرکے، اس کو نمونۂ عمل بناتا ہے۔

* تدریس اورتربیت کا کام مکمل خوداعتمادی کے ساتھ ہونا چاہئے، یکسوئی ہونی چاہئے، فکرمندی ہونی چاہئے، یہ بات اگرآ گئی تو راستہ کھل جائے گا، اوراگراس میں کمی ہے تو بہتر نتائج کی توقع خوش فہمی کی بات ہوگی۔ (رموز تدریس وتربیت: ۱۲۳)

انتظامیہ کے لئے کچھ ضروری مشورے

استاذ محترم حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

(۱) جو بھی سال بھر میں دشواری نظر آئے اس کے ازالے کے لئے قانون اگلے سال کے داخلہ فارم میں تحریر کریں، اور داخل ہونے والے یا اس کے ولی کو اس کو پڑھنے کی ہدایت ہو اور اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کی شکل میں فیصلے وسزا پر عدم چارہ جوئی کے عہد کو مع حلف لکھوایا جائے۔

(۲) طلبہ کو کسی بھی صورت حال کے پیش آنے پر خود سے قانون ہاتھ میں لینے اور پولس سے چارہ جوئی کا حق نہ ہوگا، یہ فارم میں تحریر ہو، اور اس پر حلفاً دستخط ہو، ہر معاملہ کو طلبہ ذمہ دارانِ مدرسہ ہی کے ذریعہ حل کریں۔

(۳) ان جرائم کی فہرست بھی درج ہو جن پر سوائے اخراج کے دوسری سزا نہ ہو۔

(۴) بلا تصدیق نامہ کسی کا داخلہ نہ ہو؛ تاکہ مجرمین داخلہ نہ لے سکیں، اگر اخراج شدہ ہوں تو بلا کسی مضبوط عہد کے ہرگز داخل نہ کریں۔

(۵) کھیل میں صرف پی ٹی اور ڈرل ہو، والی بال، فٹ بلا وغیرہ بال میچ کھیلنے کی اجازت ہو۔

(۶) طلبہ کو اپنی علاقہ یا صوبہ وار انجمن قائم نہ کرنے دی جائے؛ بلکہ ان کے تحت ہونے والے امور کسی ایک یا دو اساتذہ کی نگرانی میں ہوں۔

(۷) علاقائیت اور عصبیت پر کڑی نظر رکھی جائے، جو یہ بو پھیلائے اس کا اخراج کر دیا جائے، انتظامی امور اور نگرانی میں طلبہ کی ڈیوٹی (DUTY) نہ لگائی جائے، اس سے

آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے۔

(۸) مدرسہ کے تمام طلبہ کا ایک ہی یونیفارم ہو سب کو اس کی پابندی ضروری ہے۔

(۹) ان اساتذہ کو قطعاً برداشت نہ کیا جائے جو طلبہ میں گروہ بندی پیدا کریں، اور جو انتظام کی خامیوں کو طلبہ میں بیان کریں۔

(۱۰) بڑے طلبہ چھوٹے طلبہ سے دوستی نہ رکھیں اور نہ بڑے چھوٹوں کے ساتھ کمروں میں رہیں اور نہ ساتھ سفر کریں۔

(۱۱) ایک علاقہ کے طلبہ ایک ہی کمرے میں نہ رکھے جائیں؛ بلکہ ہر کمرے میں مختلف علاقوں کے طلبہ رکھے جائیں۔

(۱۲) انتظامیہ بعض طلبہ کو اپنا مقرب اور جاسوس نہ بنائے، ورنہ جھوٹی شکایات کی جائیں گی اور طلبہ ان سے نفرت کریں گے۔

(۱۳) طلبہ میں اگر عصبیت یا فساد کے جذبات پنپ رہے ہوں تو ثقہ طلبہ کے ذریعہ اس کی معلومات رکھیں، اور شروع ہی سے اس کا سد باب کریں، اصلاحی تقریروں کے بجائے اصلاحی مجالس اساتذہ کے یہاں ہوا کریں، جن میں اخلاق اور حسن معاشرت پر زور دیا جائے۔

(۱۴) انتظامیہ کچے کانوں کی نہ بنے، بلا تحقیق کسی کی شکایت پر کارروائی نہ کرے، اساتذہ طلبہ کی معقول شکایتوں کو فوراً سنیں، اور ان کی جائز اور معقول ضروریات کا نظم جلد کریں، یا پورا کرنے کا سچا وعدہ کیا کریں۔

(۱۵) نیک اور صالح طلبہ کو وظائف اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ علیحدہ سے دینا چاہئے۔

(۱۶) مہتمم طلبہ سے واقف رہیں، غیر مانوس نہ رہیں، ہر جماعت کا وقتاً فوقتاً امتحان

لے کران کے ساتھ کبھی کبھی بیٹھ کران کی جائز شکایات معلوم کرتے رہیں، مہتمم کی طلبہ سے دوری، ان کو دوسروں کے سپرد کر کے ہی فتنے پھیلتے ہیں۔

(۱۷) مہتمم یا مدرس کسی کو بہت خاص بھی نہ بنائے؛ بلکہ سبھی سے تعلق رکھے۔

(۱۸) کوئی نوجوان استاذ چھوٹے بچوں سے جسمانی خدمت نہ لے، کپڑے بھی نہ دھلوائے، سفر میں کم عمر کو ساتھ نہ رکھے، انتظامیہ اس کی نگرانی رکھے۔

(۱۹) ہر استاذ کو اسی فن کے اسباق دیں جس فن سے اس کو دلچسپی اور مہارت ہو۔

(۲۰) درجہ تین تک نحو وصرف پڑھائیں، فلسفۂ نحو وصرف نہ پڑھائیں۔

(۲۱) اساتذہ تدریس کے علاوہ اپنے مشاغل اور اسفار کم کریں۔

(۲۲) اساتذہ اسباق میں تقریر مختصر کریں، تب ہی تعلیم میں پختگی پیدا ہو سکے گی۔

(۲۳) جو طلبہ فارسی پڑھے ہوئے نہ ہوں ان کو فارسی میں نحو وصرف کی کتب پڑھانے کے بجائے تسہیل الصرف اور تسہیل النحو پڑھائیں۔

(۲۴) اساتذہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر انٹرویو لے کر کریں، تدریس کا تجربہ رکھنے والے ماہر اساتذہ رکھے جائیں، چاہے مشاہرہ زیادہ دینا پڑے۔

(۲۵) مدرسین کے ساتھ معاملات صاف ہوں، مکان، کھانا، تعطیلات، رخصت بلا تنخواہ، مع تنخواہ، امتحانات کی ذمہ داریاں، خارجی یا داخلی ہنگامی کام کی نگرانی سے متعلق ہر بات لکھ کر دی جائے، تقرر عارضی کتنا، استقلال کتنی مدت کے بعد، اضافۂ تنخواہ کی شرح وغیرہ تمام امور لکھ کر دیئے جائیں، نیز کن صورتوں میں تنخواہ کاٹ لی جائے گی وغیرہ۔

(۲۶) فارم پر دستخط لے لئے جائیں۔

(۲۷) شروع میں ایک فارم بھروالیں، ہر مدرس کی ایک فائل ہو، جس میں مدرس

سے متعلق تمام معاملات ہوں، وہ آپ کے یہاں کب آئے؟ پہلے کہاں کہاں رہے؟ کس فن سے دلچسپی رہی؟ نام اور پورا پتہ اور ان کی ملازمت میں جو کام ان سے متعلق رہے وہ سب ریکارڈ ہوں، اس عرصہ میں ان کو جو ہدایات نامے دیئے گئے ہوں، جو بھی ان کی شکایات، رخصتیں وغیرہ وہ بھی درج کریں، ہر سال ان کی کتابوں کا نتیجہ کتنے فیصد رہا وہ بھی ہو، تنخواہوں کے اضافہ وغیرہ کے سلسلہ میں تمام معلومات؛ تاکہ ان کے بارے میں فیصلہ کرنے میں دقت نہ ہو۔

(۲۸) اسی طرح تمام طلبہ کی الگ الگ فائلیں ہوں جن میں ان کا سالانہ ریکارڈ رخصتیں، درخواست، شکایات، اخراج، داخلہ، بیماری، اس سے اخراج وغیرہ میں سہولت رہتی ہے کہ کن جرائم کی وجہ سے اخراج عمل میں آیا۔

(۲۹) مدرسہ میں ایک سجھاؤ فائل ہو، کوئی مدرس اگر تحریراً کوئی مشورہ دے تو وہ اس میں محفوظ رہے۔

(۳۰) طلبہ کے لئے بھی ایک سجھاؤ فائل ہو، مہمانوں کی بھی ایک سجھاؤ فائل ہو، فارغ ہوکر جانے والے بھی اپنے مشورے لکھیں، ان کی بھی ایک فائل ہو اور کسی وقت ان سب پر غور بھی کریں۔

(۳۱) چالیس چالیس طلبہ کی نگرانی ایک ایک استاذ سے منسلک کی جائے، ان کی رخصتیں اور شکایات وہ استاذ سنے اور اپنے سے متعلق طلبہ کے کمرہ نمبر معلوم رکھے اور کبھی کبھی بطور نگرانی ان کی دیکھ ریکھ رکھے؛ بلکہ ان کی فریاد بھی سن کر فیصلہ دے، ان کے نام ان کے پاس رہیں، وہ ایک اتالیق ہو۔ (مدارس دینیہ کے لئے رہنما اصول: ص: ۲۲-۲۵)

ضابطۂ اخلاق برائے اساتذۂ مدارس اسلامیہ

از: حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحبؒ

[۱] مسلک اہل سنت والجماعت پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

[۲] مدرسہ کے وفادار ہوں، اور اسکی ہمہ جہتی ترقی کے لئے کوشاں ہوں۔

[۳] انتظامیہ کی ہدایت پر عمل کرنے والے ہوں۔

[۴] طلبہ پر اپنی اولاد کی طرح مشفق اور مہربان ہوں، ان کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کی طرح ان کی اخلاقی تربیت وعملی حالت کو درست کرنا بھی انتظامیہ کی طرح اپنی ذمہ داری سمجھیں۔

[۵] دفتر کی کسی ہدایت پر اعتراض ہوتو اس کو طلبہ میں یا کسی دوسرے کے سامنے اس پر تبصرہ کرنے سے پرہیز کریں، براہ راست انتظامیہ سے مل کر اس بارے میں اپنی رائے پیش کریں۔

[٦] انتظامیہ کو اپنے سے زیادہ مدرسے کا اور طلبہ کا خیر خواہ سمجھیں۔

[۷] اپنے کو مدرسہ کا ملازم نہ جانیں؛ بلکہ خادم جانیں۔

[۸] تعلیمی اور تدریسی خدمات کی طرف ہی متوجہ رہیں، کوئی اور پیشہ یا مشغلہ اختیار نہ کریں۔

[۹] مدرسہ کے مقاصد کو اور مفاد کو نقصان پہنچانے والی کسی تحریک اور رائے زنی سے مکمل پرہیز کریں، دوران درس سبق کے علاوہ دوسرے موضوع پر کلام کرنے سے پرہیز کریں۔

[۱۰] پڑھائی کے اوقات کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی اگر کوئی طالب علم آپ سے علمی استفادہ کرنا چاہے تو افادہ سے دریغ نہ کریں؛ بلکہ اس کو اپنی سعادت سمجھیں۔

[۱۱] نوجوان اساتذہ طلبہ سے اپنی جسمانی خدمات لینے سے حتی الوسع پرہیز کریں۔

[۱۲] تعلیمی اوقات میں طلبہ کو اپنے یا کسی دوسرے شخص کے کام کے لئے جانے سے روکیں۔

[۱۳] اگر کسی سفر یا بیماری یا ضرورت کی وجہ سے غیر حاضر ہوں تو جانے سے پہلے تحریری طور پر مدرسہ کو اطلاع کریں اور رخصت منظور ہونے کے بعد جائیں، اگر ایک یا دو گھنٹہ کے لئے کہیں جانے کی ضرورت پیش آئے تو انتظامیہ کو اطلاع کر کے جائیں۔

[۱۴] گفتگو کے درمیان طالب علم اگر کوئی غلط لفظ استعمال کر رہا ہے تو اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔

[۱۵] دورانِ درس یا نجی مجالس میں کسی استاذ پر تنقید یا تنقیص نہ کی جائے اس سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے؛ کیونکہ بعض طلبہ میں چغلی کی بھی عادت ہوتی ہے۔

[۱۶] اگر طالب علم کسی استاذ کی برائی بیان کرے تو فوراً منع کرنا چاہئے۔

[۱۷] طلبہ کو اپنا جاسوس بنا کر نہ رکھیں۔

[۱۸] اگر کوئی طلب علم کسی استاذ کا خادم ہے یا اس سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو اپنا دشمن نہ سمجھیں نہ اس کو چغل خور جانیں۔

[۱۹] نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی پوری کوشش کی جائے؛ بلکہ صفِ اول میں پڑھیں، اس سے طلبہ کو خود بخود نماز کی پابندی کا حوصلہ ملے گا۔

[۲۰] مدرسہ کے ملازمین کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آئیں۔

[۲۱] مدرسہ کی اشیاء کو بلا اجازت استعمال نہ کریں، اور نہ گھر لے جائیں، اپنے بہت چھوٹے بچوں کو درجہ یا مدرسہ میں تعلیم ونگرانی کے اوقات میں بلا وجہ نہ لائیں؛ وہ شور کرتے ہیں جس کی وجہ سے تعلیم میں حرج ہوتا ہے یا طلبہ ان کو کھلانے میں لگ جاتے ہیں، بعض دفعہ وہ گندگی پھیلاتے ہیں۔

[۲۲] دورانِ درس یا درس روک کر اپنے مہمان یا ذاتی کام میں مشغولیت اختیار نہ کرے کہ تعلیم کا حرج ہو۔

[۲۳] طلبہ کے ساتھ باوقار رہیں، حد سے زیادہ بے تکلفی یا ہنسی مذاق درست نہیں۔

[۲۴] بلا مطالعہ ہرگز نہ پڑھائیں۔

[۲۵] طلبہ میں مطالعہ اور تکرار کا ذوق پیدا کریں۔

[۲۶] ابتدائی درجات میں روزانہ پہلے پچھلا سبق سنیں، اس کے بعد آگے پڑھائیں۔

[۲۷] تأدیب شرعی حدود میں ہو۔

[۲۸] رٹانے سے زیادہ سمجھنے پر زور دیں، خصوصاً نحو، اجراءِ نحو اور ادب میں۔

[۲۹] اساتذہ پڑھاتے وقت تختۂ سیاہ کا استعمال کریں، طلبہ کو لکھنے کا عادی بنائیں۔

[۳۰] طلبہ کے ساتھ ان کی نالائقی پر انتقامی سلوک نہ کریں، درگزر سے کام لیں۔

[۳۱] طلبہ کے سامنے اساتذہ اپنی غربت اور خانگی پریشانیوں کا ہرگز تذکرہ نہ کریں۔

[۳۲] ایک اچھے استاذ کی تعریف یہ ہے کہ اس کو جس فن میں مہارت ہو اس کو اپنے شاگردوں میں پیدا کرنے کی پوری کوشش کرے، ان کو اپنے جیسا بنائے۔

[۳۳] استاذ صرف درسگاہ میں طلبہ کے لئے نمونہ (آئیڈیل) نہ بنے؛ بلکہ درس گاہ

سے باہر، ہر جگہ وہ ایک استاذ اور قابل تقلید اعمال کا حامل ہو۔

[۳۴] اپنی وسعت کے مطابق غریب، نادار اور یتیم طلبہ کی حتی الامکان اپنے ذاتی پیسے سے بھی مدد کریں، اس کی بڑی برکت دیکھیں گے، خود نہ کرسکیں تو اپنے باوسعت عزیزوں سے مدد کرادیں۔

[۳۵] اگر کسی طالب علم کو برا بھلا کہہ دیا ہو تو بعد میں اس کی دلداری ضرور کرلیں، اگر غیر شرعی زیادتی ہوگئی ہو تو اس کی معافی چاہ لیں۔

[۳۶] اپنے گھر کی خفگی اور غصہ طلبہ پر نہ نکالیں، تادیب کو تعذیب نہ بنائیں۔

[۳۷] درس گاہ میں اخبار ورسائل نہ دیکھیں، سبق پڑھائیں یا سبق سنیں یا نصیحت کریں۔

[۳۸] تکرار کرانے کے لئے جماعت میں سے ہوشیار طلبہ کو مقرر کریں اور کبھی کبھی معلومات بھی کرلیا کریں۔

[۳۹] کسی شیخ طریقت سے اپنا اصلاحی تعلق ضرور رکھیں اور ان کے بتلائے ہوئے معمولات کو پابندی سے ادا کرتے رہیں۔

[۴۰] اسباق کی پابندی اور محنت ولگن ایک استاذ کو طلبہ اور انتظامیہ کے نزدیک محبوب بنادیتے ہیں۔

[۴۱] خودستائی اور دوسروں کی تحقیر وتنقیص سے پرہیز کریں۔

[۴۲] صاف ستھرے رہیں، لالچ، حرص اور اشراف سے بچیں۔

[۴۳] اتنا سمجھ لیں کہ طلبہ چاہے کتاب نہ سمجھیں؛ مگر استاذ کو ضرور سمجھتے ہیں۔

[۴۴] اساتذہ گالی سے خطاب نہ کریں، طالب علم کے سامنے علمی زبان استعمال

کریں ، بازاری زبان نہ بولیں ،وقار سے رہیں،بے جاہنسی مذاق نہ کیا کریں،اساتذہ تنبا کو، بیڑی،سگریٹ نہ پئیں اور طلبہ کو بھی منع کریں۔

[۴۵] درس گاہ میں پیر پھیلا کر یا بہت زیادہ ٹیڑھے ہوکر لیٹنے کے انداز میں نہ بیٹھیں اور کبھی مجبوری میں ایسی ہیئت کر بھی رکھی ہوتو کسی مہمان یا اپنے استاذ یا مدرسہ کے ذمہ دار، مہتمم،ناظم یا ارکان کمیٹی کے گزرتے وقت اٹھ کر سیدھے بیٹھ جائیں،اس کو مرعوبیت یا خوف یا اپنی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

[۴۶] مدرسہ کو نقصان پہنچانے والی تحریک یا کسی مہم یا کسی شخص کے مدرسہ پر تبصرہ یا کسی غلط اقدام کی آپ کو کسی ذریعہ سے اطلاع ملے تو مدرسہ کے ذمہ داروں کو اس کی اطلاع کردیں اور ذمہ داروں سے کہہ دیں کہ وہ آپ کے حوالہ کے بغیر اس کی تحقیق اور تدارک کریں۔

[۴۷] ارباب نظم ونسق کسی معاملہ میں آپ سے آپ کے اسباق یا نصاب کی تکمیل یا طلبہ کی تعلیمی رفتار کے بارے میں تحریراً یا بالمشافہ دریافت کریں تو اس کو انکوائیری پر محمول نہ کریں؛ بلکہ ان کی فرض منصبی سمجھ کر اس کا معقول جواب دیں۔

[۴۸] اگر کسی استاذ کا انتظامیہ سے اختلاف ہوجائے تو دوسرے اساتذہ گروپ بنا کر شرکت یا ٹکراؤ کا اقدام نہ کریں۔

[۴۹] اگر تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں دفتر اہتمام جانے کی ضرورت پیش آئے تو وہاں بار بار کی حاضری کو چاپلوسی پر محمول کرنے کے خطرہ سے ترک نہ کریں۔

[۵۰] درس گاہ میں تعلیم کے اوقات کے دوران کھانے پینے اور پارٹی سے گریز کریں، اگر کوئی خاص مہمان آجائے تو ان کو بھی درس گاہ کے بجائے دارالاساتذہ میں بٹھا کر کھلا پلا دیں۔

[۵۱] درجہ میں تمام طلبہ کے سامنے کسی کو حد سے زیادہ مارنا یا بہت زیادہ ذلیل کن کلمات بولنا یا گالی دینا یا طعن کرنا تعلیمی آداب کے خلاف ہے، طلبہ کی نفسیات اور عزت نفس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

[۵۲] تدریس کے طریقہ میں یہ بھی شامل ہے کہ ہر کتاب اور ہر جماعت کے طلبہ کی عمروں اور علمی سطح کو سامنے رکھ کر پڑھایا جاوے۔

[۵۳] درس گاہ میں طلبہ کی نشست اس طرح رہے کہ تمام طلبہ کی براہ راست نگرانی کی جاسکے، پیچھے بٹھانے کے بجائے چاروں طرف کی نشست پُر کرلی جاوے، خاص کر کے بڑے درجات کے طلبہ پیچھے بیٹھ کر کھیلتے رہتے ہیں، ان کی نگرانی کی جاوے۔

[۵۴] اپنی آواز اتنی بلند نہ ہو کہ دوسرے اساتذہ کو پڑھانے میں تکلیف ہو، اور اتنی پست بھی نہ ہو کہ طلبہ کو بھی سبق نہ سنائی دے اس سے مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔

(مدارس دینیہ کے لئے رہنما اصول، ص:۲۶، مع حذف واضافہ)

عصری علوم سے مراد:

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) علوم اصلیہ: جن کی اصل ضرورت ہے۔

(۲) علومِ آلیہ: جن کی ضرورت پہلی قسم کے علوم کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔

چنانچہ بلاغت وبیان اور بڑی حد تک علوم رجال اور علوم روایت، منطق وعقلیات وغیرہ وغیرہ ان کو علومِ آلیہ کی حیثیت دی گئی۔ علومِ آلیہ دراصل اُن علوم کے خادم تھے، جو حقیقت میں حاصل کرنا مقصود تھے، مقصود یہ ہے کہ قرآن پاک میں گہری بصیرت حاصل کی

جائے، علوم تفسیر، علوم قرآن پر مجتہدانہ نظر رکھنے والے علماء اور مفسرین پیدا کیے جائیں، لیکن چونکہ اس کے لیے بلاغت سے واقفیت بھی درکار ہے، لغت اور زبان سے واقفیت بھی درکار ہے اور بہت سے علوم وفنون سے واقفیت درکار ہے، اس لئے طالب علم اور عالم کی تیاری کے لئے ان علوم سے واقفیت ناگزیر سمجھی گئی ہے، علم حدیث میں ماہرانہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے بہت سے ابتدائی علوم کی ضرورت ہے، جغرافیہ کی بھی ضرورت ہے، تاریخ کی بھی ضرورت ہے، علم رجال کی بھی ضرورت ہے، تذکرہ وسوانح کی بھی ضرورت ہے، یہ فی نفسہٖ مقصود نہیں تھے، لیکن علمِ حدیث کے حصول کے لئے ان کو حاصل ناگزیر سمجھا گیا تو گویا دینی علوم سے مراد یا دینی تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے جس کا مقصد ان علوم وفنون کے متخصصین، متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے، اس لئے کہ جب تک ایسے علمائے محققین، متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے حضرات موجود نہ ہوں، اُس وقت تک امت مسلمہ کی رہ نمائی نہیں ہوسکتی۔

دوسری صدی ہجری میں جب امتِ مسلمہ میں غیر معمولی توسیع پیدا ہوئی اور اُس وقت کی معلوم دنیا کے تین بڑا عظموں تک امتِ مسلمہ پہنچ گئی تو نئے نئے مسائل کا سامانا کرنا پڑا، رومن لا (Roman Law) سے واسطہ پیش آیا، ایرانی تصورات سے واسطہ پیش آیا، ہندوستانی تصورات سے، بدھ ازم سے، عیسائیت، یہودیت سے واسطہ پیش آیا، ان میں سے ہر ایک کی طرف سے اعتراضات اسلام پر وارد ہوئے، اس کا اتنا پُختہ جواب مفکرین اسلام اور فقہاء و متکلمین اور علمائے اُصول نے دے دیا کہ ایک ہزار برس تک اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی، بنیاد اُن کے پاس موجود تھی جو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے اُن کو ملی تھی، لیکن اس بنیاد یا اس ذخیرے کی جو فارمولیشن تھی، یعنی جس طرح سے انھوں نے اس کو تعبیر کیا اور بیان کیا اُس

میں عقلی استدلال بھی تھا، اس میں یونانیوں کے اعتراضات کا جواب بھی تھا، ایرانیوں کے تصورات کا جواب بھی تھا، ہندوستانی ویدازم کا جواب بھی تھا، مصر کے نوافلاطونی فلسفیوں کا جواب بھی تھا، اور یہ جو پیکیج ہم کہہ سکتے ہیں، یہ جو مجموعۂ علوم یا مجموعۂ ثقافت تھا اُس میں ان تمام مسائل کا مؤثر جواب موجود تھا، جس کے نتیجے میں علمی ،فکری اور تہذیبی سطح پر کسی کو مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا ہونے کا یارانہ رہا، یہ صورتِ حال ہزار برس تک جاری رہی۔

جس دور میں یہ پوری صورت حال جاری تھی اس دور میں بھی جو عصری علوم تھے، ان سے مسلمانوں نے ہمیشہ اعتناء کیا، حال آں کہ وہ امت مسلمہ کا دورِ عروج تھا، امت مسلمہ سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کی ،آج کل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ یونی پولر (uni-polar) (یک قطبی) دنیا ان کے کنٹرول میں تھی، یک قطبی دنیا پر ان کا کنٹرول تھا اور کوئی قوت مسلمانوں کے خلاف آواز اٹھانے والی نہیں تھی، اور جس نے آواز اٹھائی وہ کامیاب نہیں رہا، وہ ناکام ہوا، اس لئے مسلمانوں کو کسی تہذیب یا کسی فکر یا ثقافت سے کوئی خطرہ نہیں تھا، انہیں کوئی سیاسی تہذیبی چیلنج درپیش تھا کہ کوئی تہذیب اٹھے گی اور اسلامی تہذیب کو مٹادے گی، ایسا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

بعض حضرات ،بعض علمائے کرام جب اس پر تامل کا اظہار کرتے ہیں تو اُن کا تامل بالکل بجا ہوتا ہے، ان کا تامل اس لئے ہوتا ہے کہ بعض لوگ اسلامی علوم کو خادم اور عصری علوم کو مخدوم بنا کے ایک جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں، یہ اسلامی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اسلامی تاریخ میں کسی بھی عصری علم یا عصری فن سے جب استفادہ کیا گیا تو اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے خادم کے طور پر اس سے کام لیا گیا اور اس خادم نے اسلامی علوم کو مخدوم بنا کر اُن کی خدمت کی یہ آپ کو علمِ طب میں بھی نظر آئے گا، تفسیر میں بھی، حدیث میں بھی، فقہ میں

بھی، اُصول فقہ میں بھی، کلام میں بھی، حتی کہ تصوف میں بھی، تصوف جیسے فن کی کتابیں جو خالص روحانیات کا میدان ہے اُس کو بھی اتنے مضبوط عقلی استدلال سے بیان گیا گیا ہے۔

عصری علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک محدث کو حدیث کی درس گاہ سے اٹھا کے انجینئر بنا دیا جائے، ایک فقیہ کو دارالافتاء سے اٹھا کر کہا جائے کہ تم میڈیکل ڈاکٹر ہوجاؤ، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو غلط سمجھتا ہے، محدث کو محدث ہی رہنا چاہیئے، لیکن محدث ایسا ہو جو علم حدیث پر ماہرانہ، مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو، اپنے وقت کا انورشاہ کشمیری ہو، اس طرح کا محدث ہو لیکن علم حدیث پر جو آج اعتراضات کیے جارہے ہیں، آج کا تعلیم یافتہ آدمی جن اسباب سے علم حدیث کے بعض پہلوؤں پر شبہات رکھتا ہے؛ ان کو وہ سمجھتا بھی ہو اور ان کا جواب دینے اور اعتراض کرنے والوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، ان شبہات کو سمجھنے کے لئے بعض چیزوں کا جاننا ضروری ہے، اگر وہ شبہات نہیں جانتا، اگر وہ ان اعتراضات کے منشا سے واقف نہیں ہے کہ وہ اعتراضات کیوں پیدا ہوئے ہیں، تو پھر وہ ان کا جواب نہیں دے سکتا۔

میں پوری دنیا میں جاتا رہتا ہوں، مختلف ملکوں میں جانے کا پچھلے تیس سال سے موقع ملتا رہتا ہے، میرا تجربہ یہ ہے کہ انتہائے مشرق میں جہاں دن میں پہلی مرتبہ سورج طلوع ہوتا ہے، جزائر فیجی وہاں کا ایک عام تعلیم یافتہ شخص اور امریکہ کی انتہائی مغربی ریاست سان فرانسسکو کا ایک عام تعلیم یافتہ شخص اسلام پر ایک ہی طرح کے اعتراضات کرتا ہے، پیرس میں جائیں اور کسی سے اسلام پر بات کریں تو وہ بھی وہی اعتراض کرے گا، ساؤتھ افریقہ میں جائیں تو وہ بھی وہی اعتراض کرے گا۔ پاکستان میں کسی بڑے جدید تعلیمی ادارے میں جائیں، لمز (LUMS-Lahore University of Management Sciences)

چلے جائیں تو وہاں بھی اس طرح کے سوالات کیے جائیں گے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے سوالات اور ایک ہی طرح کے اعتراضات اور ایک طرح کے شبہات پوری دنیا میں کیوں پیدا ہورہے ہیں؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ تہذیب اور وہ فکری استیلاء جو مغرب سے آیا ہے، اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس استیلاء کی وجہ سے وہ شبہات پیدا ہورہے ہیں جو ہر انسان کے دل میں پیدا ہورہے ہیں، اب آپ یہاں بیٹھ کر فتوی جاری کردیں کہ فلاں چیز گمراہی ہے تو جو لوگ پہلے سے گمراہی سمجھتے ہیں وہ مزید یقین سے گمراہی نہیں سمجھنے لگیں گے، لیکن جو اسے گمراہی نہیں سمجھتے؛ وہ آپ کے فتوی سے اسے گمراہی نہیں سمجھنے لگیں گے، وہ اس پر بہ دستور قائم رہیں گے، جیسا کہ میں سیکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں کہ لوگ قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں، اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ اس دور کے مُحاورے کو سمجھنے کے لئے ہمیں بھرپور محنت اور تیاری کی ضرورت ہے، میں امام ابو یوسفؒ کا یہ جملہ کئی مرتبہ دہرا چکا ہوں:

من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل.

جو اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے۔

یعنی اُس کا علم قابل اعتبار نہیں، لہذا جس زمانے کے ماحول میں آپ دین کی تعلیم دے رہے ہیں، اس ماحول کی زبان جاننا ہماری ضرورت ہے، قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (سورۂ ابراہیم: ۴)

اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم ہی کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا، تا کہ وہ ان کے لئے کھول کر بیان کرسکیں۔

لسانِ قوم میں صرف اُردو یا پنجابی یا انگریزی شامل نہیں ہے، لسان میں وہ پورا تہذیبی

پس منظر بھی شامل ہے جو اُس زبان میں شامل ہوتا ہے، زبان محض کوئی ڈھیکل نہیں ہے، خیالات کے انتقال کا یا بیان کرنے کا محض کوئی وسیلہ نہیں ہے، ہر لفظ کے پیچھے پوری تاریخ، پوری تہذیب اور پوری فکر ہوتی ہے، وہ فکر اور تہذیب خود بخود اس لفظ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

(محاضراتِ تعلیم:۱۲۱)

مغربی افکار کی بنیاد- علاج

اجتماعی اور انسانی علوم کی سطح پر دیکھیے تو قدیم تعلیمی روایت کی سپر اندازی اور جدید مغربی تصورات کی اثر انگیزی کی رفتار اور بھی زیادہ حیرت انگیز نظر آتی ہے، آج اجتماعی اور انسانی علوم کی اصطلاح کا مطلب ہی مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کا تصور ہے۔ آج یہ بات بیش تر تعلیم یافتہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوچکی ہے کہ اجتماعی اور انسانی علوم میں مسلمانوں کی شاندار روایات کیا ہیں؟ تاریخ کا اسلامی تصور، اجتماعی اخلاقیات کی بابت قرآنی اصول وہدایات، قوموں کے عروج وزوال کے الٰہی احکام، منطق استقرائی، علم حضوری بہ مقابلہ علم حصولی اور اس طرح کے دوسرے بہت سے میدانوں میں اسلامی تعلیم اور مسلم اہل دانش کی کاوشوں سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک ناآشنا ہے، مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو نظر انداز کر کے وہاں کے سیکولر اور مادہ پرستانہ اجتماعی اور انسانی علوم کو جوں کا توں بغیر کسی تنقیدی رویے کے دل وجان سے اپنا لینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کے بیش تر تعلیم یافتہ حضرات فکری لحاظ سے سیکولر اور طرز عمل کے اعتبار سے غیر شعوری طور پر مادہ پرست بن چکے ہیں، زبانی اعلانات اور جذباتی اظہار کی حد تک اسلام سے وابستگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی جارہی ہے، اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل سے مغربی افکار ونظریات کی بنیاد دو چیزوں پر رہی ہے:

(۱) سیکولر اور لادینیت، یعنی مذہب اور اجتماعی زندگی کی علیحدگی کا تصور۔

(۲) نظریۂ ارتقا، جس کی ڈارونی تفصیلات نے اخلاق و مذہب کی رہی سہی بنیاد کو بھی ڈھا دیا۔

ان دونوں بنیادوں نے مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کے مزاج اور انداز کو بدل کر رکھ دیا ہے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں تعلیم کا سارا تصور، علوم کا سارا دھارا اور افکار و نظریات کا پورا مزاج سیکولر اور لامذہبی ہو کر رہ گیا ہے، نہ صرف مغربی ممالک میں، بلکہ بیش تر مشرقی ممالک میں (چند ایک کے جزوی استثناء کے ساتھ) نظام تعلیم کا اصل وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ مغرب کی فکری بالادستی، تہذیبی امامت اور سیاسی و اقتصادی بالادستی کے تسلسل اور بقاء کے لیے کام کرتی رہیں، وہ تہذیبی امامت، جو مغرب نے گزشتہ دو سو سالہ استعماری دور میں قائم کی ہے۔

مغرب کی مادہ پرستانہ معاشیات کے فروغ اور انسان پر سرمائے کی فوقیت نے جو بے شمار منفی نتائج پیدا کیے ہیں ان میں سے چند یہ ہے:

(۱) سود کی لعنت۔

(۲) ارتکاز دولت۔

(۳) معاشرے کی طبقات میں تقسیم۔

(۴) معاشرے کے ناداروں اور حاجت مندوں، قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مستضعفین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ۔

(۵) دولت کے اجارہ داروں اور قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مترفین کی تعداد، قوت اور اثر و رسوخ میں اضافہ۔

(۶) کمزور اور زیر دست اقوام کا دست یاب ذرائع پیداوار کا نامکمل اور ناکافی استعمال۔

(۷) بالا دست اور بااثر اقوام کو دست یاب دولت اور ذرائع پیداوار کا مزید دولت اور مزید ذرائع پیداوار کے حصول کے لیے استعمال۔

(۸) معاشرے کی خالص اخلاقی، روحانی، فکری، تمدنی اور تہذیبی ضروریات کے لیے وسائل کا کم سے کم استعمال اور ان مقاصد کے لیے پہلے سے موجود سرمائے کی حتی الامکان واپسی اور بازخواست۔

(۹) اس آخری نتیجے کا مزید نتیجہ یہ نکلا کہ اب تعلیم اور صحت، دونوں کو تجارت بنا دیا گیا ہے، اب معاشرے کی یہ دونوں بنیادی ضروریات - جو اسلامی تعلیم کی رو سے فرض عین اور فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہیں - صرف کاروبار اور تجارت کا موضوع بن گئی ہیں، جس طرح ماضی میں لوگ تجارت میں سرمایہ کاری کیا کرتے تھے اور نفع کے امیدوار رہتے تھے، اسی طرح آج تعلیم اور صحت کے میدانوں میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے، اور نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ کاروبار کرنے والے کروڑوں، بلکہ اربوں کے مالک بن جاتے ہیں، اب یہ وبا مسلم معاشروں میں بھی پھیلتی جا رہی ہے، جہاں ایک زمانے میں تعلیم اور صحت کی فیس یا معاوضہ لینا ایک گھناؤنا انسانی جرم سمجھا جاتا تھا۔

مغربی فکر اکبر الٰہ بادی کی نظر میں:

اکبر الٰہ آبادی کو بڑی شدت سے اس امر کا احساس تھا اور وہ زندگی بھر اس کا اظہار بھی کرتے رہے کہ جدید مغربی تعلیم اپنے مزاج اور اٹھان کے اعتبار سے لادینی اور لامذہبی ہے، انہوں نے جابجا اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اس تعلیم کے نتیجے میں جو نسل تیار ہوگی، وہ لامذہب اور اسلامی عقائد سے بے بہرہ ہوگی، وہ بار بار اپنے قارئین کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ

جدید تعلیم کے مذہب شکن نتائج سے ہوشیار رہیں۔ایک جگہ فرماتے ہیں:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی زوائد پر = گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ان کو اس بات کا دکھ تھا کہ علماء اور دینی طبقوں کی صف اول کے لوگ اپنی روایات چھوڑ کر مغربی ثقافت اور تمدن کے علم بردار بنتے جارہے ہیں، کہتے ہیں:

فکر دنیا نے بھلایا سب وہ قرآن وحدیث = مولوی بھی محو قانون و نظائر ہو گیا

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ مغربی نظام تعلیم محض چند نئے علوم وفنون کی تدریس کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل بالذات ثقافت کا نقیب،ایک نئی تہذیب کا منادی اور ایک نئے تمدن کا علم بردار ہے،ان کو اس امر کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ جیسے جیسے مغربی تعلیم کے نتائج سامنے آتے جائیں گے ،مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی زندگی کے اجزاء ان کے اپنے ہاتھ سے نکلتے جائیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں:

علوم ان کے ،زبان ان کی، پریس ان کے، لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزاء پر ہیں ہات ان کے

ستم بالائے ستم یہ کہ اس ساری نیاز مندی،اس مکمل خود سپردگی اور اس کامل سپر اندازی کے باوجود اہل مغرب نے اپنے علوم وفنون ،جن پر ان کی ترقی کا دارومدار تھا،یعنی سائنس کے اعلیٰ مضامین اور ٹیکنالوجی کے اونچے فنون ،اپنے تک ہی محدود رکھے اور اہل مشرق کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی، اہل مشرق کے لیے صرف انگریزی زبان اور مغربی ادبیات ، لسانیات ،قانون ،اجتماعی علوم اور فلسفے وغیرہ ہی کے ابواب وا تھے ،بقیہ علوم وفنون کے دروازے ان کے لئے پہلے ہی بند تھے اور آج بھی بند ہیں،اکبر نے اس پہلو کی طرف لطیف اور ظریفانہ اشارے کئے ہیں:

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر = تب کریں شکر مہربانی کا

یورپی تہذیب علامہ اقبال کی نظر میں:

اقبال کے نزدیک عقل وخرد کو علم وفکر کے باب میں ایک انتہائی اہم مقام حاصل ہے، لیکن عقل اگر قلب کے تقاضوں سے بے پرواہو کر تن تنہا قیادت وسیادت کی ذمے داریاں سنبھال لے تو اس کا نتیجہ افراتفری اور انسانیت کی روحانی تباہی کے سوا کچھ نہیں، اس لیے اقبال محض عقل پر تکیہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

اگر عقل وخرد اور قلب ونظر ایک دوسرے سے ہم کنار اور ہم آہنگ ہوجائیں تو توازن اور اعتدال خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے اور دونوں پہلوؤں کے افراط وتفریط کا آپ سے آپ تدارک ہوتا رہتا ہے، عقل کی طغیانی کا سدباب قلب ونظر سے، قلبی واردات کے عدم توازن کی اصلاح ہوش وخرد کی ترازو سے ہوتی رہتی ہے، اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم = کیا ہے جس کو خدا نے دل ونظر کا ندیم

علامہ اقبال کے خیالات کا خلاصہ تین عنوانات کے تحت یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

(۱) مغرب کا نظریۂ علم اور اس کی اساسات

(۲) مقاصد علم غرب

(۳) نتائج علم غرب

علامہ اقبال کی تحریروں میں مغرب کے نظریۂ علم کی جن بنیادوں کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ یہ ہے:

(۱) سیکولرازم، یعنی مذہب وریاست اور دین ودنیا میں تفریق کا نومسیحی تصور، جو دراصل پاپائے روم کے استبداد کے خلاف مسیحی حکم رانوں اور اقوام کی بغاوت کو فکری جواز

فراہم کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔

(۲) بہ طور ماخذ علم وحی والہام سے انکار، جو سیکولرازم کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

(۳) عقل ومشاہدے کو واحد ذریعۂ علم قرار دینا، جو مذکورہ بالا پہلی دونوں بنیادوں کو تسلیم کرنے کے بعد آپ سے آپ ماننا پڑتا ہے۔

(۴) ان تینوں بنیادوں کے نتیجے میں وجدان اور داخلی شعور، وارداتِ قلبی اور احساس روحانی محض اوہام وخرافات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

(۵) پھر علم حصولی اور علم استدلالی ہی اصل علم بن جاتا ہے اور علم حضوری پہلے طاق نسیاں کی زینت اور پھر ایک بے حقیقت، بلکہ وہمی چیز قرار پاتا ہے۔

(۶) ان سب بنیادوں کے بعد آخری بنیاد علم کا اخلاق واقدار سے غیر متعلق ہو جانا ہے، اس کے بعد علم ایک خالص میکانیکی چیز رہ جاتا ہے، جو اگر بداخلاقی اور فحاشی نہیں تو کم از کم لااخلاقی اور لااقداری اسلوب زندگی تو ضرور سکھاتا ہے۔

اسی طرح مقاصد علم غرب پر علامہ کے ہاں انتہائی وقیع مباحث ملتے ہیں، ان کی رائے میں جدید (بیسویں صدی کے آغاز کے) یورپ میں مقاصد علم کچھ یوں ہیں:

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم = ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

(۲) زندگی کے مادی مظاہر پر زور اور باطنی حقائق سے صرف نظر:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا = اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا = آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا = زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

۱- ندوۃ العلماء کا تجربہ، جس کو اکبر الہ آبادی نے ملت اسلامیہ کی زبانِ ہوش مند سے

تعبیر کیا، طبقۂ علماء کی طرف سے اس امر کا برملا اعتراف تھا کہ جدید سے مکمل صرف نظر کر کے محض قدیم کے تحفظ اور تسلسل سے دور جدید کی ضروریات پوری نہیں کی جاسکتیں، ندوۃ العلماء کا قیام برصغیر میں دینی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا، گویا ندوۃ العلماء ایک نیا دیوبند تھا، جس پر علی گڑھ کی گہری چھاپ تھی، گزشتہ ایک سو سال کے دوران ندوی فضلاء نے اسلام پر جولٹریچر تیار کیا ہے، وہ اسلام میں مذہبی فکر اور اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کے ایک اہم مرحلے کا ترجمان ہے، جدید علم کلام، علم تفسیر میں نئے رجحانات، سیرت اور تاریخ اسلام کی نئی تدوین، ادب و مذہب کے باہمی روابط، حدیث کی از سر نو ترتیب اور تصوف وفلسفۂ اسلام کی تدوین نو علمائے ندوہ کی علمی ترک تازیوں کے خصوصی میدان ہیں۔

۲- اگر ندوہ نیا دیوبند تھا، جو علی گڑھ کے زیر اثر وجود میں آیا تو جامعہ ملیہ نیا علی گرھ تھا، جس نے دیوبند کے زیر اثر جنم لیا۔

غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر اس تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے، جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے بااثر اور تعلیم یافتہ طبقات کے لوگ جن اوصاف سے عموما متصف ہیں (الا ماشاءاللہ) ان کو دیکھ کر اقبال کی مشہور نظم ''حکمت فرعونی'' یاد آتی ہے، جس میں انہوں نے حکمت فرعونی کے علم برداروں کے اوصاف گنائے ہیں، ان اوصاف کو دیکھیے اور آج ہمارے بااثر طبقات کی اکثریت کو دیکھیے، یہ طبقہ آپ کو:

۱- انگریزی کا حامی۔

۲- مغرب کی تہذیبی اور فکری برتری کا علم بردار۔

۳-مسلمانوں کے استقلال کے بارے میں ڈھلمل یقین (Luke warm) رویے کا حامل۔

۴- مسلمانوں میں دینی حمیت رکھنے والوں کے عروج سے خائف۔

۵- مسلمانوں کی تعلیم کو مغرب کے نظام کا محض ایک ناپسندیدہ، لیکن لازمی اور ناگزیر تتمہ اور ضمیمہ بنادینے کا خواہش مند۔

۶- مذہب کو ایک گوشے میں محدود کردینے کے لیے کوشاں۔

۷- اہل مغرب کے ایجنڈے پر ایمان کامل رکھنے والا معلوم ہوگا۔

ان خرابیوں کی اصل جڑ دین و دنیا کی جدائی کا سیکولر اور مغربی تصور ہے، دین و دنیا کی جدائی دراصل مشرکانہ عقائد کا ایک بڑا مظہر بھی ہے اور اصل سبب بھی، اس کے مقابلے میں ان دونوں کی اکائی، یعنی Ultimate Unit توحید کا لازمی تقاضا ہے، یہ وحدتِ تصور تعلیم اور نظام تعلیم کی اساس ہونی چاہیے، اس توحید کا لازمی نتیجہ وحدت علوم بھی ہے، مسلمانوں میں وحدت علوم کا تصور روز اول سے ہی ان کی نظریۂ علم (Epistemology) کا ایک بنیادی پتھر رہا ہے، ابونصر فارابی جیسے خالص عقلی اور فلسفیانہ اسلوب کے حاملین سے لے کر امام غزالی جیسے خالص صوفی اور فقیہ تک بہت سے حضرات نے وحدت علوم کے اس تصور پر خامہ فرسائی کی ہے۔امام غزالی نے اپنی مایہ ناز کتاب ''المستصفیٰ من اصول الفقہ'' کے مقدمے میں وحدت علوم اور عقل و نقل کے امتزاج پر جو عالمانہ گفتگو کی ہے، وہ اسلامی فکر کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔

علوم و فنون کی اس وحدت اور نصب العین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

''مذہب، فلسفہ،طبیعیات، اور دیگر علوم وفنون، سب کے سب مختلف راستے ہیں، جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں، مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں، کیوں کہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کو کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں، اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

اس کے برعکس بعض حضرات ان سب حقائق کو نظرانداز کر کے نصاب تعلیم کو پڑوس کی نرسری کے گملے میں لگا ہوا ایک پودا سمجھتے ہیں، جس کو جب چاہا اور جس گھر میں چاہا، منگوا کر لگالیا، چنانچہ جو رطب و یابس مغرب کی نسبت سے آتا ہے، وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، عالمی بینک کی ایک رپورٹ میں (آج سے کم وبیش ایک ڈیڑھ عشرے قبل) کہا گیا تھا کہ:

''ترقی پذیر ملکوں کے نصابات کی تبدیلیاں شمالی امریکا کے نصابات کا چربہ ہوتی ہیں۔''

(محاضرات تعلیم:۱۷۵-۲۰۰)

بیرونی افکار کا مقابلہ:

حضرت مولانا سید واضح رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے سلف کا طریقہ ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی بیرونی افکار کا حملہ ہوا اور اسلامی معاشرہ کو فکری، عقلی، اور ثقافتی خطرات کا سامنا کرنا پڑا، ہمارے سلف نے ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا، انہوں نے بند باندھنے یا قلعہ بند ہونے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انہوں نے صحیح وقت پر اس خطرہ کا احساس کیا اور اس میدان میں گھس کر اسی ہتھیار سے مقابلہ کیا؛ بلکہ جدید افکار ونظریات کا مطالعہ کیا، ان میں مہارت

پیدا کی، پھر ان پر تنقید کر کے کھرا کھوٹا الگ کر دکھایا، جب یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو ہمارے علماء نے اس کا گہرا مطالعہ کیا، ان علوم میں تعمق پیدا کرنے کے لئے بعض علماء نے لاطینی زبان سیکھی، بعض لوگوں کے بارے میں یہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو ارسطو کی کتابیں حفظ تھیں اور وہ ان میں سند کا درجہ رکھتے تھے، اس کے بعد انھوں نے اپنے زمانہ کی زبان میں اسلام کو پیش کر کے ان عقلوں کو مخاطب کیا، جنہوں نے فلسفہ ومنطق کے سامنے گردنیں جھکا دی تھیں، اس کے نتیجہ میں بہت سے فلسفہ زدہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، جیسا کہ ابن خلکان نے ابوہذیل علاف معتزلی کے بارے میں لکھا ہے، بعد میں یہ علوم خود فتنہ بن گئے، ان علوم سے اشتغال رکھنے والے لوگ نقل سے زیادہ عقل سے متاثر ہوگئے، اور دین کے تحریف اور تاویل کا خطرہ لاحق ہوا تو علماء نے انہیں کی منطق اور ان کے طریق استدلال سے ان عقل پرست علماء کا جواب دیا اور ان کا انحراف واضح کر دیا، اور عوام سے ان کی مرعوبیت دور کی، اور صحیح دین کو قوت کے ساتھ پیش کیا۔

امام ابوحامد غزالی نے اپنی کتاب ''المنقذ من الضلال'' میں اس طریق کار کی توضیح کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''میرا یہ یقین ہے کہ کسی بھی علم کی خرابی پر اس شخص کی واقفیت ممکن نہیں ہے جو اس علم میں آخری درجہ پر نہ پہنچ گیا ہو، یہاں تک کہ اس علم میں اس کے سب سے بڑے ماہر کے ہم پلہ ہو گیا ہو، پھر اس سے بھی آگے بڑھ جائے اور اس کو اپنے پیچھے چھوڑ دے اور وہاں تک رسائی حاصل کرے جہاں تک خود اس علم کے ماہرین نہیں پہنچے ہیں، اس وقت کسی علم کے بارے میں خرابی کا دعوی کرنا صحیح ہوسکتا ہے،'' اس کے بعد لکھتے ہیں:

''کسی مذہب وفکر کے سمجھنے اور اس کی حقیقت سے واقفیت حاصل کرنے سے پہلے اسی کی تردید تیر بہ ہدف ہے، میں نے استاد کی مدد کے بغیر صرف مطالعہ کے ذریعہ کتابوں سے

اس علم کے حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا، علوم شرعیہ کی تدریس و تصنیف سے جو وقت بچتا اس میں اس علم کا مطالعہ کرتا، بغداد میں تین تین سو طلبہ کو درس دیتا، اللہ تعالیٰ نے صرف مطالعہ کی برکت سے دو سال سے کم مدت میں مجھ کو ان کے علوم کے آخری درجہ تک پہنچا دیا''۔

دعوت اسلامی کا تقاضہ:

دعوت کے تین عناصر ہیں:

(۱) اپنی فکر و دعوت سے حقیقی اور بلا واسطہ واقفیت اور اس کے مآخذ کا علم، اور دعوت کے مزاج، تعلیمات اور طریقۂ کار سے واقفیت۔

(۲) زمانہ کی ذہنیت، رجحانات، علوم و آداب اور اس کے مآخذ اور عوامل سے واقفیت۔

(۳) مخاطب کے مطابق طرز اسلوب اور اس کے دل، شعور اور فکر کے اندر سرایت کرنے کے طریقوں سے واقفیت، کلام مؤثر کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو، سامع کے لئے اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو، بلکہ قابل قبول ہو اور عقل و شعور پر مؤثر ہو۔

دعوت میں دو بنیادی کام ہیں، ایک قضیہ کی تلقین، دوسرے قضیہ کی نفی، اس میں کچھ افکار و نظریات کو ذہن نشیں کیا جاتا ہے، اور اس کے مخالف نظریات کو ذہن سے دور کیا جاتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ داعی کو ان دونوں عناصر سے گہری واقفیت ہو۔

اسلامی علوم کی حفاظت کے لئے عصری علوم کی تعلیم:

مغرب نے اسلامی علوم و فنون کے مطالعہ، اسلامی ممالک کے حالات کے جائزہ، عوام کے ذہنی تجزیہ، ماحول کے مطالعہ، تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص نظام کی تیاری اور ثقافتی، اجتماعی، تعلیمی اور نفسیاتی وسائل کے استعمال سے خصوصی دلچسپی لی؛ تاکہ ذہنوں پر قابو پاکر ان کو مغربی افکار و نظریات کی طرف مائل کرے، مغربی علماء نے پوری کوشش صرف کرکے

ہمارے علوم کا مطالعہ کیا، ان میں ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اپنی علمی اور تحقیقی خصوصیات کی وجہ سے مراجع کی حیثیت اختیار کر گئیں، مختلف موضوعات پر انسائیکلو پیڈیا تیار کیں اور ان تحقیقات کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق اپنے تصورات اور نظریات پیش کئے، انہوں نے مسلمانوں کے علمی ورثہ کے احیاء کا کام کیا؛ تاکہ ان کی بات اور دعوت اور تصور کو وزن حاصل ہو اور وہ جو نتیجہ اخذ کریں اس کو علمی تحقیق کا نتیجہ سمجھا جائے، کسی نے قرآن سے متعلق علوم میں مہارت پیدا کی، کسی نے حدیث، فقہ، تاریخ، زبان اور ادب میں، اس طرح ان کی تحقیقات اور کتابوں نے مرجعیت حاصل کر لی، ان تحقیقات کے بعد انہوں نے ہر موضوع کو اپنے رنگ میں رنگ دیا، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ کے مطالعہ کو مغربی عیسائی اور یہودی تصور کا تابع بنایا، اور ان میں شبہات اور اشکالات پیدا کئے جن کا جواب جدید علوم کی روشنی ہی میں دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی علوم کے حاملین، اور علماء کی ذمہ داری اس پس منظر میں یہ ہے کہ اسلامی علوم کو مغربی تشریح سے آزاد کریں، مغرب کے شکوک وشبہات کا جواب دیں، اور ان علوم کو مغربی آلودگی سے صاف کر کے بالکل خالص طور پر زمانہ کی زبان اور اس کے مزاج کے مطابق پیش کریں، اس طرح کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ان کی ترجمانی قابل قبول ہو جائے اور باطل اعتراضات کی تردید ہو جائے، مغرب کے اثر سے علمی حلقوں کو اسی وقت آزاد کیا جا سکتا ہے جب صحیح الفکر علماء دینی روح اور علمی اور تحقیقی مطالعہ کے ساتھ مغرب کے علماء کے تیار کئے مراجع کے مقابلہ میں ان سے بہتر مراجع پیش کر سکیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ مغربی علماء کے نظریات، ان کے طریقہ بحث و مآخذ کا گہرا مطالعہ کیا جائے، ان کے نظریات کا تجزیہ کیا جائے، یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں، جو قلب مومن، داعیانہ جذبہ اور علمی

اور تحقیقی صلاحیت رکھتے ہوں اور ان کا مخالف لٹریچر کا عمیق مطالعہ ہو، فرانسیسی مستشرق میکسیم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، بہت ممکن ہے کہ بعض امور میں مغربی تنقید غیر منصفانہ ہو لیکن اس تنقید کے ابطال کے لئے اس کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اور اس کی تردید صرف اسی کی بنیاد پر ہوسکتی ہے۔ (الاستشراق والخلفیة الحضاریة)

(خوب سے خوب تر کی تلاش: ۸۴)

دینی مدارس میں عصری تعلیم---مثبت و منفی پہلو

از: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم نے نصاب و نظام تعلیم و تربیت کے عنوان سے بہت سے مضامین تحریر فرمائے ہیں، زیر نظر مضمون ''دینی مدارس میں عصری تعلیم - مثبت و منفی پہلو'' بھی اسی سلسلہ کا ایک نہایت معتدل مضمون ہے، میں اپنی کتاب کے اخیر میں موضوع کی مناسبت اور ختامہ مسک کے طور پر نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، یہ درحقیقت ایک خطاب ہے جو حضرت نے جامعہ مسیح العلوم بنگلور کے خصوصی اجلاس میں پیش کیا تھا۔

حکومت کے تعاون اور اثر سے آزاد برصغیر کے دینی مدارس کی ایک روشن تاریخ رہی ہے، موجودہ دور میں عام طور پر تعلیم و تعلم کا مقصد کسب معاش ہوا کرتا ہے؛ اسی لئے جب کسی کورس کی ترغیب دی جاتی ہے تو بطور خاص اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس سے آئندہ کیا معاشی مواقع پیدا ہوں گے، عام طور پر ہمارے عصری اداروں میں بہتر روزگار کا حامل شخص پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے، ڈاکٹر بنایا جاتا ہے، انجینئر بنایا جاتا ہے، وکیل اور ہنرمند بنایا جاتا ہے، ادیب اور جرنلسٹ بنایا جاتا ہے؛ لیکن انسان کو سچ مچ کا انسان بنانے پر بہت کم

توجہ دی جاتی ہے۔

دینی مدارس نے اپنا مقصد بنایا ہے: اچھے انسان پیدا کرنا، اس مقصد کے لئے اسلامی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا اور ہر طرح کی آمیزش سے اس کو محفوظ رکھنا، مدارس کی یہ تحریک جس دور میں شروع ہوئی، اس وقت ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا، انہوں نے یہاں کے قدیم نظام تعلیم کو ختم کر کے ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی، اس نظام میں مذہبی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کا کوئی گزر نہیں تھا؛ بلکہ اس میں دین بیزاری اور اخلاقی بندشوں سے آزادی کو نہایت ذہانت کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا، اس پس منظر میں علماء نے ایسے ادارے قائم کئے، جو خالصتاً دینی تعلیم کے تھے؛ کیوں کہ عصری تعلیم کے لئے تو حکومت خود ہی ہر طرح کی سہولت فراہم کر رہی تھی؛ اس لئے مدارس کے نصاب میں جدید علوم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی، بنیادی توجہ دینی تعلیم پر کی گئی، پھر جب اس ملک سے انگریز چلے گئے تو کیا مدارس کے تعلیمی نظام کو اسی نہج پر قائم رہنا چاہئے یا اس میں عصری نظام کی بھی شمولیت ہونی چاہئے؟ اس میں مسلمانوں کے درمیان نقطۂ نظر کا اختلاف پیدا ہوا، یہ اختلاف آج بھی ہے، اور اس میں خاصا افراط و تفریط پایا جاتا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ مدارس میں تھوڑی سی بھی عصری علوم کی شمولیت نہیں ہونی چاہئے، دوسری انتہا پر وہ حضرات ہیں جو نہ صرف عصری علوم کی شمولیت کے حامی ہیں؛ بلکہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص بیک وقت عالم بھی ہو اور ڈاکٹر بھی، عالم بھی، اور انجینئر بھی، اسی طرح مختلف علوم و فنون کے ماہر علماء وجود میں آئیں، حقیقت یہ ہے کہ راہ اعتدال ان دونوں کے درمیان ہے، نہ یہ مناسب ہے کہ دینی علوم حاصل والے طلبہ کو مکمل طور پر عصری علوم سے محروم رکھا جائے، اور جب وہ مدرسہ سے نکل کر میدان عمل میں آئیں تو ایسا محسوس کریں کہ وہ کسی اور دنیا

میں آ گئے ہیں، اور نہ یہ بات قابل عمل ہے کہ ایک شخص بیک وقت اسلامی علوم میں بھی بصیرت حاصل کرلے اور عصری تعلیم کے کسی شعبہ کا بھی ماہر ہو جائے۔

اس سلسلہ میں غور کرتے ہوئے ہمیں پانچ نکات کو مدنظر رکھنا چاہئے، اول یہ کہ اسلام میں عصری علوم کی حیثیت کیا ہے؟ دوسرے: مدارس میں عصری علوم کو شامل کرنے کے فائدے کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں؟ تیسرے: عصری علوم حاصل کرنے کے بارے میں اکابر علماء کی کیا رائے رہی ہے، چوتھے: اگر عصری علوم دینی مدارس کے نصاب میں شامل کئے جائیں تو اس کے لئے قابل عمل صورت کیا ہو سکتی ہے کہ طلبۂ مدارس عصری علوم سے بھی آشنا ہوں اور دینی تعلیم کے اصل مقصد کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

۱- جہاں تک عصری علوم کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام کسی بھی ایسے علم کا مخالف نہیں ہے، جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء فرمایا کرتے تھے: اللهم اني أسئلک علما نافعا۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۹۲۴) اے اللہ! ''میں آپ سے ایسے علم کا سوال کرتا ہوں جو نافع ہو'' نافع ہونا دو صورتوں کو شامل ہے، دین اور آخرت کے لئے نافع ہونا، دنیا میں انسان جن ضرورتوں سے دوچار ہیں، ان ضرورتوں کو حاصل کرنے میں نافع ہونا؛ اس لئے وہ تمام علوم جو کسی جہت سے انسان کو نفع پہنچاتے ہیں، اسلام کی نظر میں پسندیدہ علوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب ارشاد فرمایا: الکلمة الحکمة ضالة المؤمن۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) ''علم وحکمت کی بات مومن کا گم شدہ اثاثہ ہے'' یعنی جیسے انسان اپنی گمشدہ چیز کے حاصل کرنے کا مشتاق رہتا ہے، یا خاندان کے گمشدہ عزیز کے پانے پر خوش ہوتا ہے، اسی طرح اگر کوئی علم وحکمت کی بات مسلمان کو حاصل ہو تو اسے شوق ومحبت کے ساتھ اس کا

استقبال کرنا چاہئے؛ اس لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مفید عصری علوم کا حاصل کرنا پسندیدہ بات ہے، اور اسلام ہرگز اس کا مخالف نہیں ہے۔

یہی صورت حال زبانوں کی ہے، عربی زبان کو یقیناً ایک خصوصیت اور عظمت حاصل ہے؛ کیوں کہ اسی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا، اسی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ومعمولات محفوظ کئے گئے، اور اسلامی علوم کے سرمایہ کا بڑا حصہ اسی زبان میں محفوظ ہے؛ لیکن زبانیں سب کی سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور اللہ کی نعمت ہیں، کوئی زبان حقیر نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی یا سُریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ (صحیح ابن حبان: ۷۱۳۶) جو یہودیوں اور عیسائیوں کی زبان تھی؛ اس لئے انگریزی یا دوسری مشرقی ومغربی زبانوں کی تعلیم وتعلم میں کوئی حرج نہیں ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارسی النسل تھے، اور انہوں نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عرب وہند کے تعلقات میں لکھا ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں عرب تجار ہندوستان میں تشریف لائے، اور انہوں نے مالابار کے علاقہ میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، انہوں ایک ہندو راجہ کے مطالبہ پر قرآن مجید کا مقامی زبان میں ترجمہ بھی کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے زبان کے معاملہ میں کسی تنگ نظری سے کام نہیں لیا، اور جہاں پہنچے، وہاں ان کی زبان اختیار کرتے ہوئے ان تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچایا، انگریزی زبان کا بھی یہی معاملہ ہے؛ بلکہ اگر غور کریں تو انگریزی زبان کے انٹرنیشنل حیثیت حاصل کر لینے میں خیر کا ایک بڑا اہم پہلو ہے؛ کیوں کہ پہلے زمانہ میں اگر پوری دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہوتا تو نہ جانے کتنی زبانیں سیکھنی ہوتیں، آج صرف انگریزی زبان سیکھ کر پوری دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچائی جاسکتی ہے؛ اس لئے اسلام نہ کسی

نافع علم کا مخالف ہے، اور نہ کسی زبان کا، اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے علم کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کرے اور زبان کو اچھی باتوں کی طرف دعوت کا ذریعہ بنائے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ عصری علوم کو حاصل کرنے کے فائدے کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں؟ - اگر غور کیا جائے تو علماء کے انگریزی زبان اور عصری علوم حاصل کرنے سے مختلف دینی فائدے متعلق ہیں، اول یہ کہ اس طرح وہ برادران وطن تک بہتر طریقہ پر اسلام کی دعوت پہنچا سکتے ہیں؛ کیوں کہ انگریزی ایسی زبان ہے، جو ملک کے تمام علاقوں میں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان بولی اور سمجھی بھی جاتی ہے، اور دعوت دین کے کام میں عصری معلومات مؤثر رول ادا کر سکتی ہیں، دوسرا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے خلاف ایک زبردست فکری یلغار جاری ہے، قرآن مجید، حدیث نبوی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اسلامی شریعت غرض کہ دین کے ہر شعبہ پر حملے کئے جا رہے ہیں، اور خود مسلمانوں کی نئی نسل میں تشکیکی ذہن پیدا ہو رہا ہے؛ اگرچہ کہ اب ہندوستان میں سنگھ پریوار کے لوگ بھی اسلام کے خلاف غلط فہمیاں کرنے کا کام بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں؛ لیکن ان سب کا سرچشمہ یہودی اور عیسائی مستشرقین ہی کا مواد ہے، جو انگریزی زبان میں ہے؛ اس لئے اگر آج علماء دفاعِ اسلام کا کام کرنا چاہیں تو ان کے لئے انگریزی زبان سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے؛ کیوں کہ دعوت دین کا کام تو عوام بھی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں؛ اسی لئے قرآن مجید میں فریضۂ دعوت کا مخاطب پوری امت کو بنایا گیا ہے۔ ''کنتم خیر امة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر '' (آل عمران: ۱۱۰) لیکن دفاع اسلام کا کام علماء ہی کر سکتے ہیں، اور علماء نے ہمیشہ اس کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

عباسی دور میں جب یونانی فلسفہ عالم اسلام داخل ہوا، اور یہ علوم تشکیکی ذہن پیدا کرنے

کا سبب بننے لگے تو امام غزالیؒ اُٹھے اور انہوں نے فلسفہ ومنطق کے اصولوں پر ان سوالات کے جوابات دیے، پھر آگے علامہ ابن تیمیہؒ علم کے اُفق پر نمودار ہوئے تو انہوں نے اقدامی طریقۂ کار اختیار کرتے ہوئے خود فلاسفہ یونان کے افکار کو غلط ثابت کیا، اور اس طرح دفاعِ اسلام کا بہت بڑا کام انجام پایا، افسوس کہ موجودہ دور میں ہم اس سے غافل ہو گئے ہیں، اور ہماری زیادہ تر توجہ باہر سے ہونے والی فکری یلغار کے مقابلہ باہمی مسلکی اختلاف کی طرف ہوگئی ہے، ہندوستان میں تعلیمی اعتبار سے دو اہم دبستان ہیں، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پوری زندگی آریہ سماجی اور ہندو احیاء پرستی کے مقابلہ میں لگائی، اور تحریک ندوۃ العلماء کے مؤسس حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے عیسائیت اور قادیانیت کے رد کو اپنی زندگی کا مشن بنایا، یہ فضلاء کے لئے خاموش پیغام ہے کہ ان کی توجہ کا اولین ہدف دفاعِ اسلام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے انگریزی زبان، مغربی افکار اور مغربی اور ہندوستانی تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے۔

عصری علوم سے واقفیت کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہمارے فضلاء عصری درسگاہوں اور بالخصوص انگلش میڈیم اسکولوں میں بہتر طور پر کسی احساس کمتری کے بغیر اسلامیات کی تعلیم دے سکتے ہیں، یہ ایک اہم کام ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کام کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مسلم مینجمنٹ کے تحت چلنے والے اداروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، اور وہاں اسلامیات کی تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ کی ضرورت پڑ رہی ہے جو انہیں انگریزی زبان میں دینی تعلیم دے سکیں، اردو زبان میں اگر انہیں تعلیم دی جائے تو اول تو بہت سے طلبہ اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، دوسرے: چونکہ اس وقت انگریزی زبان کا جادو پورے ماحول پر اثر انداز ہے؛ اس لئے طلبہ اردو زبان میں ہونے والی

تعلیم کو قدر و وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور خود مدرس میں بھی احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔

اسی سے قریب تر چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اگر علماء انگریزی زبان سے واقف ہوں تو وہ بہتر طور پر نئی نسل سے مخاطب ہوسکتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دینی مدارس اور علماء کا طبقہ عربی و فارسی آمیز الفاظ نیز علمی اصطلاحات سے بوجھل جس طرح کی اردو بولتا ہے، وہ اکثر نئی نسل کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے، بہت سے نوجوان عقیدت کے جذبہ اور ادب کے تقاضے سے سر جھکا کر بظاہر توجہ کے ساتھ ہم جیسوں کی بات سنتے ہیں؛ لیکن پھر اگر وہ کوئی سوال کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے خطاب کی بنیادی باتوں کو بھی نہیں سمجھ پائے؛ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہوگئی ہے کہ خود مسلمانوں میں دعوت و اصلاح کے کام کے لئے علماء انگریزی زبان سیکھیں، اور انگریزی آمیز اردو میں اپنی بات نئی نسل کے سامنے پیش کریں۔ ان فوائد کے علاوہ اس بات کی بھی توقع ہے کہ اگر علماء عصری علوم سے واقف ہوں تو وہ اسلامی ماحول اور دینی تربیت کے ساتھ عصری تعلیم کے ادارے قائم کرسکیں گے، نیز اِس وقت دینی مدارس کی طرف آنے کا رجحان جس تیزی سے کم ہورہا ہے، اور بڑے مرکزی مدارس کے علاوہ اکثر دینی درسگاہوں میں طلبہ کی تعداد گھٹتی جارہی ہے، اس کا بھی تدارک ہوگا، اور جب والدین دیکھیں گے کہ ان مدارس میں بھی ہمارے بچے دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کو حاصل کررہے ہیں، تو ان شاء اللہ مدارس کی طرف رجحان بڑھے گا۔

دینی مدارس کے نصاب میں عصری علوم اور انگریزی زبان داخل کرنے کے بعض منفی پہلو بھی ہیں، اور اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں: ایک یہ کہ جن اداروں میں اس کا تجربہ کیا جارہا ہے، وہاں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایسا نصاب پڑھنے والے طلبہ نہ اچھے عالم بن سکے اور نہ عصری علوم میں کوئی کمال حاصل کرسکے، یہ ایک بجا شکوہ ہے؛ لیکن اگر غور

کیا جائے تو اس بیماری کا علاج کیا جا سکتا ہے، اصل میں جن لوگوں نے اس طرح کے نصاب بنائے ہیں، عام طور پر ان کا تعلق عصری علوم سے تھا، انہوں نے نصاب میں توازن کا خیال نہیں رکھا، وہ اس بات پر کما حقہ توجہ نہیں دے سکے کہ کسی نصاب کے کامیاب ہونے کے لئے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ اچھے مضامین پر مشتمل ہو؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قابل عمل ہو، اگر مدارس اسلامیہ کے مروجہ نصاب کے تمام مضامین کے ساتھ ساتھ عصری درسگاہوں کا مروجہ پورا نصاب پڑھانے کی کوشش کی گئی تو یہ غیر متوازن نصاب ہوگا، اور یقیناً مفید کے بجائے مضر ہو جائے گا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بعض معترضین کے جواب میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے، ''زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصانِ استعداد رہتی ہے''؛ لیکن اگر عصری مضامین کو توازن کے ساتھ شامل کیا جائے اور ایسا نصاب نہ ہو جو طلبہ کے لئے نا قابل برداشت بوجھ بن جائے تو ان نقصانات سے بچا جا سکتا ہے؛ چنانچہ گذشتہ چودہ پندرہ سالوں سے برصغیر کے بعض مدارس میں اس کا کامیاب تجربہ کیا جا رہا ہے، اور اس کے بہتر نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ دینی مدارس کے بعض فضلاء جب عصری تعلیمی اداروں میں جاتے ہیں تو ان کی شکل و صورت اور سوچ بدل کر رہ جاتی ہے، اور مدارس کی سالہا سال کی محنت رائیگاں ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک یہ کہ مدارس کے یہ فضلاء انگریزی زبان اور عصری علوم سے بالکل ہی نابلد ہوتے ہیں؛ اس لئے جب وہ عصری اداروں میں جاتے ہیں تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ ایک طرح کی مرعوبیت کا شکار بن جاتے ہیں، اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب آدمی کسی شخص یا حلقہ سے مرعوب ہوتا ہے تو اس کو اپنی ہر چیز حقیر نظر آنے لگتی ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی ہر ایک

چیز کو اپنا لے، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، اگر مدارس کے فضلاء پہلے سے ایک حد تک عصری علوم سے واقف ہوں تو وہ ان شاء اللہ اس صورت حال سے محفوظ رہیں گے، ادھر کچھ عرصہ سے مختلف مدارس میں فراغت کے بعد انگریزی زبان کا کورس شروع ہوا ہے، یہ فضلاء ماشاء اللہ اپنی پوری پہچان کے ساتھ عصری اداروں میں داخل ہو رہے ہیں، اور وہ نہ صرف احساسِ کمتری سے محفوظ ہیں؛ بلکہ ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے، دوسرے اگر کوئی طالب علم آٹھ سال دس سال پڑھ کر عصری تعلیم کے اداروں میں جائے اور وہ چند مہینوں میں تبدیل ہو جائے تو مدارس کے ذمہ داران کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے نظام تربیت کا بھی جائزہ لے کہ ضرور ہمارے نظام تربیت میں کچھ کمی پائی جاتی ہے اور اس کی اصلاح کریں۔

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دینی مدارس میں انگریزی زبان اور عصری تعلیم کے بعض منفی پہلو بھی سامنے آئے ہیں؛ لیکن وہ نا قابل علاج نہیں ہیں، ہم بہتر تعلیم وتربیت کے ذریعہ ان کا تدارک کر سکتے ہیں۔

دینی مدارس میں عصری مضامین کے شامل کرنے سے متعلق تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں امت کے معتبر علماء اور بزرگوں کی کیا سوچ رہی ہے؟ اس سلسلہ میں اگر مختلف اہل علم کے افکار کا جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ عصری تعلیم اور انگریزی زبان پڑھنے پڑھانے کے مخالف نہیں تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ جیسے اکابر علماء نے انگریزی زبان کے پڑھنے کی اجازت دی ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اجازت بھی دی ہے اور بہتر مقاصد کے لئے اس کے حاصل کرنے کو مستحسن بھی قرار دیا ہے، حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب بلیاوی (مؤلف: مصباح اللغات) نے اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ لکھا

ہے، اور علماء دیوبند کے بارے میں جو یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے انگریزی زبان پڑھنے پڑھانے کو ناجائز قرار دیا تھا، اس کی تردید کی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سرسید احمد خاں مرحوم کو ایک خط لکھا اور اس میں تحریر فرمایا:

> اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبۂ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی۔

مشہور مصنف حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد احمد صاحبؒ (سابق صدر مفتی ریاست دکن و مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے آخری سفرِ حج کے دوران پانی جہاز میں اٹلی کے رہنے والے کپتان سے ملاقات ہوئی، مولانا کی طرف لوگوں کے رجوع کو دیکھ کر اس کے دل میں آپ کی عقیدت پیدا ہوگئی، اور اس نے آپ سے اسلام کے متعلق بعض باتیں دریافت کرنی چاہیں، آپ نے ایک انگریزی جاننے والے شخص کی وساطت سے اس کے جوابات دیئے، وہ اس قدر متأثر ہوا کہ قریب تھا کہ اسلام قبول کرلے؛ لیکن خود آپ درمیانی شخص کی ترجمانی سے مطمئن نہیں تھے، ذہین آدمی چاہے کسی زبان سے واقف نہ ہو؛ مگر ترجمانی کس درجہ صحیح ہو رہی ہے؟ اس کا اندازہ کرلیتا ہے، اس وقت آپ نے ارادہ کیا کہ دیوبند واپس آنے کے بعد میں انگریزی زبان سیکھوں گا، ظاہر ہے اس کا مقصد یہی تھا کہ ان کو ان کی زبان میں اسلام کی دعوت دی جائے، اور شکوک وشبہات دور کئے جائیں۔

حضرت نانوتویؒ نے ابتدائی دور میں دارالعلوم کا جو نصاب بنایا، اس میں سنسکرت زبان

کو بھی شامل رکھا تھا؛ کیوں کہ اس زمانہ میں آریہ سماجیوں کی طرف سے فتنہ ارتداد پھیلانے کی جان توڑ کوششیں ہو رہی تھیں، پھر یہ بات محسوس کی گئی کہ ابتدائی سنسکرت سے واقفیت کافی نہیں ہے، تو دارالعلوم کی شوریٰ نے طے کیا کہ سنسکرت کی معیاری تعلیم کے لئے کچھ طلبہ کو خصوصی وظائف دیے جائیں؛ تاکہ جہاں سنسکرت زبان کی تعلیم ہوتی ہے، وہ وہاں جا کر اچھی تعلیم حاصل کرسکیں، اور یہ کچھ زبان ہی پر موقوف نہیں ہے؛ بلکہ تمام ہی عصری علوم کو دارالعلوم کے اکابر اہمیت دیا کرتے تھے، دارالعلوم نے شروع سے فلکیات، ریاضی، جیومیٹری اور علم طب کو داخل نصاب کیا تھا، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم کی شوریٰ نے طے کیا تھا کہ تعلیم طب کے ساتھ ساتھ طریقۂ مطب، جراحی اور دوا سازی یعنی سرجری اور فارمیسی کی بھی تعلیم دی جائے، اس کا ذکر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات ہی میں پیش کی جانے والی روداد میں موجود ہے، جو حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے پیش کی تھی۔

(تاریخ دارالعلوم:۱/۱۰۶)

خود دارالعلوم دیوبند کے نصاب مرتّبہ ۱۹۹۳ء میں تیسری جماعت میں تاریخ ہند، تاریخ اسلام، علم شہریت، عالم اسلام کا جغرافیہ اور جغرافیہ عالم شامل نصاب ہے، اور عربی کی چوتھی جماعت میں جنرل سائنس (کیمیا، طبیعات، علم الحیوان، علم النباتات) کے علاوہ اصول حفظان صحت، دستور ہند کے کچھ ضروری ابواب، معاشیات کی مبادیات اور جدید فلاسفہ کے نظریات شامل رکھے گئے ہیں، تاریخ دارالعلوم میں اس کا ذکر موجود ہے، گویا انگریزی زبان کے علاوہ تمام ہی عصری علوم کے بنیادی مضامین کو شامل نصاب رکھا گیا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تقریباً ۱۹۳۳ء میں آسام اور بنگال کے دینی مدارس کے لئے ایک نصابِ تعلیم مرتب کیا تھا،

یہ نصاب قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے، انہوں نے اس نصاب کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے، ابتدائیہ: جس کی مدت ۳/سال ہے، ثانویہ: جس کی مدت ۵/سال ہے اور مرحلۂ عالیہ جس کی مدت ۸/سال ہے، اس نصاب میں انہوں نے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ معاون اسلامی وعصری علوم کو بڑی فراخدلی کے ساتھ شامل کیا تھا، تاریخ میں تاریخ ہند بھی، تاریخ اسلام بھی اور تاریخ یوروپ بھی، جغرافیہ میں ملکی وایشیائی جغرافیہ اور اس کی نقشہ سازی کی مشق، قانون میں دستور برطانیہ؛ کیوں کہ اس وقت ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا، معاشیات میں ہندوستان کی معیشت اور زرعی نظام سے مربوط مسائل، سیاست میں اصول سیاست پر قدیم وجدید کتابیں، ریاضی، جدید سائنس، عمارت کی نقشہ نویسی اور پیمائش، فلکیات، ٹکنالوجی میں کپڑا بُنائی، نجاری، گھڑی سازی وغیرہ، اور زبان میں انگریزی زبان، نیز مولاناؒ نے اس میں مقامی زبان کو بھی بڑی اہمیت دی ہے؛ چوں کہ یہ نصاب بنگلہ زبان کا تھا؛ اس لئے بنگلہ زبان کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شامل نصاب کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مولاناؒ نے پریڈ اور فزیکل ورزش نیز یونیفارم کو بھی تعلیمی نظام کا حصہ بنایا ہے، واقعہ ہے کہ یہ نصاب بے حد اہم اور قابل استفادہ ہے، اور مولاناؒ کی وسیع النظر فی موجودہ دور کے بعض شدت پسند نوجوان فضلاء کے لئے مشعل راہ ہے کہ آپ نے قدیم طرز کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی، مدینہ منورہ میں حدیث کا درس دیا؛ لیکن آپ کے اِس مجوّزہ نصاب میں تمام عصری مضامین شامل ہیں، اور علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کتابیں بھی ہیں، نیز اپنے زمانہ سے باخبری کے لئے بعض ایسی کتابوں کا بھی مشورہ دیا گیا ہے، جو ہندو فرقہ پرستوں کی ہیں یا اس زمانہ کے احوال پر تبصرہ سے متعلق ہیں۔

میں نے خاص طور پر دارالعلوم اور اس کے اکابر کا ذکر اس لئے کیا کہ ان کا مطمح نظر

خالص اسلامی علوم ہی کو پڑھانا تھا، رہ گیا ندوۃ العلماء یا جنوبی ہند کی معروف درسگاہ جامعہ نظامیہ وغیرہ، تو ان اداروں کا مقصد ہی یہی تھا کہ عصری علوم کے ایک حصہ کو شامل کرتے ہوئے دینی علوم کی تعلیم دی جائے، اور اسی تصور کے ساتھ ان اداروں کے نصاب تیار کئے جائیں؛ لیکن افسوس کہ اس کے باوجود عمومی طور پر دینی مدارس میں اس سوچ کی پذیرائی نہیں ہوسکی، اور آج بھی بیشتر مدارس میں عصری علوم کو شامل کرنے کی فکر نہیں پائی جاتی۔

ایک تصور ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے کہ جو نصاب زمانۂ قدیم سے آرہا ہے، اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ ہرگز نہیں کرنی چاہئے؛ لیکن جس مبالغہ کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، ہمارا یہ نصاب درس نظامی کہلاتا ہے، اس کی بنیاد تو ملا قطب الدین سہالویؒ نے رکھی ہے؛ لیکن اس کو فروغ ملا نظام الدین فرنگی محلی کے ذریعہ حاصل ہوا ہے؛ اسی لئے یہ درس نظامی کہلایا، اصل درس نظامی ۵۲؍کتابوں پر مشتمل تھا، جس میں ۲۵؍کتابیں منطق کی تھیں، ۶؍ریاضی کی اور ۱۲؍کتابیں اسلامی علوم کی، تفسیر میں جلالین اور بیضاوی، حدیث میں صرف مشکوٰۃ شریف، فقہ میں شرح وقایہ کا پہلا اور دوسرا حصہ اور ہدایہ کا تیسرا اور چوتھا حصہ، اصول فقہ میں تین، علم کلام میں معقولی انداز کی چار کتابیں، یہی پورا نصاب تھا، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ معقولات پر کتنی زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور خالص اسلامی علوم پر کتنی کم، اور حدیث جیسے اہم مضمون میں صرف مشکوٰۃ المصابیح پر اکتفاء کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو، کہ انہوں نے درس نظامی کے بعض مضامین کو شامل کرتے ہوئے ایک نیا نصاب بنایا، جو ۲۹؍کتابوں پر مشتمل تھا، اس میں تفسیر کی دو، حدیث کی تین، علم کلام کی تین، اصول فقہ کی دو، تصوف کی چار کتابیں اور فقہ میں صرف شرح وقایہ پڑھائی جاتی تھی، یہ یقیناً ایک بہتر تبدیلی تھی کہ ملا نظام

الدین کے نصاب میں تو ۵۲ ؍ کتابوں میں سے صرف بارہ ایسی کتابیں تھیں، جن کا تعلق براہ راست اسلامی علوم سے تھا، اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے یہاں ۲۹ ؍ میں سے ۱۵ ؍ کتابیں براہ راست علوم اسلامی سے متعلق تھیں، مولانا عبدالحئ حسنیؒ کی نصاب تعلیم سے متعلق کتاب اور شاہ ولی اللہ صاحب کی ''الجزء اللطیف'' میں اس کی تفصیلات موجود ہیں؛ اس لئے حقیقت میں دارالعلوم دیوبند اور موجودہ دور کے دیگر مدارس کے نصاب میں ملا نظام الدین کے نصاب سے زیادہ شاہ ولی اللہ صاحب کے نصاب سے استفادہ کیا گیا ہے؛ لیکن اس سے بہر حال یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر دور میں علماء نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق نصاب میں تبدیلی کی ہے، اور اگر یہ عمل حقیقت پسندی کے ساتھ ہو تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے وحشت محسوس کی جائے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس کے نظام میں اس طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، مگر اس تبدیلی میں عصری علوم کی شمولیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے جس نصاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، مولانا نے اس میں لکھا ہے کہ ہر تین سال میں نصاب پر نظر ثانی ہونی چاہئے۔

چوتھا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اگر مدارس کے مروّجہ نصاب میں عصری علوم کو شامل کیا جائے تو ایسی کیا شکل ہوسکتی ہے کہ دینی تعلیم کو متأثر کئے بغیر عصری مضامین کی تعلیم دی جاسکے، راقم الحروف کے خیال میں اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

اول یہ کہ دسویں جماعت تک مشترکہ نصاب ہو، جو کتابیں عصری درسگاہ میں پڑھائی جاتی ہیں، بعض تبدیلیوں کے ساتھ وہ مدارس میں بھی پڑھائی جائیں، عصری درسگاہوں میں درس کا دورانیہ کم ہوتا ہے، چالیس منٹ کی پانچ سے سات گھنٹیاں ہوتی ہیں، بعض جگہ تو صرف ۳۵ ؍ منٹ کی گھنٹیاں ہوتی ہیں، اس طرح اوقاتِ تعلیم کم وبیش چار گھنٹے ہوتے ہیں،

دینی مدارس میں چھ گھنٹے تو لازماً اسباق پڑھائے جاتے ہیں، اور بعض دفعہ فجر بعد ہی سے اسباق شروع کر دیے جاتے ہیں، اس لحاظ سے مدارس کے مروجہ آٹھ سالہ نصاب میں سے پہلے تین سال کے وہ مضامین جو عربی زبان اور فن کی ابتدائی کتابوں سے متعلق ہیں، بآسانی اس دس سال میں سموئے جا سکتے ہیں، اس دس سالہ نصاب کے بعد جیسے عصری تعلیم حاصل کرنے والے مزید پانچ سال میں گریجویشن کرتے ہیں، اسی طرح جو طلبہ عالم کورس کرنا چاہیں، وہ پانچ سال میں درس نظامی کے مروجہ نصاب کو مکمل کرلیں، پھر عصری تعلیم حاصل کرنے والے جیسے مزید دو سال کا وقت لگا کر ماسٹر کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، اسی طرح دینی تعلیم حاصل کرنے والے افتاء اور تکمیل و تخصص وغیرہ کا کورس کر سکتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو طلبہ دسویں جماعت کے بعد عالم کورس کی تعلیم حاصل کریں گے، وہ بنیادی عصری علوم سے واقف ہوں گے، اور جو آگے عصری علوم حاصل کرنا چاہیں گے، وہ بنیادی دینی تعلیم حاصل کر چکے ہوں گے، اور ایک ساتھ دینی وعصری تعلیم کا ایسا بوجھ نہیں پڑے گا، جو طلبہ کے لئے ناقابل تحمل ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لئے ایک تین سالہ نصاب ڈیزائن کیا جائے؛ تاکہ وہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی آشنا ہو جائیں، فی الحال کئی اداروں نے فارغین مدارس کے لئے انگریزی کا دو سالہ نصاب شروع کیا ہے، اس سے زبان تو آسکتی ہے؛ لیکن دوسرے عصری مضامین سے مناسبت پیدا نہیں ہوسکتی؛ حالاں کہ یہ بھی ضروری ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ درس نظامی کی تعلیم کے ساتھ اعدادیہ تا درجہ چہارم عربی پانچ سال کے عرصہ میں ہر جماعت میں ۴۵-۴۵ منٹ کی دو گھنٹیوں کا اضافہ کیا جائے، ایک

گھنٹی انگریزی زبان کے لئے مخصوص ہو اور ایک گھنٹی میں ہفتہ میں دو دو دِن جنرل سائنس، حساب اور تاریخ ہند کے مضامین شامل کئے جائیں، پھر پنجم عربی سے لے کر دورۂ حدیث تک کے مرحلہ کو مروجہ درس نظامی کی کتابوں ہی کے لئے خالص رکھا جائے، ابتدائی پانچ سالہ مدت میں انگریزی اور عصری مضامین کو شامل کرنا بہت دشوار نہیں ہے، اگر منطق وفلسفہ کے مضامین کو اصطلاحات کے تعارف تک محدود کر دیا جائے اور جو مضامین مقصود ہیں، یعنی تفسیر، حدیث، عقیدہ، اصول کے علاوہ دوسرے مضامین سے مکررات کو کم کر دیا جائے، تو بسہولت یہ ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم کو دینی مقاصد کے لئے زیادہ مؤثر اور مفید بنانے کی غرض سے مروجہ نصاب تعلیم پر غور مکرر کی ضرورت ہے، اس بات کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ تبدیلی کی جائے؛ بلکہ معمولی حذف واضافہ کے ذریعہ ضروری حد تک عصری مضامین کو شامل کیا جاسکتا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں اگر ہم نے اس طرف توجہ نہیں دی اور جیسے ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانہ کے احوال کے لحاظ سے تعلیم وتربیت کا نظام بنایا تھا، اگر ہم نے اس کو ملحوظ نہیں رکھا تو علماء پر اسلام کی دعوت وحفاظت کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے، اندیشہ ہے کہ مستقبل میں وہ اس کو صحیح طور پر ادا نہیں کر پائیں۔ وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان.

تمت بالخیر

مصادر ومراجع

۱	ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت	مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۲	وفاق المدارس العربیہ پاکستان ساٹھ سالہ تاریخ	مولانا ابن الحسن عباسی
۳	ترجمان السنة	حضرت مولانا بدر عالم صاحب
۴	ہمارا تعلیمی نظام	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
۵	محاضرات تعلیم	مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازی
٦	محاضرات حدیث	// //
۷	شمع فروزاں	فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ صاحب
۸	مدارس دینیہ کے لئے رہنما اصول	مولانا سید ذوالفقار احمد گوالیوریؒ
۹	صدائے دل	مفکر ملت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ
۱۰	گلدستۂ محبت	// //
۱۱	افکار پریشاں	// //
۱۲	رشد وہدایت کے منار	// //
۱۳	الیقظه	// //
۱۴	علماء ومفکرون عرفتهم	شیخ مجذوب
۱۵	معاصر دینی تعلیم - مشکلات واحوال	اسلامی فقہ اکیڈمی - مقالات
۱٦	رموز تدریس وتربیت	حضرات اکابرین کے ارشادات

۱۷	اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں	حضرت مولانا سید حکیم عبدالحی لکھنوی
۱۸	ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟	مولانا سید سلمان ندوی
۱۹	دینی مدارس کا نصاب تعلیم خوب سے خوب تر کی تلاش	// //
۲۰	دینی مدارس	مولانا ابن الحسن عباسی
۲۱	دین وشریعت	مولانا وحیدالدین خاں
۲۲	الفرقان ۲۰۰۷	مولانا راشدالحسن کاندھلوی
۲۳	دینی مدارس کا نصاب و نظام	مولانا زاھدالراشدی
۲۴	دینی نظام کی اصلاح اور ترقی	مولانا محمد بشیر سیالکوٹی
۲۵	دینی مدارس عصری معنویت اور جدید تقاضے	مولانا ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ افریقی
۲۶	میڈیا کے اعتراضات وجوابات	مولانا مفتی اقبال ٹنکاروی
۲۷	جدید فلسفہ اور علم الکلام	// //
۲۸	دوسرے ائمہ کے مسلک پر فتوی دینے کے اصول	// //
۲۹	مقاصد شریعت کے قواعد	// //
۳۰	تخصص فی الحدیث	// //
۳۱	حدیث کے اصول و مصطلحات-منہج حنفی کی روشنی میں	مولانا عبداللہ لاجپوری